کلیاتِ شاعر

حمایت علی شاعر

نگراں
شفیق الزماں

مرتب
انور جبیں قریشی

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ہیں

Himayat Ali Shair
KANEFF CRESCENT
APT: 512-3695 MISSISSAUGA. L5A 4B6
ONT. CANADA
Ph: 905-281-1914 , Cell: 647-271-2136
o
C.B.45,Al-Falah Society,Shah Faisal Colony,
Karachi-75230. Pakistan.
Ph: 92-21-4571322

اشاعتِ اول	2008ء
اہتمام	اوجِ کمال
کمپوزنگ	محمد شہزاد شفیق
قیمت	700 روپے

زیر اہتمام

ماہنامہ دنیائے ادب کراچی
623،6فلور، ریگل ٹریڈ اسکوائر ریگل چوک، صدر کراچی 74400۔ پاکستان
Ph: 92-21-8480816 / 021-2744987
Cell: 0300-2797271 E-mail: dunyaeadab@yahoo.com

انتساب

اپنے تمام بچوں کے بچوں کے نام

(بہت سی دعاؤں کے ساتھ)

مری متاعِ سخن ہے تمہارا سرمایہ
اِسے سنبھال کے رکھنا متاعِ جاں کی طرح

(حمایت علی شاعر)

عرضِ مرتب

عرصے سے میری خواہش تھی کہ حمایت علی شاعر کا 'کلیات' مرتب ہو جائے۔ حمایت صاحب آمادہ نہ ہوتے تھے اور عموماً ملک سے باہر رہتے۔ بیرون ممالک کے سفر میں شاید ایک دن انہوں نے اپنے کلیات کی ضرورت محسوس کر لی اور ہمیں اجازت دے دی۔ چنانچہ اپنے رفیق کار شفیق الزماں کی نگرانی میں برادرم اوج کمال کے مشورے سے یہ کتاب مرتب ہو گئی۔

اس مجموعہ میں ہم نے ان کی ثلاثیوں، ہائیکو اور فلمی نغمات کا انتخاب بھی دے دیا ہے۔ فلمی شاعری اگرچہ 'معاشی ضروریات' کے تحت لکھی جاتی ہے مگر حمایت صاحب نے اِس میں بھی ادب کا اہتمام رکھا ہے۔ اس میں سنجیدگی بھی ہے اور شوخی بھی، فن کے تقاضے بھی ہیں اور عوام سے وابستگی بھی۔ 'ثلاثی' تو خیر اُنہی کی ایجاد ہے اور اب ایک نئی صنف سخن کے طور پر عمومی قبولیت بھی حاصل کر چکی ہے۔ 'چاند کی دھوپ' تازہ کلام ہے اور 'غمِ معراج' زندگی بھر کا سرمایہ۔۔۔

حمایت صاحب اب بہت کم شعر کہتے ہیں۔ ان کی زندگی کا انداز بدل گیا ہے۔ بھابھی معراج نسیم صاحبہ کے انتقال کے بعد وہ زیادہ تر کینیڈا میں رہنے لگے ہیں۔ ٹورنٹو کے قبرستان پکرنگ میں اُن کی شریک حیات کی ابدی آرام گاہ ہے۔ اللہ تعالیٰ حمایت صاحب کو تا دیر سلامت رکھے۔ اُن کی کئی کتابیں اشاعت کی منتظر ہیں۔ ہمارے مرتب کردہ رسالے 'شخصیت' کے (حمایت علی شاعر نمبر) مطبوعہ ۱۹۹۶ء، 'تجھ کو معلوم نہیں' (فلمی نغمات، مطبوعہ ۲۰۰۳ء) اور 'حمایت علی شاعر کے ڈرامے' (مطبوعہ ۲۰۰۵ء) کے نئے ایڈیشن بھی آنے والے ہیں۔ دعا کیجیے کہ ہم اپنی کوششوں میں جلد کامیاب ہو جائیں۔

انور جبیں قریشی

ترتیب

۱۔ آگ میں پھول ۷
۲۔ مٹی کا قرض ۲۰۳
۳۔ تشنگی کا سفر ۳۸۵
۴۔ ہارون کی آواز ۵۲۹
۵۔ ثلاثیاں اور ہائیکو ۶۵۱
۶۔ تجھ کو معلوم نہیں ۷۱۱
۷۔ چاند کی دھوپ ۸۰۱

فکرِ معاش کھا گئی دل کی ہر اِک اُمنگ کو
جائیں تو لے کے جائیں کیا حُسن کی بارگاہ میں
(حمایت علی شاعر)

آگ میں پھول

(۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۶ء)

اپنے اباجان

سید تراب علی صاحب کے نام

بصد ادب واحترام

اُس ابر کو بھی اُڑا لے گئی یہ تیز ہوا
جو میرے سر پہ رہا سایۂ خدا کی طرح
(حمایت علی شاعر)

ترتیب

میں اور میرا فن — حمایت علی شاعر ۱۳

نظمیں

جنت نگاہ ۲۵
حسنِ بے نام ۲۶
پیکرِ خیال ۲۸
حسرتِ قرب ۳۰
تری آنکھیں ۳۲
تصویر تمہاری ۳۴
ترکِ طلب ۳۵
تماشا ۳۶
غمِ رائیگاں ۳۸
تنہا تنہا ۴۲
وقت وقت کی بات (قطعات) ۴۳
ادھوری کہانی ۴۵
وہ ۵۰
تیری باتیں، تیرے خواب ۵۲
غمِ حاصل ۵۷
جبرِ عہد ۶۰
وحشتِ بام و در ۶۲
کھلونے ۶۴

چل خسرو گھر اپنے --- ۶۶
مژدۂ نو ۶۸
جاوداں ۶۹
غمِ فردا ۷۲
معراج کے نام ۷۴
اقبال اور میں ۷۷
آدمی کی کہانی ۷۹
ترغیب ۸۱
تین روپ ۸۳
یارِ کج ادا ۸۶

غزلیں

تنہائی میں قریبِ رگِ جاں ترا خیال ۹۰
سامنے رشکِ قمر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں ۹۲
اُن کی جو راہ تھی وہ اُسی پر چلا کیے ۹۳
آج اے دل، لب و رخسار کی باتیں ہی سہی ۹۴
نہ جانے اہلِ نشیمن پہ کیا گھڑی آئی ۹۵
اب بتاؤ جائے گی زندگی کہاں یارو ۹۶
کیا کیا نہ زندگی کے فسانے رقم ہوئے ۹۸
کیوں ہو گئی اے شمع، تری بزمِ سخن چپ ۹۹
ایک سی ہے یوں تو کہہ لینے کو ہر اک دل کی بات ۱۰۰
کوئی ہمدم نہیں، مونس نہیں، دم ساز نہیں ۱۰۱
دل سے جو ترے غم کے پرستار نہ ہوتے ۱۰۲
زخم کو پھول، حقیقت کو گماں کہتے ہیں ۱۰۳
یہ شہرِ رفیقاں ہے، دلِ زار، سنبھل کے ۱۰۴

اب تو ہر شورِ طرب سن کر دہل جاتا ہے دل ۱۰۵
رہنِ غم و آلام کیے جاتا ہے مجھ کو ۱۰۶
اُس سے ملنے کی آس کیا شاعر ۱۰۷
یوں موت کو حیات کا انعام کر لیا ۱۰۸
مدت سے یونہی شام و سحر جاگ رہے ہیں ۱۰۹
رات کٹ جائے کسی طرح تو بس ۱۱۰
اہلِ دل، اہلِ خرد، اہلِ نظر سب سو گئے ۱۱۱
موت سے اے دل ڈرتے کب ہیں ۱۱۲
بجا کہ اپنی دسترس میں لوح بھی، قلم بھی ہے ۱۱۳
میں جو کچھ سوچتا ہوں اب، تمہیں بھی سوچنا ہوگا ۱۱۴

نظمیں

شہکار ۱۱۶
ملامت ۱۱۸
ایک منظر ۱۱۹
فسادات کی ایک رات ۱۲۳
تلنگانہ ۱۲۵
ایشیاء ۱۲۶
کوچے ۱۲۷
جشنِ آزادی ۱۲۸
زندگی اور پتھر ۱۳۲
چاندنی سے سویرے تک ۱۳۵
کہکشاں ۱۳۷
بھجن ۱۳۸
نیا عہد نامہ ۱۴۰

شکستِ خواب ۱۴۴
نیپیر روڈ ۱۴۶
پھر یومِ بہار آیا ۱۴۷
مزارِ قائد پر ۱۵۱
سوسائٹی گرل ۱۵۴
۸/ جنوری ۵۳ء ۱۵۷
دیوانی ۱۶۰
اجنبی مہمان ۱۶۴
مہاجر بستیاں ۱۶۹
دلاسہ ۱۷۱
سکوت مضطرب ۱۷۴
زہر خند ۱۷۵
ایک سرکش دماغ تھا۔۔۔نہ رہا ۱۷۷
انسان امر ہے ۱۸۰
منظر و پس منظر ۱۸۲
طبقاتی مساوات ۱۸۷
رموزِ حیات ۱۹۰
کافی ہاؤس ۱۹۲
لاشوں کی بستی ۱۹۴
مادرِ وطن کا نوحہ ۱۹۶
ایک مصرعہ ۔۔۔ ایک نظم ۱۹۷
رباعیات ۱۹۸
متفرق اشعار ۲۰۱

میں اور میرا فن

کتابیں تو آئے دن چھپتی رہتی ہیں لیکن اپنی کتاب کو اشاعت کے لیے دیتے وقت جو کچھ مصنف پر گزرتی ہے، وہ اسی کا دل جانتا ہے۔ اس وقت میں کچھ عجیب سی کشمکش سے دوچار ہوں۔ ایک طرف تو یہ ندامت کہ جس بک ڈپو اور جس لائبریری میں یہ کتاب رکھی جائے گی وہیں کہیں میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور دنیا کی دوسری زبانوں کی کم و بیش اسی مرتبے کی شخصیتوں کا سرمایۂ فکر یک جا ہوگا۔ دوسری طرف یہ احساس کہ جانے اس مجموعۂ اشعار کا کیا حشر ہو، ایک طرف تنقید نگار ہیں دوسری طرف بازار، ناقدین میں سوائے چند کے بیشتر ایسے ہیں جن کی نگاہِ نکتہ شناس جب کسی تخلیق کو پرکھنے پر آ جاتی ہے تو انہیں کسی الف کی شاعری میں ملٹن اور میرؔ کی روح نظر آنے لگتی ہے اور کسی ب کی افسانہ نگاری کے مقابلے میں چیخوف اور پریم چند اپنی کم مائیگی پر سر بہ گریباں دکھائی دیتے ہیں اور جب ان کی فکرِ گردوں مقام اپنی بلندیوں سے کسی خاک نشیں کا جائزہ لینے لگتی ہے تو اپنے عہد کی ابھرتی ہوئی شخصیتیں تو درکنار منفرد شخصیتوں کو بھی قابل اعتنا نہیں سمجھتی۔

بازار کا عالم یہ ہے کہ تیسرے درجہ کا ادب تو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتا ہے لیکن ادبِ عالیہ کا بہترین انتخاب اور عہدِ رواں کی عظیم تخلیقات اپنے قارئینِ کرام کا منہ دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ انہی حقائق کے پیشِ نظر دل ہمیشہ ڈرتا رہا اور میں خاص طور پر اپنے مجموعۂ کلام کی اشاعت سے گریز کرتا رہا کہ جو عظیم تخلیق ہے اور نہ بازار کی مانگ کے مطابق کوئی چیز۔۔۔ لیکن میرے دوست اور کرم فرما۔۔۔ جن کی تعداد یقیناً زیادہ نہیں۔۔۔ مُصر رہے کہ میں بھی رسوا سرِ بازار ہو جاؤں۔ روایت بھی کچھ یہی رہی ہے۔ میں نے بھی اس روایت کا پاس کیا اور آج اپنا دامن سمیٹے

چوراہے کے بیچ میں کھڑا ہوں بقول ساحرلدھیانوی ؎

مرے دامنِ چاک میں گردِ راہِ سفر کے سوا کچھ نہیں

میری پوری شاعری اِسی ''گردِ راہِ سفر'' کی آئینہ دار ہے۔ یہ گرد زندگی کے ہر موڑ پر میرے دامن ۔۔۔ میرے تن من سے لپٹی رہی ہے اور سچ پوچھئے تو اِسی گرد سے میری شاعری اُبھری ہے اور شاید کسی روز اسی گرد میں دب کر بھی رہ جائے۔ آج جب اپنی ''گردِ سفر'' کی نمائش کا وقت آ ہی گیا ہے تو میں سوچ رہا ہوں ۔ کیوں نہ کچھ دیر کے لیے اس گرد کو صاف کر کے اپنے خدوخال بھی نمایاں کردوں۔

میرے آبائی وطن ریاست حیدرآباد دکن میں ایرانی تقویم 'فصلی' رائج تھی ۔ ستمبر ۴۸ء میں ہندوستان کے قبضے کے کچھ عرصے بعد وہاں بھی ''عیسوی'' کا رواج ہوگیا۔ ۱۹۵۱ء میں میٹرک کا امتحان دے کر میں پاکستان آگیا تھا اور کامیابی کی اطلاع پا کر وہیں میٹرک کی سند منگوالی۔ اس سند پر میری تاریخ پیدائش ۱۴ جولائی ۱۹۲۶ء مرقوم تھی ۔ میں نے اسی کو درست سمجھ لیا۔ خاندانی یاداشت (فصلی تقویم کے مطابق) میری عمر۔۔۔ موجودہ عمر سے تین یا چار سال کم ہے۔ اس لیے یوں کہا جاسکتا ہے کہ آج (کتاب کی اشاعت ۱۹۵۶ء) سے پچیس تیس سال پہلے میں نے اپنے آبائی شہر اورنگ آباد میں زندگی کی پہلی سانس لی تھی۔ اس گھر کے بارے میں مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ کچی مٹی کا ایک مکان تھا۔۔۔ لیکن اگر مجھے اس کچی مٹی کے گھر پر ناز ہے تو اس لیے کہ اس کی وساطت سے مجھے اپنے ملک کے ننانوے فی صد انسانوں کی زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا ان کے تہذیبی پس منظر اور ان کی ذہنی تربیت کے مختلف خم و پیچ کو پرکھنے والی نگاہ عطا ہوئی۔ مجھے وہ دردنصیب ہوا جو میرے شعور کی روشنی میں چمک کر شعلہ نہ بن سکا تو ایک انگارہ ضرور بن گیا۔ یہ انگارہ جو میرے سینے میں مسلسل دہکتا رہتا ہے، میری تاریخ کی امانت ہے، میری تہذیب کا عطیہ ہے۔ یہی انگارہ کبھی ہوائے زمانہ سے بھڑک اٹھتا ہے تو میرے اور میرے فن کے لیے مشعل راہ

بن جاتا ہے اور کبھی ۔۔۔ چراغِ سرِ مزار۔ ممکن ہے، میرے احباب اور میرے ناقدین اسے فرار سے تعبیر کریں لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہی 'چراغِ سرِ مزار' میری زندگی کا محور بھی ہے۔ اس کا واقعاتی پس منظر بڑا طویل اور دردوغم میں ڈوبا ہوا ہے اس لیے میں اس کا ذکر نہیں کروں گا لیکن میرے ذہنی عمل اور میری شاعری میں اس کے ردعمل کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ میں مختصراً ایک بات کہہ دوں ۔۔۔ یوں سمجھ لیجیے کہ محبتوں کے جتنے سہارے مجھے ملے اسی عمر میں 'چراغِ سرِ مزار' میں ڈھل گئے جب زندگی ایک کھیل ایک شرارت کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتی۔ اس المیے نے تنہائی کا شدید احساس میرے دل میں پیدا کر دیا اور عرصہ دراز تک مجھے اس دنیا سے نفرت رہی ہمارے طبقاتی نظام نے اس نفرت کو اور ہوا دی اور کیا عجب تھا کہ میں 'خودکشی' کر لیتا۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ سے چاقو چھین لیا اور ایک کتاب تھما دی (دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ کتاب، کالج میں مجھے کبھی نہیں پڑھائی گئی تھی)

اس گمنام شخص کا نام ہے۔۔۔ کامریڈ افتخار۔۔۔ جو میرا دوست بھی ہے اور محسن بھی، افتخار نے میرے ذہنی میلان کا رخ اس طرف موڑ دیا جس طرف وہ خود جا رہا تھا یعنی زندگی کے راستے پر۔۔۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ راستہ کٹھن ضرور ہے لیکن حَسین اتنا ہے کہ ہر انسان کا دل دوسرے انسان کے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہے۔ دھڑکنوں کی ہم آہنگی کے اس احساس نے میری فکر کو ایک نیا زاویہ عطا کیا اور مجھے محسوس ہوا کہ انسان فرد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک 'اجتماع' بھی ہے اور انسان کے ارتقاء کی انتہائی منزل اپنی ذات میں ضم ہونا نہیں، ایک 'اجتماعی انسان' ہوجانا ہے ؎

کلی کی ننھی سی گود میں محوِ خواب ہیں گلستاں ہزاروں
زمیں کے ایک ایک ذرہ میں سانس لے رہے ہیں جہاں ہزاروں

نہایتِ قطرہ ابرِ باراں، مآلِ خورشید کہکشاں ہے
قدم قدم پر ہے موت لیکن حیات کا کارواں، رواں ہے

سکوتِ موج میں مضطر ہیں سینکڑوں طوفاں
تہِ سکوت کی طغیانیوں کو موت نہیں

میں جس گھرانے میں پلا بڑھا وہ نہ صرف یہ کہ کٹر مذہبی گھرانا ہے بلکہ تعلیمی اعتبار سے بھی بہت پیچھے ہے۔ صرف ایک میرے والد ہیں جو کچھ تعلیم حاصل کر سکے اور ان کے زیر سایہ مجھے کچھ پڑھ لکھ لینے کا موقع مل گیا۔ شاعری، ادب، یا سیاست میرے گھرانے کو کبھی چھو کر بھی نہیں گئی بقول غالب ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

میرے گھرانے میں سپہ گری کے ساتھ ساتھ کھیتی باڑی بھی شامل ہے۔ اس کا یہ مفہوم نہیں کہ میں کسی زمیندار یا جاگیردار خاندان کا فرد ہوں۔ حیدرآباد (دکن) میں ایک طبقہ ہوتا تھا۔۔۔ ''انعام دار'' ۔۔۔ اس طبقے کی تاریخ یہ ہے کہ بادشاہِ وقت، کسی بات، کسی کام یا کارنامے سے خوش ہو کر مرحمتِ خسروانہ کے طور پر زمین کے کچھ قطعات عطا کر دیا کرتا تھا اور پھر اِسی متاع کے سہارے نسل در نسل زندگی گزرتی۔ نسل کے ساتھ تقسیم در تقسیم سے اگر وہ زمین اتنی باقی نہیں رہتی کہ ایک فرد کے متعلقین کی کفیل ہو سکے تو ان گھروں کے افراد ملازمت کی تلاش میں نکل پڑتے۔۔۔ میرا خاندان اسی قسم کی ملازمت پیشہ انعام داروں کا خاندان ہے۔۔۔ ظاہر ہے ایسے خاندان میں علم و ادب سے شغف کا کیا تصور کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال۔۔۔ ایک ایسے ہی گھرانے اور ایسے ہی ماحول میں پل بڑھ کر میری عمر نے شعور کے حدود میں قدم رکھا اور مختلف قسم کی علمی، ادبی اور سیاسی ہنگامہ بازیوں سے گزر کر زندگی اس موڑ پر آ گئی جہاں پہنچ کر عمل، سوچ کے تابع ہو جاتا ہے۔

میری ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۵ء میں ہوا۔ پہلے مضامین اور افسانے لکھے اور بعد میں شاعری شروع کی، یہ وہ زمانہ تھا کہ جب غیر مقسم ہندوستان میں کانگریس اور مسلم لیگ مدت سے باہم دست و گریباں رہ کر آخر اس منزل تک آ گئی تھیں کہ ملک کا تقسیم ہو جانا ناگزیر تھا۔ ادھر حیدرآباد (دکن) جو اپنی جگہ الگ 'ایک ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تعمیر' کیے ہوئے تھا۔ سیاسی اعتبار سے ایسے گروہ کے ہاتھ میں آ گیا تھا جس کی سیاسی بصیرت اپنی مثال آپ تھی۔۔۔ خیر، اورنگ آباد، جس کی خاک کو ولیؔ جیسے شاعر کے نقشِ کفِ پا کا شرف حاصل ہے، جہاں کی فضاؤں میں داؤدؔ جیسے شیریں مقال شاعر کے نغمے گونجے اور جس کی مٹی نے سراجؔ کو آج بھی اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔ عرصۂ دراز سے ادبی اور علمی اعتبار سے اس قدر محدود ہو کر رہ گیا تھا کہ اپنی آواز کی بازگشت بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ بلدہ (حیدرآباد) میں تو ادب اور صحافت کا بڑا شہرہ تھا لیکن اورنگ آباد میں کوئی پریس ہی تھا نہ وہاں سے کوئی رسالہ یا اخبار ہی شائع ہوتا تھا۔ انجمن ترقی اردو کے سہارے صرف مولوی عبدالحق نے ایک روایت قائم کر رکھی تھی لیکن جب انجمن کا دفتر بھی اورنگ آباد سے اٹھ گیا تو یہ تاریخی شہر ایک بے مصرف سی یادگار ہو کر رہ گیا۔ چلتی پھرتی لاشوں کا ایک کھنڈر

میری شاعری نے اسی کھنڈر میں جنم لیا اور آنکھیں کھول کر جب اپنے اطراف دیکھا تو دور دور تک اندھیرا تھا۔ کہیں کہیں کچھ چراغ ٹمٹما رہے تھے۔ جن کی لرزتی ہوئی روشنی کبھی کبھی دل کی ڈھارس بندھا دیتی تھی۔ اس عالم میں اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کا تصور خود فریبی سے زیادہ نہ تھا اور غالباً یہی وجہ تھی کہ کالج سے نکلے ہوئے بہت سارے احباب جوں ہی عملی زندگی میں داخل ہوئے۔ ایک بیوی کے شوہر، چند بچوں کے باپ کے سوا کچھ باقی نہ رہے۔ ان کے وہ سارے خواب منتشر ہو گئے جو کبھی نظروں کے آئینہ خانوں میں خود کو سنوارا کرتے تھے۔ اس گروپ میں صرف میرے قدم ادب و شعر کے میدان میں جمے رہے اور عمر کا ایک بڑا حصہ اپنی اسی خوش فہمی کی نذر ہو گیا۔

آج جب میں اپنی پچھلی زندگی کا جائزہ لینے بیٹھا ہوں تو محسوسات کا کچھ عجیب عالم ہے۔ بیشتر واقعات ذہن کے پردے پر ابھر آئے ہیں اور زندگی آنسو کے ایک قطرے میں لرزتی ہوئی چمک کی طرح مجھ پر خندہ زن ہے اور میں نگاہیں نیچی کیے سوچ رہا ہوں ؎

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

عمر کے اس مختصر سے دوران میں، میں نے اتنے نشیب و فراز دیکھے، اتنے تلخ، ترش اور شیریں لمحات سے گزرا، اتنی ٹھوکریں کھائیں اور اتنی بار گر گر کر سنبھلا کہ اپنی زندگی پر خود ایک طنز ہو کر ہو گیا اور مسائل کو جانے دیجیے۔ روزگار کا مسئلہ یوں بھی اپنے وطن کا ایک خاص مسئلہ ہے ہی۔ میں بھی اس سے دوچار رہا ہوں۔۔۔ کالج کی زندگی سے لے کر آج تک ہر دور میری زندگی کا ایک دور کشاکش رہا ہے۔ ایک بات سلجھتی ہے تو دوسری اُلجھ جاتی ہے اور سلجھنے اور الجھنے کا یہ لامتناہی سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے۔ کل میں ریڈیو سے متعلق تھا، آج انجمن ترقی اردو سے متعلق ہوں اور کیا عجب ہے کہ کل طلوع ہونے والی صبح ۵۰ء کی طرح پھر مجھے ایک اخبار فروش کے روپ میں دیکھے۔ مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ میں نے اپنا سر بلند رکھنے کی خاطر معمولی سے معمولی کام بھی کیا ہے اور اُس آگ کو جو ہمیشہ میرے سینے میں دہکتی رہتی ہے کبھی کسی عنوان بجھنے نہ دیا اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ مجھے اپنے طبقے، اپنے کچی مٹی کے مکان اور اپنی اس معمولی سی زندگی پر ناز ہے جس کی وساطت سے مجھے سماج میں زندگی کے جدلیاتی عمل کو سمجھنے کا موقع ملا، مجھے وہ درد نصیب ہوا، جو میرے شعور کی روشنی میں چمک کر شعلہ نہ بن سکا تو ایک انگارہ ضرور بن گیا۔ یہی انگارہ کبھی ہوائے زمانہ سے بھڑک اٹھتا ہے تو میرے اور میرے فن کے لیے مشعل راہ بن جاتا اور کبھی۔۔۔ چراغِ سرِ مزار

آپ ٹھنڈے دل سے میری شاعری کا مطالعہ کریں گے تو میرے خیال میں آپ اس آتشیں رو کو محسوس کر لیں گے جو میری رگ رگ میں رواں دواں ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس

آگ کی حدت کو محسوس طور پر پیش کرنے میں، میں کہاں تک کامیاب رہا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود میری شاعری صرف دماغ کا ناپ تول نہیں ہے۔ اس میں دل کی دھڑکنیں بھی شامل ہیں۔

شاعری میں میرا نقطہ نگاہ کسی غیر معمولی انفرادیت کا حامل نہیں ہے میں شعوری طور پر کسی ایسی جدت کا بھی طرف دار نہیں ہوں جو فنکار کا رشتہ اپنے عہد یا اپنے عہد کی زندگی سے توڑ لے۔ میرے خیال میں جتنی اہمیت روایت کی ہوتی ہے، اتنی ہی اُن اقدار کی بھی ہوتی ہے، جنہیں عصرِ رواں جنم دیتا ہے۔ میرے نزدیک فنکار اپنے عہد کا نمائندہ انہی معنوں میں ہوتا ہے اور ادب اپنے عہد کی تاریخ انہی معنوں میں مرتب کرتا ہے کہ وہ اپنے عصر کے شعور کا ترجمان ہوتا ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ شعور کیا چیز ہے؟

شعور حقیقت کے ادراک سے عبارت ہے اور حقیقت وہ نہیں ہوتی جو ہم دیکھتے ہیں بلکہ وہ ہوتی ہے جو پیش نظر شے میں درپردہ کہیں کارفرما ہوتی ہے لیکن یہاں بھی یہ مسئلہ بحث طلب رہتا ہے کہ دنیا میں مختلف نقاطِ نظر کے لوگ آباد ہیں اور اپنے اپنے خیال کے مطابق حقیقت کی تلاش میں ہر ایک اپنی راہ کو مستقیم سمجھتا ہے۔ ہر ایک اپنے زاویۂ نظر کو صحیح قرار دیتا ہے پھر یہ کیسے طے ہو کہ کون اپنی دانست میں صحیح ہے اور کون غلط؟ ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ یوں نہیں ہو سکتا۔ ہر رجحان کے پیچھے ایک فلسفہ ہوتا ہے اور ہر فلسفہ اپنے تحفظ کے لیے منطق کا ایک قلعہ بھی تعمیر کر لیتا ہے اور اس قلعہ میں گھر کر دماغ اکثر اٹل حقیقتوں سے بھی انکار کر جاتا ہے اور طول و فرسنگ اطراف و جوانب میں الجھ کر خواہ مخواہ ایک مسئلۂ لاینحل بن جاتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ حقیقت کی جستجو میں فکر کا رخ تاریخ کی روشنی میں متعین کیا جائے۔

تاریخ ادوار کے واقعاتی تسلسل کا نام نہیں بلکہ معاشرتی ارتقاء کے جدلیاتی تسلسل کا نام ہے۔ جب تک ہم تاریخ کے مادی حقائق کی کسوٹی پر بحث طلب مسائل کو نہیں پرکھیں گے، کھرے

اور کھوٹے کا فرق ظاہر نہیں ہوگا، ظاہر ہے کہ یہ کام وہی فنکار انجام دے سکتا ہے جو ادب کو دل کا مشغلہ نہیں بلکہ دماغ کی زندگی سے تعبیر کرتا ہے اور ایسے فنکار کے نزدیک نہ صرف اپنے عہد کی اقدار مقدم ہوتی ہیں بلکہ روایتی اقدار بھی، کیونکہ ہر نوزائدہ قدر ماضی میں اپنا ایک تسلسل رکھتی ہے اور اپنی جگہ آئندہ امکانات کے ایک لامتناہی سلسلے کا نقطۂ آغاز بنی رہتی ہے۔

آج کل ادب میں جب بھی یہ سوال اٹھایا جاتا ہے تو ادبِ عالیہ کی بحث چھڑ جاتی ہے اور ایک حلقے سے یہ آواز اٹھتی ہے کہ ادبِ عالیہ شعوری طور پر ہر قسم کی حد بندی سے آزاد رہا ہے اور اسی میں اس کی ابدیت کا راز پنہاں ہے۔ میرے خیال میں یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ہر داخلی تحریک کی جڑیں خارج میں پیوست ہوتی ہیں اور خارج کے ساتھ ساتھ عمل کی داخلی نوعیت میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ میر صاحب کے یہ اشعار پڑھیے ؎

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ جھگڑا حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

نہ مل میرؔ اب ان امیروں سے تو
ہوئے ہیں غریب ان کی دولت سے ہم

کیا ان افکار کا تعلق خارجی عوامل سے نہیں؟

اب ان افکار کے ساتھ غالب تک سفر کیجیے۔ غالب کہتا ہے ؎

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

غالب جس نتیجے پر پہنچا ہے اس کے پیچھے تاریخ کا بھی ایک سفر ہے جو مختلف مراحل سے گزر کر غالب کا لہجہ اختیار کر گیا اور غالب کے سوالات ہمارے عہد کے سوالات بن گئے ہیں ؎

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں، آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

یہی فکری تسلسل اپنے جدلیاتی عمل سے گزر کر آج فرد کو اس کے طبقاتی کردار کا شعور دیتے ہوئے اسے ایک 'اجتماعی انسان' کا تصور دے رہا ہے۔ 'مجرد انسان' کا روایتی تصور آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی شاعری زیرِ لب گنگنا کر الفاظ کو ایک خاص وزن میں ترتیب دے لینے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ دل و دماغ کے ایک معنوی ربط سے وجود میں آتی ہے اور دل و دماغ کا یہ معنوی ربط اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا جب تک کہ ہماری نظر میں اپنا عہد اپنی تمام تر پیچیدگیوں کے ساتھ روشن نہ ہو۔

جہاں تک میرے کلام کا تعلق ہے اُسے آسانی سے تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ غمِ جاناں، غمِ وطن اور غمِ کائنات۔۔۔ غمِ جاناں کے زمرے میں جو تخلیقات شامل ہیں ان میں یقیناً میرا ذاتی غم موضوعِ شعر ہے لیکن میں نے کوشش کی ہے کہ میرا ذاتی غم میرا ''نجی غم'' بن کر نہ رہ جائے بلکہ سماجی زندگی کے رشتے سے یہ موضوع غمِ مشترک کی حیثیت اختیار کر جائے۔ چنانچہ اسے غمِ دوراں سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ غمِ وطن یقیناً میرے یہاں غمِ جاناں سے مختلف ہے، اس کا لب و لہجہ مختلف ہے، اس میں تلخی کا وہ احساس مختلف ہے جو غمِ جاناں میں بھی اکثر منہ کا مزہ خراب کر دیتا ہے۔ غمِ وطن میں یہ تلخی نسبتاً شدید ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ (اس میں ہجرت کا غم بھی شامل ہے) اس کے بعد غمِ کائنات کا سلسلہ ہے جس میں غمِ جاناں اور غمِ وطن دونوں شامل ہیں۔ میری جو تخلیقات اس دائرے میں آتی ہیں اس میں کہیں آپ کو بے پناہ ضبط کا احساس ہوگا اور کہیں

ایسا محسوس ہوگا کہ چیخ، للکار بن گئی ہے۔ اسے بادی النظر میں جو بھی کہا جائے مگر شاعری میں اس کا بھی ایک مقام ہے۔ اس کا تاثر وقتی سہی مگر تاریخ کے بین السطور میں چھپی ہوئی حقیقتوں کو یہی شاعری آئینہ دکھاتی ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔۔۔ دو باتیں اور۔۔۔

پہلی بات تو یہ کہ جدید ادب میں زبان سے جو بے اعتنائی برتی جا رہی ہے، میں اس کا سخت مخالف ہوں۔ میرے نزدیک زبان بنیادی چیز ہے۔ شاعری کیسے ہی خیالات کی آئینہ دار کیوں نہ ہو، زبان کے آرٹ سے بے نیازانہ گزرنے کی کوشش کرے گی تو ممکن ہے کچھ عرصے کے لیے عام توجہ کا مرکز بن جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا دائرہ اثر ہمہ گیر اور دیرپا نہیں رہے گا، تخلیق کی ابدیت کا راز زبان کے آداب میں پنہاں ہے۔ ہمیں مروجہ زبان میں نت نئے الفاظ ضرور شامل کرنا چاہیے، نئے انداز بیان کی طرف بھی توجہ دینا چاہیے لیکن بے مقصد جدتیت جو کلام کو بے کیف بھی بنا دیتی ہے یقیناً سودمند ثابت نہیں ہوگی۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ الفاظ کے دروبست اور خیال کی شیرازہ بندی میں اس رکھ رکھاؤ کا ضرور پابند رہوں جس سے اردو زبان کا مزاج عبارت ہے۔

دوسری بات موضوعات کے انتخاب سے متعلق ہے اور خصوصاً حسن و عشق کے معاملات میں۔۔۔ میری شاعری میں کہیں بھی آپ کو اس روایت کی جھلک نظر نہیں آئے گی جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو، میں نے زندگی کو ہمیشہ جس روپ میں دیکھا ہے اسی روپ میں اس کی تصویر کشی کی ہے۔ میرا محبوب وہی ہے جو زندگی میں میرا محبوب ہے۔۔۔ میری طرح گوشت و پوست کا انسان۔۔۔ ظاہر ہے کہ اس کے محسوسات انسانی محسوسات سے مختلف نہیں ہوسکتے۔ اگر مجھے اس سے عشق ہے تو اس نے بھی مجھے چاہا ہے اگر میں اسے اپنا نہیں سکا، تو میں نے گریباں چاک کر کے دشت نوردی کرنے کی بجائے سماجی حالات میں اپنے عشق کی ناکامی کا جواز تلاش کیا ہے اور اسے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور اگر میں نے اسے پا لیا ہے تو سماجی

زندگی میں اس کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔۔۔ زندگی میں یہی کچھ ہوتا ہے اور اس کے علاوہ سب مفروضات ہیں۔

اس کتاب میں آپ کو بعض ایسی نظمیں بھی ملیں گی جو بالکل گھریلو ماحول سے متعلق ہیں ان میں آپ کو وہ غم بھی ملے گا جو گرہستی سے علاقہ رکھتا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ وہ مسرت مجھ سے خود بخود شعر کہلوا لیتی ہے جو آفس سے گھر آنے کے بعد بیوی کے ہلکے سے تبسم اور بچوں کی پرلطف شرارتوں سے مجھے حاصل ہوتی ہے اور اسی طرح میں اس غم کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا جو ان چہروں پر ہلکی سی افسردگی دیکھ کر اندر ہی اندر دل کو کھائے جاتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میرے اس رجحان کو ادبی دنیا میں کس نظر سے دیکھا جائے گا۔ میرے نزدیک تو ان موضوعات کو شعر کا موضوع نہ بنانا حقیقت سے روگردانی کے مترادف ہے۔ بہرحال زندگی اور شاعری سے متعلق جو میرے نظریات ہیں وہ میں نے بیان کر دیے۔ اب آپ جو چاہیں میرے بارے میں رائے قائم کریں۔

حمایت علی شاعر

ریڈیو پاکستان۔ حیدرآباد (سندھ)

(۱۹۵۶ء)

(نوٹ)

میری بعض نظمیں، کچھ افسانے اور اخباری کالم مختلف رسائل میں مختلف قلمی ناموں سے بھی چھپتے رہے ہیں ۴۵ء سے ۱۹۵۰ء تک ہندوستان میں 'حمایت تراب، نزدوش اور ابلیس فردوسی' اور پاکستان کے بعض رسائل و اخبارات میں ۵۵ سے ۱۹۹۳ء تک 'ابن مریم' کے نام سے شائع ہوئے۔

یوں کتنی نگاہوں کا سندیسہ نہ ملا
دل ایسا تھا پتھر کہ کسی کا نہ ہوا
اب حال مگر یہ ہے کہ دھڑکن نہ سکوت
کیا جانیے اُس ایک نظر میں کیا تھا

جنتِ نگاہ

آج یہ کس سرزمیں کا آسماں آنکھوں میں ہے
جو کبھی دیکھا نہیں تھا، وہ سماں آنکھوں میں ہے
شاخ جسموں پر مہکتے پھول چہروں کی بہار
زندگی کے پھول بن کا اِک جہاں آنکھوں میں ہے
رنگ روشن ہیں کہ رنگیں روشنی کا گلستاں
چھوٹتی مہتابیوں کی کہکشاں آنکھوں میں ہے
دل کی دھڑکن میں ہے رقصِ بے خودی کی کیفیت
آنکھ سے اوجھل تھا جو وہ جانِ جاں آنکھوں میں ہے
خواب میں بیدار ہوں یا ہے یہ بیداری کا خواب
روح میں حسنِ یقیں، حسنِ گماں آنکھوں میں ہے
اب سے پہلے تو کبھی اتنی حسیں دنیا نہ تھی
آج کس کا حسن زیرِ آسماں آنکھوں میں ہے
میں تو شاعر ہوں بھلا دیکھوں نہ کیوں میں بھی وہ خواب
جو غموں سے دُور، میری خوش گماں آنکھوں میں ہے

حسنِ بے نام

آنکھوں میں بسا رہتا ہے وہ پھول سا چہرہ
وہ پیکرِ گُل جس کا کوئی نام نہیں ہے
وہ حسن جسے دیکھ کے اِک نشہ سا چھا جائے
وہ نشہ جو مرہونِ مئے و جام نہیں ہے

میں نے اُسے دیکھا تھا کہاں، یاد نہیں کچھ
کب دل میں وہ تصویر اُتر آئی نہیں معلوم
ہاں دل کے دھڑکنے کی صدا یاد ہے اور پھر
کب شام ہوئی کب سحر آئی نہیں معلوم

کچھ ایسا تھا عالم کہ ہر اِک سمت فضا میں
اِک کیفیتِ خواب بصد رنگ رواں تھی
آئینے کی مانند چمک اُٹھی تھی دنیا
نظروں سے کوئی چیز نہاں تھی نہ عیاں تھی

اب تک اُسی عالم میں ہیں کھوئی ہوئی آنکھیں
جاگی ہوئی آنکھیں ہوں کہ سوئی ہوئی آنکھیں

O

ایک پرچھائیں سی آوارہ ہے ویراں دل میں
جانے کیوں اُس کے تعاقب کا ہے ارماں دل میں

پیکرِ خیال

تجھ سے مل کر مجھے اکثر یہ خیال آتا ہے
جیسے تو مجھ سے بہت دور نہیں تھی پہلے
خواب کی طرح نگاہوں میں تھی موجود کہیں
یا مری روح میں آباد کہیں تھی پہلے

میں نے تجھ کو کبھی دیکھا تو نہیں تھا لیکن
تو ہر اِک شئے میں تھی آئینۂ فطرت بن کر
لبِ خنداں میں تھی بے وجہ تبسم کی طرح
دل میں بیدار تھی بے نام مسرت بن کر

یہ خدوخال ہیں میرے لیے اتنے مانوس
جیسے خود میرے تصور نے تراشا ہے انہیں
حسن کے جتنے مقامات ترے جسم میں ہیں
اپنے ہاتھوں، ترے پیکر میں سجایا ہے انہیں

اب تو جی چاہے کہ بس تیرا سراپا لکھوں
جب بھی لکھوں، ترے پیکر کا قصیدہ لکھوں

O

نازِ گل پیرہناں، نازشِ سیمیں بدناں
رشکِ مہتاب رُخاں، حسرتِ شیریں دہناں
تو کہ تیرے لبِ لعلیں، مرا عنوانِ غزل
تو کہ تیرے قدِ موزوں سے خجل سروِ رواں
تیرا پیکر ہمہ نور و ہمہ نکہت، ہمہ رنگ
تیرے پَرتَو سے منور ہے مرا شعلۂ جاں

حسرتِ قرب

جیسے وہ خواب کی دنیا سے اُتر آئی تھی
میں نے دیکھا تو مرے دل نے یہ چپکے سے کہا
یہ حسیں شکل تو مانوس نظر آتی ہے
یہ خدوخال یہ قامت یہ سلونی رنگت
کوئی بھولی ہوئی تصویر دِکھا جاتی ہے

یہ وہی روپ ہے جو صبح میں پنہاں تھا کہیں
یہ وہی رنگ ہے جو قوس قزح سے تھا عیاں
یہ وہی چہرہ ہے جو چاند سے جھانکا تھا کبھی
یہ وہی جسم ہے، چھونے کا جسے تھا ارماں

ہائے یہ لہجہ، یہ آواز، یہ اندازِ حیا
لب جو کھلتے ہیں تو غنچے سے چٹک جاتے ہیں
یہ تخاطب کا قرینہ، یہ ادائے گفتار
اِس ادا پر تو فرشتے بھی ٹھٹک جاتے ہیں

تم تو اِک شاعرِ فطرت ہو، تمہیں ہے یہ خبر
بزمِ فطرت ہے اِسی حسن کے پرتو سے حسیں
تم جن اشعار پہ نازاں ہو، وہ اشعار تمام
اِسی پیکر کے تصور سے ہوئے ہیں رنگیں

آج یہ حسنِ تصور، بہ ایں تزئینِ جمال
خواب و تعبیر کا سنگم ہے، ذرا دیکھو تو
آج یہ تم سے مخاطب بھی ہے، نزدیک بھی ہے
کیسا یہ سحرِ مجسم ہے، ذرا دیکھو تو

ایسے کافر سے تو ایمان ہے بیعت کرنا
خلوتِ خاص میں اِس بُت کی عبادت کرنا

تری آنکھیں

شبِ سیہ میں چراغِ نظر تری آنکھیں
رہِ حیات میں رختِ سفر تری آنکھیں

تو ساتھ ہو کہ نہ ہو، زندگی کی راہوں میں
رہیں ہمیشہ مری ہم سفر تری آنکھیں

خدا کرے کہ میں بس جاؤں تیری آنکھوں میں
کیے رہیں مری آنکھوں میں گھر تری آنکھیں

طلوع ہو تری پلکوں کے سائے میں ہر صبح
جھکی رہیں مری ہر شام پر تری آنکھیں

مری نگاہ میں رہ کر بھی جانے کیوں اب تک
مری نگاہ سے ہیں بے خبر تری آنکھیں

میں خود غرض بھی ہوں کتنا کہ بس یہی چاہوں
رہیں ہمیشہ مری منتظر ٥ تری آنکھیں

٥ ضرورتاً قافیہ بدل دیا ہے (شاعر)

تصویر تمہاری

آنکھوں میں اُتر آئی ہے تصویر تمہاری
اِک پیکرِ رعنائی ہے، تصویر تمہاری

میں تو اُسے چپ چاپ یونہی دیکھ رہا تھا
کس بات پہ شرمائی ہے تصویر تمہاری

آئینہ در آئینہ رہے گی یونہی روشن
خوابِ شب تنہائی ہے تصویر تمہاری

کیوں مجھ کو اِس انداز سے وہ دیکھ رہی ہے
کیا میری تمنائی ہے تصویر تمہاری؟

اشعار میں پوشیدہ، تصور میں نمایاں
کس طرح سے ہاتھ آئی ہے تصویر تمہاری

ترک وطلب

اُس رات تمہاری آنکھوں میں اِک شوخ چمک تھی، آخر کیوں
خاموش لبوں میں کھلتے ہوئے پھولوں کی لہک تھی آخر کیوں
اُس رات سے اب تک جانِ وفا میں سوچ رہا ہوں صبح ومسا
جب ترک تعلق کر بیٹھے پھر دل میں للک تھی آخر کیوں

وہ خواب تھا یا بیداری تھی
وہ رات بہت ہی بھاری تھی

تم کو تو نہیں معلوم مگر اُس رات میں پل بھر سو نہ سکا
حسرت تھی تمہیں اپنانے کی اپنا بھی میں اب تک ہو نہ سکا

تماشا

زندگی کے خموش لمحوں میں
اکثر ایسا بھی وقت آتا ہے
جب میں اپنے قریب رہ کر بھی
دیر تک خود سے دور رہتا ہوں
اُلجھے اُلجھے خیال کے بادل
روح و دل پر محیط رہتے ہیں
دور تک ملگجی فضاؤں میں
میری نظریں بھٹکتی رہتی ہیں
اور پھر جانے کن خلاؤں میں
آپ ہی آپ ڈوب جاتی ہیں

وقت کا کارواں گزرتا ہے
اور مجھے کچھ خبر نہیں ہوتی
ایسے کٹتا ہے یہ سفر میرا
کوئی شے ہم سفر نہیں ہوتی

پھر یکایک نہ جانے کیوں دل میں
ایک احساس جاگ اُٹھتا ہے
روح کے تار بجنے لگتے ہیں
اور میری نگاہ کے پنچھی
آشیانوں میں لوٹ آتے ہیں
میرے اطراف کی فضاؤں میں
پھول ہی پھول مسکراتے ہیں
اور میں کھلکھلا کے ہنستا ہوں
دور تک کوئی بھی نہیں ہوتا
اور میں گنگنائے جاتا ہوں

سوچتا ہوں کہ میں ہوں کیا آخر
آدمی ہوں کہ اِک کھلونا ہوں
کوئی عالم نہیں مرا عالم
زندگی کا عجب تماشا ہوں

غمِ رائیگاں

آنسوؤ، آج ساتھ دو میرا

آج میں اِس مقام پر ہوں جہاں
دل نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا
میری محرومیوں نے آخر کار
ہر طلسمِ فریب توڑ دیا

آج میری ہر ایک خوش فہمی
میرے خوابوں پہ طنز کرتی ہے
میری عمرِ رواں کی ہر ساعت
خندہ زن، طعنہ زن گزرتی ہے

مجھ کو ڈر ہے کہ میرا سوزِ دروں
میرا سب کچھ جلا نہ جائے کہیں
پیش و پس کی اُجاڑ تنہائی
مجھ کو چپ چاپ کھا نہ جائے کہیں

میں کہ اِس زندگی کے صحرا میں
اِک بگولے کی طرح اُڑتا رہا
کوئی منزل نہ ہم سفر کوئی
جس طرف راہ پائی مڑتا رہا

دل کو ہر گام پر کسی دل کی
کسی انسان کی تلاش رہی
لوگ ملتے رہے، بچھڑتے رہے
میرے کندھوں پہ میری لاش رہی

ایسے عالم میں یوں بھی ہوتا ہے
خود کو انساں فریب دیتا ہے
کسی تخئیل کے سہارے ہی
زندگانی گزار لیتا ہے

ایک واماندہ راہرو کے لیے
سنگِ راہِ سفر ہی کیا کم ہے
کوئی تسکین مستقل نہ سہی
راحتِ مختصر ہی کیا کم ہے

میں نے اِک بت کو زندگی دے دی
دل نے پتھر کو کر لیا ہم راز
ایک بے حس جسد کی نذر ہوا
میرے اشکوں کا سوز، دل کا گداز

کاش میں جانتا کہ پیکرِ سنگ
کبھی انسان ہو نہیں سکتا
کسی پتھر کے دل میں کوئی اشک
کوئی طوفاں سمو نہیں سکتا

میری محرومیوں نے آخرِ کار
ہر طلسمِ فریب توڑ دیا
سنگِ راہِ سفر نے پھر مجھ کو
راستے میں بھٹکتا چھوڑ دیا

آنسوؤ! آج ساتھ دو میرا
آج شاید یہ درد بٹ نہ سکے
آج دل کا عجیب عالم ہے
آج شاید یہ رات کٹ نہ سکے

O

شاید آ جائے کوئی تازہ ہوا کا جھونکا
میں نے اِس آس پہ دروازہ کھلا رکھا ہے

تنہا تنہا

میں بہت تھک گیا ہوں
یہ کٹھن راستہ مجھ سے اب طے نہ ہوگا
یہ تمازت، یہ ویراں خموشی
جو ازل سے مری ہم سفر ہے
آج زنجیرِ پا بن گئی ہے
یہ ہوا جس کے دامن میں بکھری ہوئی خاک ہے
یا کہ سورج کی جھڑتی ہوئی راکھ ہے
میرے رستے میں دیوار سی بن گئی ہے
میں بہت تھک گیا ہوں
ایک پتھر کے مانند افتادہ
چپ چاپ بیٹھا ہوا سوچتا ہوں
میرے اطراف ہر چیز ٹھہری ہوئی ہے
پیڑ، سورج، پہاڑ۔۔۔آسماں
اس جہاں کی ہر اک چیز ساکت ہے
کوئی نہیں جو مرا ہم سفر ہو
یہ طویل اور کٹھن راستہ مختصر ہو

وقت وقت کی بات

(قطعات)

قسمت

آپ انسان ہیں تو اِس سے کیا
کون سنتا ہے آپ کی فریاد
یہ تو قسمت کی بات ہے ہمدم
کوئی ناشاد ہے تو کوئی شاد

عزم

میں نے ٹھانی ہے اور ہی دل میں
چاہے وہ بات، بات ہو کہ نہ ہو
میں سنواروں گا گیسوئے ہستی
زندگی کو ثبات ہو کہ نہ ہو

دعوت

گر ہو سکے تو اور ستم مجھ پہ ڈھا کے دیکھ
ہاں آزما کے دیکھ، مجھے آزما کے دیکھ
اپنی نگاہِ عزم شکن کی قسم تجھے
نظریں چرا کے دیکھ، نگاہیں ملا کے دیکھ

جیت

اپنی ہر جیت کو میں ہار سمجھ بیٹھا تھا
اُن کی خاموشی کو انکار سمجھ بیٹھا تھا
خامشی بھی ہے ادا اُن کی، مجھے کیا معلوم
میں تو اب زندگی بیکار سمجھ بیٹھا تھا

شادی کے بعد

لبوں پہ خندۂ بے اختیار آ ہی گیا
مری حیات پہ رنگِ بہار چھا ہی گیا
ہزار چاہا زمانے نے میں تباہ رہوں
مگر کوئی مجھے اپنے گلے لگا ہی گیا

(مطبوعہ 'ادبِ لطیف' لاہور۔ فروری ۱۹۵۰ء)

ادھوری کہانی

آج سے چند برس قبل کہ جب تو بھی نہ تھی
اور کوئی بھی مرا مونس و غمخوار نہ تھا
شہر کے کوچہ و بازار تھے اور میرے قدم
اور کوئی مری محنت کا خریدار نہ تھا
میری حالت سے کسی کو بھی سروکار نہ تھا

تھک کے رہ جاتے مرے پاؤں، میں چلتا رہتا
بھوک کی آگ کو پانی سے بجھاتا رہتا
ایک ان جانی مسرت کی لگن دل میں لیے
اپنی بیزار طبیعت کو لبھاتا رہتا
نت نئی راہ اُمیدوں کو دکھاتا رہتا

جانے وہ کیسی مسرت تھی کہ جس کی خاطر
زہر کو زہر سمجھ کر بھی پیے جاتا تھا
زندگی عرصۂ سکرات ہوئی جاتی تھی
اور میں موت کے سائے میں جیے جاتا تھا
اپنے دامانِ دریدہ کو سیے جاتا تھا

یک بہ یک تجھ سے کسی روز ملاقات ہوئی
دور نظروں میں کوئی رنگ سے برسانے لگا
گنگناتے ہوئے بیدار ہوئے روح کے تار
دل کے نزدیک کوئی گیت سا لہرانے لگا
اپنے اطراف کی ہر چیز پہ پیار آنے لگا

تو دبے پاؤں چلی آئی مرے دل کے قریب
اور میں بھول گیا میری حقیقت کیا ہے
میں کہ افلاس مری جہدِ مسلسل کا صلہ
میری دنیا میں ترے پیار کی وقعت کیا ہے
بھوک کیا جانے کہ تعظیمِ محبت کیا ہے

میں کہ اِس دشتِ غمِ زیست کا تنہا رہرو
اپنی راہوں کے خم و پیچ سے اکتایا ہوا
کوئی ہمدم نہیں، مونس نہیں، غمخوار نہیں
ایک دل وہ بھی غمِ دہر سے گھبرایا ہوا
سہما سہما ہوا ہر گام پہ تھرایا ہوا

تیری آنکھوں میں محبت کا اشارہ پا کر
میری آنکھوں میں بھی اِک خواب سا لہرا ہی گیا
میں نے تیرے لیے دنیا سے بغاوت کر دی
اور بہر حال ترے پیار کو اپنا ہی گیا
اپنی قسمت کو تیرے پیار سے چمکا ہی گیا

کیسی کیسی نہ اُمنگیں تھیں، تمنائیں تھیں
تو دلہن بن کے جب آئی مرے غم خانے میں
چاندنی وسعتِ گردوں سے سمٹ آئی تھی
میری آنکھوں کے چھلکتے ہوئے پیمانے میں
ایک جنت تھی پشیماں مرے ویرانے میں

سوچتا تھا کہ خود اِس آگ میں جل جاؤں مگر
تجھ کو سر تا بہ قدم رشکِ گلستاں کردوں
نکہت و رنگ لٹاتے ہوئے محلوں کی طرح
تیری دنیا کو بھی فردوس بہ داماں کردوں
زندگانی کی حقیقت کو فروزاں کردوں

کہکشاں دور سے ہنس ہنس کے اشارے کرتی
اور میں ایک نظر ڈال کے بڑھ جاتا تھا
زندگی میرا ہر اِک گام اُڑاتی تھی مذاق
پاؤں اُٹھتے ہی نیا جال اُبھر آتا تھا
چار جانب سے اندھیرا مجھے دہلاتا تھا

رات دن فکرِ معاش اور فقط فکرِ معاش
بس یہی محورِ تاریک تھا اور میری حیات
کون سی صبح پسینے میں شرابور نہ تھی
کس شبِ ماہ نے پائی غمِ فردا سے نجات
ایک تھی میرے لیے دھوپ ہو یا چاندنی رات

تو مری فکرِ شب و روز سے واقف تھی مگر
اور کیا غم ہیں مجھے، یہ تجھے معلوم نہ تھا
تو کسی حال میں ہو ہنستی ہی رہتی تھی سدا
تیری آنکھوں میں شکایت کا بھی مفہوم نہ تھا
یوں بہ ظاہر ترا اِک لمحہ بھی مغموم نہ تھا

روز و شب کٹتے رہے، وقت گزرتا ہی رہا
اور اِک لمحۂ بے فکر بھی ہم پا نہ سکے
دور نظروں میں کسی جنت گم گشتہ کا عکس
مسکراتا رہا اور ہم اُسے اپنا نہ سکے
زیست کو زیست کا آئینہ بھی دکھلا نہ سکے

تیرے ملبوس میں پیوند ابھی ہیں کہ جو تھے
رنگ کجلائے چلا جاتا ہے چولھے کا دھواں
آنکھ کے گرد سیاہی سی بڑھے جاتی ہے
کھا گیا تیری جوانی کو ترا سوزِ نہاں
کتنا بے درد ہے، بے رحم نظامِ دوراں

(مطبوعہ 'شاعر' بمبئی دسمبر ۱۹۵۵ء)

وہ

وہ برق جس کے تعاقب میں آج تک تھی نگاہ
وہ برق آج مچلتی ہے میری بانہوں میں
وہ چاند، تھا جو تصور کو جگمگائے ہوئے
وہ چاند آج فروزاں ہے میری راہوں میں
وہ روپ جس کی جوانی پہ آفتاب خجل
وہ روپ آج ہے رقصاں مری نگاہوں میں
سنور سنور کے بکھرتا ہے خواب گاہوں میں

وہ بنتِ ماہ، وہ خلدِ بریں کی برنائی
نگار خانۂ فطرت کا اِک حسیں شہکار

وہ حسن کارِ اجنتا کے خواب کی تعبیر
وہ اِک بہارِ مجسم اک آتشیں گلزار
وہ سر سے پاؤں تلک آسماں کی حور کوئی
مِرے خدا کے کمالِ ہنر کی آئینہ دار
تمام حسن و جمالِ بہشت اس پہ نثار

وہ میرے دشتِ تمنا کی آخری منزل
وہ میرے عشق کی 'معراج'، زیست کا پندار
وہ میری سرد سی راتوں میں دوپہر کی دھوپ
وہ دوپہر میں خنک چاندنی کی نرم پھوار
وہ ایک گیت، وہ خلوت کا نغمۂ دلرس
وہ اِک غزل کہ مرصع ہیں جس کے سب اشعار
وہ جس کے کیف سے ہے، میری زندگی سرشار

'مری حیات، مری کائنات، مرا ثبات'

○ مخدوم محی الدین کا مصرعہ

تیری باتیں، تیرے خواب

اے مری جان، مرے خوابِ وفا کی تعبیر
آج جی چاہتا ہے تجھ کو بہت پیار کروں
تیری فرقت میں گزرتا ہے جو عالم مجھ پر
آج اُس کرب کا اشعار میں اظہار کروں

یاد ہے تجھ کو، ترے گاؤں کی وہ چاندنی رات
جب تجھے چھونے کی معصوم جسارت کی تھی
کتنی بیدار تھی خوابیدہ جوانی تیری
تو نے 'باچشمِ حقارت' جو عنایت کی تھی

جانے وہ تیری ادا تھی کہ حقیقت کا جمال
کس قیامت کی تھی وہ تند نگاہی تیری
رخ پہ بکھری ہوئی زلفوں میں وہ ابرو کا تناؤ
اِک گنہ بن گئی، ناکردہ گناہی میری

دل نے چپکے سے کہا، شاعرِ آوارہ مزاج
تیری بے نام تمنا کی یہی ہے معراج
انہیں قدموں پہ جھکا دے سرِ مغرور اپنا
یہی خاکِ کفِ پا ہے ترے ہر غم کا علاج

اب اِسی خاک سے تعبیر ہے میری دنیا
یہی خاکِ کفِ پا، سرمۂ چشمِ دل ہے
اِسی مٹی میں کھلایا ہے گلستاں میں نے
یہی مٹی مری معراج، مری منزل ہے

O

آج میں دور یہاں گوشۂ تنہائی میں
تیری تصویر سے بہلاتا ہوں جب دل اپنا
تیرے قدموں کی حسیں خاک اُڑی آتی ہے
اور میں دیکھنے لگتا ہوں وہ رنگیں سپنا

میرے غم خانے میں اِک چاند اُتر آیا تھا
جس کے آغوش میں بیدار تھی وہ گاؤں کی رات

تجھ کو چھونے کی وہ جھجکی ہوئی حسرت دل میں
وہی سوئے ہوئے جاگے ہوئے گم سم لمحات

وہ تری شرم سے جھکتی ہوئی لرزاں پلکیں
وہ لجائی ہوئی، سہمی ہوئی دل کی دھڑکن
وہ سلگتے ہوئے رخسار، لرزتے ہوئے ہونٹ
اولیں پیار کی حسرت میں وہ بیدار بدن

یاد ہے تجھ کو وہ گھونگھٹ کے اُلٹنے کا سماں
جب مری آنکھوں نے جی بھر کے تجھے دیکھا تھا
تیرے ہونٹوں پہ تھے جب میرے لبوں کے سائے
جسم و جاں میں کوئی طوفان اُمڈ آیا تھا

کس قدر تیز تھا طوفان کے دھاروں کا بہاؤ
موج سے موج لپٹتی تھی، بکھر جاتی تھی
وہ اُلجھتی ہوئی سانسوں میں دلوں کی دھڑکن
کس قیامت کے مراحل سے گزر جاتی تھی

ہائے وہ لمحہ جسے عمر کا حاصل کہیے
کتنی صدیاں اُسی لمحے میں اُتر آئی تھیں
ایک خاموشی میں پنہاں تھیں ہزاروں باتیں
اپنی خوش بختی پہ آنکھیں مری بھر آئی تھیں

میں نے مانگا تھا تجھے اپنے خدا سے جاناں
مرے اللہ نے سن لی مری فریاد خموش
میں نے چاہا تھا ترے پاؤں کی مٹی چوموں
میری آنکھوں سے لگی ہے تری گردِ پاپوش

کاش اِس گرد کو میں کاہکشاں کر پاتا
کاش اِن پیروں کو پھولوں میں سجا کر رکھتا
کاش اِس حسن کی ہر لمحہ عبادت کرتا
کاش اِس جسم کو سینے سے لگا کر رکھتا

O

آج جب دور ہوں تجھ سے تو میں یہ سوچتا ہوں
کتنا بدبخت ہے دل، کتنا گنہ گار ہوں میں

اور تو کوئی مسرت میں تجھے دے نہ سکا
ایک قربت تھی، تو اُس کا بھی خطا وار ہوں میں

جانے کب ختم ہو یہ سلسلۂ کربِ فراق
جانے کب تک ترے قدموں سے رہے دور جبیں
جانے کب گاؤں کا وہ چاند زمیں پر اُترے
اور ہم دیکھیں بہم مل کے وہی خوابِ حسیں

وہ حسیں خواب کہ ہے میرے ہر اِک غم کا علاج
میرا حاصل، میری خاموش وفا کی معراج

غمِ حاصل

اُس کو پا کر بھی دل افسردہ رہا کرتا ہے
اُس کو پا کر بھی کسی شے کی کمی ہے شاید
چشمِ خنداں کی چمک دیکھ کے آتا ہے خیال
یہ تبسم نہیں، اشکوں کی نمی ہے شاید
جسم اِک برق کا پیکر ہے، نظر کو تسلیم
دل کو ہر دم یہ گماں، برف جمی ہے شاید

عشق تو خیر ہے اِک جذبۂ سوزاں کہ جسے
کسی سائے کسی ٹھنڈک کی ضرورت ہی نہیں
کوئی آندھی، کوئی طوفاں ہو بہ فیضِ غمِ دل
اس دیے کو کسی فانوس کی حاجت ہی نہیں
عجز اتنا کہ اِک آنسو میں سمٹ کر رہ جائے
اور پندار کہ احساسِ ہزیمت ہی نہیں

پھر یہ اِک خار سا جو دل میں کھٹکتا ہے مدام
آخر اِس کربِ مسلسل کی حقیقت کیا ہے
نوجوانی تو ہے خود اپنی جگہ حسنِ تمام
اس کو آرائشِ قامت کی ضرورت کیا ہے
دل کی دھڑکن کا تقاضہ تھا کہ دو دل مل جائیں
پھر یہ خاموش سا احساسِ ہزیمت کیا ہے

سوچتا ہوں تو غمِ دل پہ ہنسی آتی ہے
کتنے نادان ہیں ہم عشق کے مارے ہوئے لوگ
زندگی کیا ہے حقیقت میں سمجھتے ہی نہیں
اپنے ماحول کی قبروں میں اُتارے ہوئے لوگ
ایک موہوم تصور ہے کہ جس کے اطراف
گھومتے رہتے ہیں ہم زیست سے ہارے ہوئے لوگ

وہ حسیں روپ کہ جس کے لیے دل نے اب تک
کسی کعبے، کسی بت خانے میں سجدہ نہ کیا
ہر شبِ ہجر گزاری ہے بہ اندازِ وصال

کسی غم کو کبھی خلوت میں بھی رسوا نہ کیا
ہر نفَس ایک جہنم کی تپش سے گزرا
اور اشکوں سے بھی اس آگ کو ٹھنڈا نہ کیا

وہ حسیں روپ بھی آخر ہے اِک انساں پیکر
اور وہ پیکر کسی پتھر کا تراشیدہ نہیں
کوئی انسان ہو، دل ہے تو یہ دنیا بھی ہے
اور اس شیشے سے نازک تو کوئی شیشہ نہیں
آدمی کیا ہے اگر حسِ لطافت مٹ جائے
زندگی کیا ہے، گر آسائش یک لمحہ نہیں

آج جب عشق، غمِ زیست سے ٹکرایا ہے
ٹوٹ کر رہ گیا خوابوں کا ہر اِک تاج محل
کسی تخئیل کو اب دعویٰء فردوس نہیں
دل ہے اب اپنی تمناؤں کا خود اک مقتل
کوئی ساعت ہو، کوئی راہ گزر ہو ہر گام
زیست کی تاک میں بیٹھی نظر آتی ہے اجل

جبرِ عہد

(ملازمت سے ہٹائے جانے پر)

تم خلاؤں میں نظر گاڑ کے کیا دیکھتی ہو
اِن خلاؤں میں بجز حسنِ نظر کچھ بھی نہیں
اپنی دنیا کا خداوند تو ہے سکۂ زر
اپنی دنیا میں بجز سکۂ زر کچھ بھی نہیں

یہ جہاں ایک دکاں ہے کہ جہاں صبح و مسا
آدمی بکتے ہیں نیلام کی چیزوں کی طرح
شب کی تاریکی ہو یا دن کا اُجالا ہر وقت
راحتیں بٹتی ہیں محلوں میں کنیزوں کی طرح

وال اسٹریٹ(۱) سے تا 'ارضِ خدائے کونین'
آدمی آدمی کو کھائے چلا جاتا ہے
اِک طرف خوں ہے کہ بہتا ہے پسینہ ہو کر
اِک طرف چہروں پہ رنگ آئے چلا جاتا ہے

آج گر میرا پسینہ، مرے خوں کی سرخی
کسی رخسار، کسی لب کے کسی کام آئی
کیا نیا جرم ہوا، کون سی تقصیر ہوئی
زندگی آج تلک اپنے کسی کام آئی؟

(۱) نیویارک کی ایک سڑک جہاں امریکہ کے بڑے تجارتی مراکز ہیں

O

دلوں کا درد نگاہوں سے پھوٹ پڑتا ہے
ہزار ضبط کریں اشک ٹوٹ پڑتا ہے

وحشتِ بام ودر

جب بھی گھر کا خیال آتا ہے
قبرستان کی ویرانی سی
قلب و نظر پر چھا جاتی ہے
گرد و پیش کے ہنگاموں کو
روح کی وحشت کھا جاتی ہے
ایک بھیانک سی خاموشی
ہر اِک راہ پر چھا جاتی ہے
سینے میں دم گھٹ جاتا ہے
جب بھی گھر کا خیال آتا ہے

دو آنکھیں دو ویراں آنکھیں
دور خلاء میں تکتی ہوں گی
روتے ہوئے بچوں کی چیخیں
سارے گھر میں بھٹکتی ہوں گی
میری آس میں چلتی سانسیں
خشک گلے میں اٹکتی ہوں گی
دل پر پتھر برساتا ہے
جب بھی گھر کا خیال آتا ہے
جس جانب بھی نظر کرتا ہوں
کوئی مجھ پر ہنس پڑتا ہے
چاکِ جیب و تہی دامن پر
ایک اِک منظر ہنس پڑتا ہے
میری ہر اِک جہدِ بقا پر
قبر کا پتھر ہنس پڑتا ہے
آنکھ میں خون اُتر آتا ہے
جب بھی گھر کا خیال آتا ہے

کھلونے

حسیں دکانوں کے شیش زنداں میں بند
حسرت بھری نگاہوں سے ایک اِک راہرو کو تکتے ہوئے کھلونو
میں جب بھی اِس راستے سے گزرا
تمہارے ہونٹوں کی بولتی خامشی نے اکثر
ہمک کے آواز دی ہے مجھ کو
تمہاری ٹھٹکی ہوئی نگاہیں
مچل کے لپکی ہیں میری جانب
تمہارے ننھے سے دست و بازو
مجھے بلاتے رہے ہیں اکثر
مگر مرے ہونٹ چپ رہے

میرے ہاتھ اُٹھ اُٹھ کے رہ گئے ہیں
نگاہیں تم پر پڑیں مگر۔۔۔۔دوسرے ہی لمحے
اُداس لوٹ آئیں اپنے تاریک محبسوں میں

میں تم سے کہتا بھی کیا رفیقو!
کہ میں تو خود بھی ہوں اِک کھلونا
جو بیچنے کے لیے سجایا گیا ہے دوکانِ شیشہ گر میں
تمہاری ہی طرح میں بھی صدیوں سے ہوں گرفتِ نظامِ زر میں

O

کسی کی یاد نے چھیڑے ہیں جب بھی روح کے تار
ٹھہر گئی مری دنیا میں وقت کی رفتار

تمام رات مسلسل پڑی ہے اوس مگر
سحر ہوئی تو فروزاں تھی آتشِ گلزار

چل خسرو گھر اپنے۔۔۔

تھک چکے پاؤں بس اب اے دلِ ناداں چل بھی

چل کہ اب رات کا نشہ بھی ہے مائل بہ خمار
قمقمے اونگھ رہے ہیں کہ بہت جاگ چکے
کچھ ستارے ہیں تو اُن کی بھی ہیں پلکیں بوجھل
وہ بھی تیرے لیے نیند اپنی بہت تیاگ چکے

چاند، پہرے کے سپاہی کی طرح اِستادہ
سوچ میں ہے کہ جو تو، جائے تو وہ بھی چل دے
رہگزر ایک طوائف کی طرح واماندہ
ایسے لیٹی ہے کہ کون آئے گا اب رات گئے

ایک اِک ذرے کی آنکھوں میں ہے نیند آئی ہوئی
تو بھی گھر چل کے ذرا دیر، مرے دل، سو لے
کوئی ایسا نہیں اِس وقت جو تیری خاطر
چند لمحوں کے لیے ہی سہی، آنکھیں کھولے

اتنا خاموش ہے ماحول کہ چلتے ہوئے اب
اپنی آوازِ کفِ پا بھی گذرتی ہے گراں
تیری دھڑکن مری سانسوں کی ضمانت ہی سہی
تیری چپ چاپ سی دھڑکن بھی ہے وحشت ساماں

کب تک اِس قبر کی وادی میں پھرے گا پاگل
یوں کبھی مل بھی سکی ہے غمِ دوراں سے نجات
چل کہ جن چہروں سے بڑھ جاتی ہے تیری وحشت
وہی چہرے ہیں مرے دل، ترا عنوانِ حیات

اور تجھے جینا ہے اے کشتۂ دوراں، کل بھی

مژدۂ نو

(اپنی ننھی بیٹی آسماں کی وفات پر)

لو یہ اِک مژدۂ نو بھی سن لو
میرے زنداں کے نئے دربانو
میرے محبوب سیاست دانو
لو یہ اِک مژدۂ نو بھی سن لو
آج اِک اور ستارہ ٹوٹا
زندگی کا کوئی پھوڑا پھوٹا
ایک انسان سے پیچھا چھوٹا

(۱۹۵۲ء)

جاوداں

(جاوداں میر۔۔۔اپنی بیٹی کے نام)

یہ میری بیٹی، یہ زندگی کے حسین خوابوں کی ایک منزل
مری محبت بھری رفاقت کا، میرے عہدِ وفا کا حاصل
یہ ننھی سی شمع جس کی لو میں مرا لہو سانس لے رہا ہے
مری نگاہ و خرد کو رازِ بقاء کا عرفان دے رہا ہے
میں سوچتا ہوں کہ فرد کی زندگی بھی کتنی جماعتی ہے
اِک آدمی کی جسد میں اِک کائنات خاموش سو رہی ہے
کلی کی ننھی سی گود میں محوِ خواب ہیں گلستاں ہزاروں
زمیں کے ایک ایک ذرے میں سانس لے رہے ہیں جہاں ہزاروں
نہایتِ قطرہ، ابر باراں، مآلِ خورشید، کہکشاں ہے
قدم قدم پر ہے موت لیکن حیات کا کارواں، رواں ہے

O

عروسِ گیتی کے رُخ پہ بادِ سموم نے لاکھ دھول اُڑائی
سحر نے اُٹھ کر دھلا دیا منہ، تو شام گیسو سنوار آئی
ہزار طوفاں اُمڈ کے لپکے، بپھر بپھر کر اُٹھے بگولے
کسی میں جرأت ہوئی نہ اتنی، اچھل کے شمس و قمر کو چھو لے

ہزار بجلی نے دانت پیسے، گرج گرج کر گھٹائیں چھائیں
شعاعیں قوسِ قزح کی مالا فضا کی گردن میں ڈال آئیں
خزاں بدل لے ہزار پہلو، بہار زد میں نہ آ سکے گی
حیات کی رنگ رنگ وادی پہ موت چھائی نہ چھا سکے گی

O

میں اپنی بچّی کو دیکھتا ہوں تو آپ ہی آپ دل کے اندر
کچھ ایسی ہوتی ہے گدگدی سی کہ جاگ اُٹھیں قہقہے لبوں پر
میں لاکھ خود کو سنبھالتا ہوں، بہک ہی جاتے ہیں میرے پاؤں
کوئی مسلسل یہ چاہتا ہے کہ خوب ناچوں، اُدھم مچاؤں
چٹکنے لگتی ہیں خوں میں کلیاں، بہکنے لگتی ہے دل کی دھڑکن
شعور کی سرحدوں کو یک لخت پھاند آتا ہے میرا بچپن
جبیں کی شکنوں کا یہ تقاضا، وقارِ عمر رواں سنبھالوں
ہمکتے دل کی یہ ضد کہ فکر و نظر کی ہر شمع کو بجھا دوں

O

یہ ننھی سی شمع جس کی لو میں ابھی کوئی روشنی نہیں ہے
نظر کا حسنِ فریب دیکھو، ابھی سے میری نظر کہیں ہے

میں اِس کے چہرے میں اپنے خوابوں کا حسنِ تعبیر دیکھتا ہوں
میں اپنے فردا کے آنکھ اوجھل اُفق کی تنویر دیکھتا ہوں
میں دیکھتا ہوں کہ میں تناسخ کے اِک عمل سے گذر رہا ہوں
میں اپنے انجام تک پہنچ کر پھر اپنا آغاز کر رہا ہوں
مری شریکِ حیات اور میں، جو دو تھے اب ایک ہو گئے ہیں
ہمارے عہدِ وفا کے لمحات آج سب ایک ہو گئے ہیں
نئے خدوخال سے ہمارے جسد کی تشکیل ہو رہی ہے
ادھورا پن ختم ہو رہا ہے، ہماری تکمیل ہو رہی ہے

(۱۹۵۳ء)

غمِ فردا

(اپنے ننھے سے بیٹے 'روشن خیال' کے نام)

اُداس بیٹھی ہو کس لیے تم
سنو، ذرا اِس طرف تو دیکھو
تمہارا ننھا سا بچہ تم کو
اُداس سا دیکھ کر تمہیں کن عجیب نظروں سے تک رہا ہے
تمہارے پیہم سکوت پر اُس کا ننھا سا دل دھڑک رہا ہے
کوئی تبسم! کوئی تکلم!!

سنو یہ حالاتِ زندگانی
سدا تو یوں ہی نہیں رہیں گے
کہ لوگ کب تک ستم سہیں گے
یہ ٹھیک ہے اپنے دیس میں آج زندگی، زندگی نہیں ہے
مگر کوئی ایک دل بھی ایسا ہے جس میں برگشتگی نہیں ہے
یہی ہے اثباتِ زندگانی

زمانہ جوں جوں گزر رہا ہے
ہر ایک زنجیر کٹ رہی ہے
بساطِ عالم اُلٹ رہی ہے
یہ بات ممکن ہے اپنی آنکھیں نہ دیکھ پائیں وہ صبحِ فردا
مگر یہ ننھا سا بچہ جس نے ابھی ابھی پاؤں چلنا سیکھا
تمہارے چہرے سے ڈر رہا ہے

o

یہ تو طے ہے کہ جیے جائیں گے ہر حال میں ہم
اُن کے لب پر رسن و دار کی باتیں ہی سہی

معراج کے نام

روبینہ (فروزاں علی) کی سالگرہ کا تحفہ ملنے پر

رونہیں میری زندگی ۔۔۔ مری جاں
میں نے سچ مچ نہ جانے کیوں اِک دم
تیری خوشیوں کا لطف چھین لیا
تو ہنسے جا رہی تھی اور میں نے
اُس ہنسی کا گلا دبوچ دیا

جانے کیوں، میری دوست، بعض اوقات
چھایا رہتا ہے مجھ پہ پاگل پن
مستقل جبر و ضبط کے باوصف
ٹوٹ جاتا ہے دل کا ہر بندھن

سوچتا ہوں تو سینکڑوں ہی خیال
ذہن میں رقص کرنے لگتے ہیں
سینکڑوں حادثوں کے نشترِ غم
دل میں اِک ساتھ اُترنے لگتے ہیں

ساری دنیا، تمام پست و بلند
میری نظروں میں گھوم جاتے ہیں
ساری دنیا کے دل بہ چشمِ نم
اپنے دُکھڑے مجھے سناتے ہیں

کوئی بڑھیا مرے قریب آ کر
سر پہ رکھتی ہے اتنے پیار سے ہاتھ
جیسے میں ہی ہوں اُس کا لختِ جگر
اُس کو میری تلاش تھی دن رات

پھر وہ بڑھیا پلک جھپکتے ہی
دھار لیتی ہے اِک دلھن کا روپ
جو کبھی چاندنی سی لگتی ہے
اور کبھی شام کی اُترتی دھوپ

پھر یکایک اُسی دلھن کا جمال
پالنے میں ہمکنے لگتا ہے

میری روبینہ کی طرح اِک دم
زندگی سے اُلجھنے لگتا ہے

زندگی کیا ہے، دودھ کی بوتل
زندگی کیا ہے، ایک نانِ جویں
ایک آسودہ حال ماں کی گود
ایک دلہن کی جگمگاتی جبیں

میری روبینہ، یہ مری گڑیا
جانے اُس کو دکھائے کیا تقدیر
اُس کے حق میں بنے گا 'یہ زیور'
کوئی پازیب یا کوئی زنجیر

تم کو بھی کیا دیا مقدر نے؟
ایک چھوٹا سا جھونپڑا --- بچے
ایک شوہر --- غریب اور شاعر
تم نے دیکھے تھے خواب کیا 'سچے'

اقبالؔ اور میں

فکرِ اقبالؔ کی تاثیر کہوں
یا اِسے اپنی حقیقت سمجھوں
جب بھی پڑھتا ہوں کلامِ اقبالؔ
ایسا لگتا ہے میں کچھ اور ہی ہوں

میں کہ انسان ہوں، اِک خاک نشیں
دونوں عالم ہیں مگر مجھ میں مکیں
پیکرِ خاک سہی، میرا وجود
میری فطرت نہیں پابندِ زمیں
میری دنیا، یہی دنیا ہے مگر
میری دنیا، اِسی دنیا میں نہیں
میری آنکھیں ہیں مرے شمس و قمر
کہکشاں ہے مری تحریرِ حسیں

میرے سائے میں ہے سمٹی ہوئی شام
مطلعِ صبح --- مرا نورِ جبیں
میری بانہوں میں ہیں انسان تمام
میرا سینہ ہے ہر اِک غم کا امیں
میرا برزخ، میری دوزخ، میری خلد
میرے خونِ رگِ جاں میں ہے کہیں
وقت کیا ہے، مرا اندازِ خرام
زندگی کیا ہے، مرا حسنِ یقیں
کرۂ ارض مرا نقشِ قدم
بزمِ آفاق مرے زیرِ نگیں
میری گردِ رہِ منزل، افلاک
میرے زیرِ کفِ پا، عرشِ بریں

اپنی تخئیل میں آباد ہوں میں
اپنے خلاق کا ہمزاد ہوں میں

آدمی کی کہانی

یہ آدمی کہ کہانی بھی ہے عجیب و غریب

میں سوچتا ہوں کہ جب آدمی نے ڈرتے ہوئے
رہِ حیات میں پہلا قدم رکھا ہو گا
تو اِس خرابہء آباد میں تنِ تنہا
جدھر نگاہ اُٹھی آپ چل پڑا ہو گا
کبھی بلند چٹانوں کے درمیاں خود کو
بہت حقیر سی مخلوق دیکھتا ہو گا
کبھی زمیں، کبھی خورشید پر نظر ہو گی
کبھی خود اپنے ہی سائے سے ڈر گیا ہو گا
کبھی خود اپنی نگاہوں سے چھپ کے غاروں میں
ہزار خوف لیے دل میں جاگتا ہو گا
کبھی وسیع سمندر کو دیکھ کر چپ چاپ
خود اپنے جسم کے اندر سمٹ گیا ہو گا

O

اور آج بھی ہے وہی آدمی مگر یہ زمیں
رہِ حیات میں ہے ایک منزلِ گزراں
ہیں سب ثوابت و سیّار اُس کی گردِ سفر
تمام وسعتِ آفاق اُس کی حدِ مکاں
جو آئینے کی طرح حیرتی رہا کل تک
اب اُس کو دیکھ کے ہے کائنات خود حیراں
عجب خمیر ہے اُس کا کہ جتنا غور کریں
دکھائی دیتے ہیں اُس میں ہزارہا امکاں
ہر ایک منزلِ نایافت اُس کی زد میں ہے
یہ مشتِ خاک، کہاں سے پہنچ گئی ہے کہاں
یہ اور بات کہ اِس اوج پر پہنچ کر بھی
وہ آدمی ہے اِک انجانے خوف سے لرزاں
سکون کل تھا میسر نہ آج ہی ہے نصیب
یہ آدمی کی کہانی بھی ہے عجیب وغریب

ترغیب

کل شب عجیب ادا سے تھا اِک حسن مہرباں

وہ شبنمی گلاب سی رنگت دُھلی دُھلی
شانوں پہ کھیلتی ہوئی زلفیں کھلی کھلی
ہر خطِ جسم، پیرہنِ چست سے عیاں
ٹھہرے بھی گر نگاہ تو ٹھہرے کہاں کہاں
ہر زاویے میں حسن کا اِک تازہ بانکپن
ہر دائرے میں کھلتے ہوئے پھول کی پھبن
آنکھوں میں ڈولتے ہوئے نشّے کی کیفیت
روئے حسیں پہ ایک شکستہ سی تمکنت
ہونٹوں پہ اَن کہی سی تمنا کی لرزشیں
بانہوں میں لمحہ لمحہ سمٹنے کی کاوشیں

سینے کے جزرومد میں سمندر سا اضطراب
اُمڈا ہوا سا جذبۂ بیدار کا عذاب
خوشبو طوافِ قامتِ زیبا کیے ہوئے
شیشے سا جسم عزمِ زلیخا لیے ہوئے

پھر یوں ہوا کہ چھڑ گئی یوسف کی داستاں
پھر میں تھا اور پاکیء دامن کا امتحاں
اِک سانپ ہ بھی تھا آدم وحوا کے درمیاں

ہ انجیل کی روایت ہے کہ شیطان نے سانپ کی شکل میں آدم وحوا کو ورغلایا تھا (شاعر)

O

کٹ ہی جائے گی زیرِ سایۂ زلف
اور تھوڑی سی رات باقی ہے

تین روپ

(ا)

سانجھ سمئے سی سانوری صورت، بال گھٹا گھنگور
نین دھلے آئینے جن سے جھانکے من کا چور
چال شرابی، لب عنّابی، چاندی ایسے دانت
بات کرے تو پھول کھلیں اور ہنسے تو جاگے بھور
ٹخنے ٹخنے پانی میں جیوں دھان جھکورے کھائے
دھرتی پر جب چلے تو لاگے ناچے کوئی مور

چھم چھم کرتی برکھا آئے، اَنگ اَنگ نہلائے
پَون بدن کو چومے پل پل، چھن چھن واری جائے
جیسے ’نذرل‘ کا کوئی نغمہ ’زین‘ کا کوئی شہکار
جیسے کسی مانجھی کا سپنا مورت میں ڈھل جائے

(۲)

گیہوں جیسا رنگ سنہرا، گھنے گھنے گیسو
پیراہن میں رچی بسی سی تن من کی خوشبو
قامت جیسے ہری بھری سی کوئی لچکتی ڈال
ہونٹ رسیلے، نین نشیلے، چال رمِ آہو
چلے تو چاروں اور ہزاروں آئینے چمکیں
ٹھہرے تو اِک خنک اُجالا چھا جائے ہر سو

راوی اور چناب میں دُھل کر رنگ نکھرتا جائے
کھیتوں کھلیانوں میں تپ کر روپ سنورتا جائے
دیکھو تو اِک نار ہے لیکن سوچو تو جانو
'وارث شاہ' کی 'ہیر' سناتا وقت گزرتا جائے

(۳)

چاندی ایسا رنگ روپہلا، گھونگھریالے بال
آبِ رواں کی طرح سبک اور نرم نشیلی چال
آنکھیں جیسے مدھ کے پیالے، کھلتی کلی سے ہونٹ
چہرے کے ہر خط سے نمایاں، دل کا چھپا احوال
پیروں اور وڈیروں کی ٹھوکر میں عمر بِتائے
پھٹے ہوئے دامن میں سمیٹے جیون کا جنجال

سندھو کی موجوں کی طرح جیون سنگیت سنائے
طوفانوں کی زد میں رہ کر من کا دیپ جلائے
جیسے آدھی رات گئے کوئی 'اکتارہ' چھیڑے
جیسے کوئی 'شاہ لطیف' کی 'کافی' گاتا جائے

یارِ کج ادا

کیوں مجھ سے بدگماں ہو اے میرے یار صوفی
رہتے ہو اِس طرح کیوں بیگانہ وار صوفی

تم کو تو میں نے ہر دم دل سے قریب جانا
اپنا رفیق سمجھا، اپنا حبیب جانا
اپنی طرح تمہیں بھی گھائل غریب جانا
اِس ملک کا تمہیں بھی ایسا ادیب جانا
میری طرح ہے جس کا دل داغ دار صوفی

تم کیا ہو، کون ہو تم، اس سے غرض نہیں ہے
مجھ رہ نشیں کی دنیا تو اور ہی کہیں ہے
میری نگاہ میں تو اِک شاعر حسیں ہے
جس کا جہاں الگ ہے، جس کی الگ زمیں ہے
جو اپنی مملکت کا ہے شہر یار صوفی

یہ کشمکش کی دنیا، سود و زیاں کی دنیا
عقل و جنوں کی مظہر، وہم و گماں کی دنیا
یہ مہربان صورت، نا مہرباں کی دنیا
اے کاش جانتے تم مجھ خستہ جاں کی دنیا
رہتا ہوں کس لیے میں یوں سوگوار صوفی

دنیائے دوں میں ہر سو پست و بلند بھی ہیں
خوار و زبوں بھی کچھ ہیں، کچھ ارجمند بھی ہیں
کچھ ایسے لوگ ہیں جو ایذا پسند بھی ہیں
لیکن ہزارہا ہیں جو درد مند بھی ہیں
اور ہم سے بھی ہیں کتنے سینہ فگار صوفی

کیا جانے کس بنا پر تم نے کیا کنارا
میرا سلام بھی اب تم کو نہیں گوارا
اُٹھتی نہیں نگاہیں میری طرف دوبارا
اتنا حقیر بھی تو سمجھو نہیں خدارا
میں بھی اِک آدمی ہوں، ہر چند خوار صوفی

روٹی کی بات کیا ہے، ملتی بھی ہے نہیں بھی
انساں گزار لیتا ہے زندگی کہیں بھی
دوزخ بھی ہے یہ دنیا اور جنتِ حسیں بھی
لیکن یہ بات، تم تھے اِک یار دلنشیں بھی
اور آج تم ہو 'افسر'، میں 'اہلکار' صوفی○

○ایک دوست کا فرضی نام

جون ۱۹۵۱ء سے فروری ۱۹۶۳ء تک میں ریڈیو پاکستان کراچی اور حیدر آباد میں بحیثیت 'اسٹاف آرٹسٹ' کام کرتا رہا۔ ملازمت کے دوران بعض ناخوشگوار دن ایسے بھی آجاتے ہیں کہ دو اچھے دوستوں میں تھوڑا سا فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ نظم حیدر آباد کے ایک کچھ ایسے ہی دنوں کی یادگار ہے۔ (شاعر)

O

وہ گل کسی بہار کا احسان کیوں اُٹھائے
جس کو ملی ہو زخمِ جگر کی شگفتگی

مرا ہر غم نہ کرنا اُس سے منسوب
زمانے میں ہزاروں مہرباں ہیں

O

تنہائی میں قریبِ رگِ جاں ترا خیال
وحشت میں ہے سکون کا عنواں ترا خیال

خاموشیوں میں دل کی ہے دھڑکن تری صدا
تاریکیوں میں سروِ چراغاں ترا خیال

غربت میں ہم سفر، ترا سایہ قدم قدم
مایوسیوں میں آس کا امکاں ترا خیال

شہرِ خرد میں تیرا تصور اِرم اِرم
دشتِ جنوں میں خوابِ گلستاں ترا خیال

پَرتو سے تیرے دھوپ میں بھی چاندنی کا رنگ
پت جھڑ کی رُت میں صبحِ بہاراں ترا خیال

جس طرح لفظ میں ہیں معانی چھپے ہوئے
یوں ہے مرے خیال میں پنہاں ترا خیال

عرفانِ حسن مجھ کو ہوا، تجھ کو دیکھ کر
کیا راز کر گیا ہے نمایاں ترا خیال

فکرِ رسا و دیدۂ بینا پہ کر گیا
اسرارِ مشتِ خاک، نمایاں ترا خیال

O

سامنے رشکِ قمر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں
کوئی محبوبِ نظر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں

چاند کی طرح ستاروں میں جوانی گزرے
کہکشاں راہگزر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں

عارض و لب کے چمن زار ہوں پہلو میں کھلے
ایسی ہر شب کی سحر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں

گل کی آغوش میں سوئی ہوئی خوشبو کی طرح
زندگی اپنی بسر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں

O

اُن کی جو راہ تھی وہ اُسی پر چلا کیے
ناداں تھے ہم، چلے جو انہیں رہنما کیے

گل چین وگل فروش کی سازش سے بے خبر
ہم اہتمامِ فصلِ بہاراں، کیا کیے

اب زحمتِ مزید اُٹھانے سے فائدہ
معلوم ہے جو آپ نے وعدے وفا کیے

اِک آفتابِ تازہ کے سوزِ فراق میں
کتنے ستارے بجھ گئے، کتنے جلا کیے

وارفتگیء شوق بچا لے گئی ہمیں
ہر چند راستوں میں تماشے ہوا کیے

O

آج اے دل، لب و رخسار کی باتیں ہی سہی
وقت کٹ جائے گا کچھ پیار کی باتیں ہی سہی

یوں تو کٹتی ہی رہے گی غمِ دوراں میں حیات
آج کی رات، غمِ یار کی باتیں ہی سہی

زندہ رہنے کی کبھی تو کوئی صورت نکلے
عالمِ عشرتِ دیدار کی باتیں ہی سہی

اب تو تنہائی کا یہ کرب نہ ہو گا برداشت
کچھ نہیں تو در و دیوار کی باتیں ہی سہی

کوئی تو بات چھڑے آج بہت جی ہے اُداس
حسرتِ کوچۂ دلدار کی باتیں ہی سہی

O

نہ جانے اہلِ نشیمن پہ کیا گھڑی آئی
قفس میں چیخ اُٹھا ہے سکوتِ تنہائی

چمن میں رہ کے مرا حال پوچھنے والو!
قفس میں صرف اندھیرا ہے اور تنہائی

نہ جانے بادِ صبا کہہ گئی مذاق میں کیا
کہ ہنستے ہنستے شگوفوں کی آنکھ بھر آئی

قدم قدم پہ کھلے ہیں ہزار لالہ و گل
جو کام آئی تو اپنی ہی آبلہ پائی

کوئی تو بات تھی، ہم کو ملا جو رتبۂ دار
وگرنہ شہر میں کچھ کم نہیں تھے سودائی

O

اب بتاؤ جائے گی زندگی کہاں یارو
دور تک ہے نظروں میں دشتِ بے اماں یارو

اب نہ کوئی منزل ہے اور نہ رہگزر کوئی
جانے قافلہ بھٹکے، اب کہاں کہاں یارو

پھول ہیں کہ لاشیں ہیں، باغ ہے کہ مقتل ہے
شاخ شاخ ہوتا ہے، دار کا گماں، یارو

موت سے گزر کر یہ کیسی زندگی پائی
فکر پا بہ جولاں ہے، گنگ ہے زباں یارو

تربتوں کی شمعیں ہیں اور گہری خاموشی
جا رہے تھے کس جانب، آ گئے کہاں یارو

راہزن کے بارے میں اور کیا کہوں کھل کر
میرِ کارواں یارو، میرِ کارواں یارو

صرف زندہ رہنے کو زندگی نہیں کہتے
کچھ غمِ محبت ہو کچھ غمِ جہاں یارو

وقت کا تقاضا تو اور بھی ہے کچھ لیکن
کچھ نہیں تو ہو جاؤ، میرے ہم زباں یارو

ایک میں ہوں جس کو تم مانتے نہیں شاعر
اور ایک میں ہی ہوں، تم میں نکتہ داں یارو

O

کیا کیا نہ زندگی کے فسانے رقم ہوئے
لیکن جو حاصلِ غمِ دل تھے وہ کم ہوئے

اے تشنگیٔ درد، کوئی غم، کوئی کرم
مدت گذر گئی ہے اِن آنکھوں کو نم ہوئے

ملنے کو ایک اذنِ تبسم تو مل گیا
کچھ دل ہی جانتا ہے جو دل پر ستم ہوئے

کس کو ہے یہ خبر کہ بہ عنوانِ زندگی
کس حسنِ اہتمام سے مصلوب ہم ہوئے

شاعر تمہیں پہ تنگ نہیں عرصۂ حیات
ہر اہلِ فن پہ دہر میں ایسے کرم ہوئے

O

کیوں ہو گئی اے شمع، تری بزمِ سخن چپ
دل چپ ہے، نظر چپ ہے، قلم چپ ہے، دہن چپ

نعرہ نہ سہی، چیخ سہی، کچھ تو ہو یارو!
بیٹھے ہیں بڑی دیر سے اربابِ وطن چپ

گل چیں ہے کہ گلشن کو کیے جاتا ہے تاراج
اور اہلِ چمن دیکھ رہے ہیں ہمہ تن چپ

جب موت ہی ٹھہری ہے تو اے دل یہ فغاں کیا
للکار کہ کر دیں نہ کہیں دار و رسن چپ

شاؔعر یہ عجب شور ہے، خاموش و پر اَسرار
دل میں تو ہے محشر سا مگر حرفِ سخن چپ

O

ایک سی ہے یوں تو کہہ لینے کو ہر اِک دل کی بات
اہلِ محفل سے الگ ہے، صاحبِ محفل کی بات

دوستو! طوفاں سے گھبرا کر نہ لو ساحل کا نام
لوٹتی موجوں سے پوچھو راحتِ ساحل کی بات

اب تو یہ عالم ہے، ہم ہیں اور ہماری گمرہی
راستے کے پیچ وخم میں کھو گئی، منزل کی بات

کس سے دل کی بات کہیے، جس پہ پڑتی ہے نظر
اُس کا چہرہ بول اُٹھتا ہے، خود اپنے دل کی بات

جب بھی چھڑ جاتے ہیں شاؔعر الفتوں کے تذکرے
یاد آ جاتی ہے اپنے عشقِ لاحاصل کی بات

O

کوئی ہمدم نہیں، مونس نہیں، دم ساز نہیں
اپنا غم کس سے کہوں کوئی بھی ہم راز نہیں

کھو گئی جانے کہاں، دل کے دھڑکنے کی صدا
میری آواز میں شامل تری آواز نہیں

ایسا لگتا ہے، کوئی محوِ سخن ہے مجھ سے
ہمہ تن گوش ہوں لیکن کوئی آواز نہیں

آشیاں اور قفس، ایک ہیں اب اپنے لیے
بال و پر ہوں بھی تو کیا، جرأتِ پرواز نہیں

کھائے جاتا ہے تمہیں کون سا غم اے شاؔعر
اب وہ جینے کا قرینہ نہیں، انداز نہیں

O

دل سے جو ترے غم کے پرستار نہ ہوتے
اِس شان سے رسوا سرِ بازار نہ ہوتے

سینے میں جو دل بن کے دھڑکتا نہ غمِ عشق
ہم اہلِ جنوں آج سرِدار نہ ہوتے

جینا بھی اِک الزام ہے، مرنا بھی اِک الزام
اے کاش ہم اس ملک کے فنکار نہ ہوتے

چلتے نہ اگر ہٹ کے زمانے کی روش سے
اربابِ جہاں، درپئے آزار نہ ہوتے

ہر بت کو خدا کہتے اگر ہم بھی تو یارو
کچھ ہوتے مگر شاعرِ نادار نہ ہوتے

O

زخم کو پھول، حقیقت کو گماں کہتے ہیں
لوگ ہر بات سرِ بزم کہاں کہتے ہیں

شاخِ گل ہے کہ کسی لاش کا سوکھا ہوا ہاتھ
یہ بہاراں ہے تو پھر کس کو خزاں کہتے ہیں

ہے یہ ویرانہ، یہاں پاؤں سنبھل کر رکھنا
کبھی آباد تھا اِک شہر یہاں کہتے ہیں

تم میں اور ہم میں یہی فرق ہے دنیا والو
ہم ہر اِک بات سرِ بزمِ جہاں کہتے ہیں

ظرف کی بات ہے، اِک جام کی خاطر کچھ لوگ
دُزدِ میخانہ کو بھی پیرِ مغاں کہتے ہیں

O

یہ شہرِ رفیقاں ہے، دلِ زار، سنبھل کے
ملتے ہیں یہاں لوگ بہت روپ بدل کے

عارض ہیں کہ مرجھائے ہوئے پھول کنول کے
آنکھیں ہیں کہ جھلسے ہوئے خوابوں کے محل کے

فرہاد سرِدار ہے، شیریں سرِ بازار
بدلے نہیں اب تک مگر انداز غزل کے

آئے ہیں غمِ عشق میں ایسے بھی مقامات
دل خون ہوا، آنکھ سے آنسو بھی نہ ڈھلکے

دنیا بھی اِک آماجگہِ حسن ہے شاعرؔ
دیکھو تو کبھی خلوتِ جاناں سے نکل کے

O

اب تو ہر شورِ طرب سن کر دہل جاتا ہے دل
جانے کس اندیشۂ فردا سے گھبراتا ہے دل

جب بھی ملتے ہیں کہیں دو دل بہت ہی پیار سے
مسکرا اُٹھتی ہیں آنکھیں اور بھر آتا ہے دل

تم اِسے دیوانگی سمجھو کہ نادانی کہو
ٹوٹ کر بھی پھر اُسی پتھر کے گُن گاتا ہے دل

پھر نہ لٹ جائیں کہیں منزل پہ اہلِ کارواں
اُٹھتے جاتے ہیں قدم اور بیٹھتا جاتا ہے دل

شاعرؔ ایسی چوٹ کھائی ہے بہ فیضِ دوستاں
دوستی کے نام ہی سے اب لرز جاتا ہے دل

O

رہنِ غم و آلام کیے جاتا ہے مجھ کو
کیا شغل ترا عشق دیے جاتا ہے مجھ کو

معلوم نہیں کون سی راہوں پہ رواں ہوں
دل جانے کدھر آج لیے جاتا ہے مجھ کو

سناٹے میں رہ رہ کے دھڑک اٹھتا ہے یوں دل
جیسے کوئی آواز دیے جاتا ہے مجھ کو

پہلے تو میں پی جاتا تھا ہر غم کو بہ یک جام
اب غم ہے کہ ہر لمحہ پیے جاتا ہے مجھ کو

کیوں خوف زدہ اتنا ہے مجھ سے کہ زمانہ
سینے میں مرے دفن کیے جاتا ہے مجھ کو

O

اُس سے ملنے کی آس کیا شاعؔر
رہ گیا تیرے پاس کیا شاعؔر

اُس سے اظہار حال کیا کیجے
وہ نہیں غم شناس کیا شاعؔر

غم ہے زندہ تو دل بھی زندہ ہے
غم نہیں ہے تو آس کیا شاعؔر

جلتے بجھتے چراغ کیا معنی
یہ اُمید اور یاس کیا شاعؔر

ہنستے رہتے ہو بے سبب اکثر
عشق آیا ہے راس کیا شاعؔر

O

یوں موت کو حیات کا انعام کر لیا
جو بھی کفن ملا، اُسے احرام کر لیا

دن ڈھل گیا تو ہم نے بہ فیضِ فروغِ مئے
خورشید اِک طلوع سرِ شام کر لیا

آزاد ہو کے اور بھی پابند ہو گئے
ایسے اُڑے کہ خود کو تہہِ دام کر لیا

اُس آہوئے رمیدہ کی وحشت تھی دیدنی
یہ کیا کیا کہ میں نے اُسے رام کر لیا

اب تیرے ذکر ہی سے عبارت ہے زندگی
ہر اِک نفس کو میں نے ترا نام کر لیا

O

مدت سے یونہی شام و سحر جاگ رہے ہیں
کس آس میں یہ شمس و قمر جاگ رہے ہیں

شب ہے کہ ڈھلے جاتی ہے اور ہم تری خاطر
بیٹھے ہیں سرِ راہگذر جاگ رہے ہیں

سینے میں چھپائے ہوئے اِک آتشِ خاموش
ہم کب سے بہ ایں دیدۂ تر جاگ رہے ہیں

اِک شعلۂ مثبت کی طرح سرکش و بے فکر
مقتل میں بھی بے خوف و خطر جاگ رہے ہیں

دنیا کے بدلتے ہوئے حالات ہیں شاہد
دنیا میں ابھی اہلِ نظر جاگ رہے ہیں

O

رات کٹ جائے کسی طرح تو بس
ایک اِک لمحہ ہے ایک ایک برس

روح اور جسم میں ہے جنگ کڑی
ٹوٹ جائے نہ کہیں تارِ نفس

ایسے جینے سے بھلا کیا حاصل
زیست میں رنگ ہی باقی ہے نہ رس

اِک ذرا جرأت پرواز کہ آج
سو گئے تھک کے نگہبانِ قفس

خامشی بول رہی ہو جیسے
دل کی دھڑکن ہے کہ آوازِ جرس

O

اہلِ دل، اہلِ خرد، اہلِ نظر سب سو گئے
سب کو بیداری کا دعویٰ تھا، مگر سب سو گئے

صبح کی خاطر رہے جو رات بھر مشعل بکف
ایسی نیند آئی کہ ہنگامِ سحر، سب سو گئے

اِس کو کیا کہیے کہ احساسِ زیاں کے باوجود
راہ میں کیا راہرو، کیا راہبر سب سو گئے

کارواں خطرے میں ہے، کچھ دیر میں ہی جاگ لوں
کون اِس کا پاسباں ہو گا، اگر، سب سو گئے

اِس سفر میں رہزنوں کا خوف پہلے ہی سے تھا
لاکھ چلّاتا رہا شاؔعر مگر سب سو گئے

O

موت سے اے دل ڈرتے کب ہیں
موت سے پہلے مرتے کب ہیں

موت ہے ہستی کی اِک منزل
ہر منزل پہ ٹھہرتے کب ہیں

اِس دنیا سے گزر کر بھی ہم
اِس دنیا سے گزرتے کب ہیں

اپنی ہوا میں اُڑنے والے
پاؤں زمیں پہ دھرتے کب ہیں

جتنی جلد بکھر جاتے ہیں
اتنی جلد سنورتے کب ہیں

O

بجا کہ اپنی دسترس میں لوح بھی، قلم بھی ہے
مگر جو کھل کے دل کی بات کہہ سکے وہ دم بھی ہے؟

سحر کو میں شکستِ شب سمجھ تو لوں، مگر یہ کیا
جو پھول مسکرا رہے ہیں اُن کی آنکھ، نم بھی ہے

بجا کہ میں نے دیر کو مقامِ کعبہ دے دیا
حرم جسے سمجھ رہے ہیں آپ، وہ حرم بھی ہے؟

وہ جس کی دوستی پہ خندہ زن ہے دل کا زخم زخم
نصیبِ دشمناں کہ آج وہ شریکِ غم بھی ہے

وطن میں میرؔ کی طرح اگر ہیں خوار ہم تو کیا
ادب میں میرؔ سے زیادہ کوئی محترم بھی ہے؟

O

میں جو کچھ سوچتا ہوں اب، تمہیں بھی سوچنا ہو گا
جو ہو گا زندگی کا ڈھب، تمہیں بھی سوچنا ہو گا

ابھی تو آنکھ اُوجھل ہے مگر خورشید کے ہاتھوں
کھنچے گی جب رِدائے شب، تمہیں بھی سوچنا ہو گا

مقدر میں تمہارے کیوں نہیں لکھا، بجز میرے
صلیب و دار کا منصب، تمہیں بھی سوچنا ہو گا

یہ کیسا قافلہ ہے جس میں سارے لوگ تنہا ہیں
یہ کس برزخ میں ہیں ہم سب، تمہیں بھی سوچنا ہو گا

خدا اور آدمی دونوں اگر عینِ حقیقت ہیں
حقیقت میں ہے کیا مذہب تمہیں بھی سوچنا ہو گا

حقیقتیں تو ہزاروں ہیں تشنۂ اظہار
مگر وہ ایک حقیقت جو میرے لب پر ہے
جو اشک اشک کہیں ہے تو زخم زخم کہیں
وطن کے قرض کی صورت مرے ادب پر ہے

شہکار

○(چند منٹ عابد روڈ پر)

ازل کے مصور کے شہکار ہیں یہ

یہ مدقوق و مفلوج و معذور انساں
یہ مظلوم و محکوم و مجبور انساں

یہ پروردۂ بطنِ جاگیرداری
گرفتارِ حالات، ننگے بھکاری

یہ رام اور سیتا کا دم بھرنے والے
محمدؐ کی اُمت، خدیجہؓ کے بالے

خداؤں کے پرماتماؤں کے مارے
دکاں دارِ دیں، پارساؤں کے مارے

یتیمانِ علم و ہنر، راہزادے
تہی دست، کاسہ بکف شاہزادے

نہ ماں اِن کی کوئی، نہ باپ اِن کا کوئی
نہ نردوش ہیں یہ، نہ پاپ اِن کا کوئی

مقدر کی ہر آن جپتے ہیں مالا
اندھیرے کو سمجھے ہوئے ہیں اُجالا

برہنہ ہیں، بھوکے ہیں، لاچار ہیں یہ
ازل کے مصور کے شہکار ہیں یہ

○ حیدرآباد دکن کی ایک مشہور سڑک

ملامت

(مہاتما گاندھی کی برسی پر)

وہ شمع جو پروانوں کے لیے محفل میں جلی
اُس شمع کو پروانوں نے خود ہی پھونک دیا
وہ آگ جو شعلۂ خوں بن کے ہر دل میں جلی
وہ آگ وہ شعلۂ خوں آخر اشکوں میں ڈھلا

اب بیٹھ کے سب روتے ہیں اور سر دُھنتے ہیں
مٹّی میں ملے اشکوں کے موتی چنتے ہیں

مہاتما گاندھی کو ناتھورام گوڈسے، نے ۳۱ جنوری ۱۹۴۸ء کو گولی ماردی تھی (شاعر)

ایک منظر

(تخیّل۔حقیقت اور ایک روایتی شاعر)

چودھویں کا چاند ہے یا حسنِ کافر بے نقاب
خاک کے ذرّے ہیں یا انوار کے روشن حباب
چاندنی چھٹکی ہے یا گردوں سے گرتی ہے شراب
تنکے تنکے پر جوانی ذرّے ذرّے پر شباب

ہائے کیا پرکیف منظر ہے یہ، کیا پرنور رات
ڈھل رہی ہے حسن کے سانچے میں جیسے کائنات
اے غمِ دل دور ہو، جاگی تمنائے حیات
ہو گئے پھر سے حسیں میری نظر میں شش جہات

کون کہتا ہے کہ یہ دنیا ہے اِک دارالمحن
آدمی پہنے ہوئے ہے زندگی ہی میں کفن
مفلسوں کے بِک رہے ہیں کوڑی کوڑی میں بدن
من کی دنیا مر چکی ہے، آج کل زندہ ہے دھن

کر رہا ہے کارِ عزرائیل بھی انسان ہی
خندہ زن ہے موت ہرسو، رو رہی ہے زندگی

O

اُف! مگر یہ کس طرف سے چیخ کی آئی صدا
دل دہل کر رہ گیا، سارا بدن تھرّا اٹھا
میری آنکھوں میں اندھیرا کیوں ہے؟ آخر کیا ہوا؟
عیش و عشرت کی گھڑی میں کس کا گھر لوٹا گیا

پیچ و خم کھاتا ہوا یہ سیلِ خوں کیسے یہاں
تازہ تازہ گرم گرم، اُف! اے خدا جاؤں کہاں!

چارسُو ہے خون ہی خوں، کربلا کا سا سماں
چھوٹ جا اے نبضِ ہستی، ٹوٹ پڑ اے آسماں

کتنی لاشیں، کتنے انساں خون سے رنگیں بدن
بے کفن، بے گور، سیلِ خون میں ہیں غوطہ زن
زندگی کو زندگی کہتا تھا ہر دم میرا من
شہر کی گلیوں ہی میں تو موت ہے جلوہ فگن

زندگی ہر موڑ پر انسانیت کو کھو چکی
آدمیت، شیطنت کے غار میں گم ہو چکی

O

پیچ وخم کھاتے ہوئے اِس سیل خوں کو کیا کہوں؟
شاعرِ رنگیں نوا ہوں، کون سی تشبیہ دوں؟
عارض گلگوں کہ چشمِ یار کے ڈورے کہوں؟
عہدِ رفتہ کا ہوں شاعر، شاعری ہی چھوڑ دوں

عہدِ نو میں بوالہوس شاعر کی چل سکتی نہیں
زندگی نازک مزاجوں سے بدل سکتی نہیں
آفتیں ہیں جو سروں پر، ایسے ٹل سکتی نہیں
دھیمی دھیمی آنچ سے زنجیر گل سکتی نہیں

ایک نعرہ، ایک شعلہ، ایک ضربِ مؤسوی
شاعری کہیے جسے، ’جزویست از پیغمبری‘

(مطبوعہ، شاہد ہفتہ وار، بمبئی۔۱۳ اپریل ۱۹۴۹ء)

فسادات کی ایک رات

یہ بھیانک تیرگی، پُرہول رات
سہمی سہمی سی ستاروں کی برات
دم بخود، خاموش، ساری کائنات

راستے ملبوں سے پُر، سنسان، چپ
شہر جیسے کوئی قبرستان، چپ
تک رہا ہے آسماں حیران، چپ

یہ ہوا ہے یا کسی کی سسکیاں
کس پہ کیا بیتی کسی کو کیا گماں
تیرگی میں گم ہے آہوں کا دھواں

کس کو ہو گی آج خود اپنی خبر
کوئی رہرو ہے نہ کوئی راہبر
بہکی بہکی سی ہر اِک فکر و نظر

سوچتا ہوں، سوچ پر قابو نہیں
رو رہا ہوں، آنکھ میں آنسو نہیں
زندگی ہے، زیست کی خوشبو نہیں

سہمی سہمی، رینگتے چلتی ہواؤ
ڈھونڈھتی ہو کس کو تم، کچھ تو بتاؤ
کچھ نہیں ہے اب یہاں پر، لوٹ جاؤ

تم کو ہے جس خوابِ فردا کی تلاش
ایسا ہر اِک خواب ہے اب پاش پاش
وہ پڑی ہے اُس کی جھلسی جھلسی لاش

(۱۹۴۹ء)

تلنگانہ

(آندھرا پردیش)

یہ سرخ دھرتی جو آج تپ تپ کے سرخ انگارہ بن گئی ہے
اِسی سے پھوٹے ہیں وہ شرارے جو خرمنِ زر جلا رہے ہیں
ہزار 'بادل' گرج رہے ہیں ہزار 'بجلی' کڑک رہی ہے
ہزار 'طوفان' اُٹھ رہے ہیں مگر یہ بڑھتے ہی جا رہے ہیں

نہ فکرِ امروز ہے انہیں اور نہ یادِ ماضی ستا رہی ہے
نظر میں مستقبلِ درخشاں کی ضو ہے جو رہ دکھا رہی ہے

یہ نظم ہفتہ وار 'شاہد' بمبئی میں یکم مئی ۱۹۴۹ء کو 'نردوش' ۔۔۔ میرے قلمی نام سے شائع ہوئی تھی (شاعر)

ایشیاء

آخرش جاگ اُٹھا وقت کا خوابیدہ شعور
شب کے پروردہ اندھیروں کا فسوں ٹوٹ گیا
اِک کرن پھوٹ کے چمکا گئی مشرق کا نصیب
دستِ اوہام سے ہر دامنِ دل چھوٹ گیا

کل تلک سرد تھی جن ذروں کے احساس کی آگ
آج تپ تپ کے وہ خورشید ہوئے جاتے ہیں
جن کو روندا گیا صدیوں وہی مجبور عوام
انقلابات کی تمہید ہوئے جاتے ہیں

لاکھ پھینکے شبِ تاریک سویرے پہ کمند
کارواں صبح کا بڑھتا ہی چلا جائے گا
اپنے ہمراہ لیے سینکڑوں کرنوں کا جلوس
وسعتِ عالمِ آفاق پہ چھا جائے گا

اشاعت اول بعنوان 'بیداری' ہفتہ وار 'شاہد' بمبئی۔ ۲۲ مئی، ۱۹۴۹ء

کوجے

(شمالی کوریا کے پاس ایک جزیرہ)

سنو یہ کس ماں کی چیخ ہے جو حصارِ زنداں سے پھوٹتی ہے
یہ کس بہن کی کراہ ہے جو لبوں تک آ آ کے ٹوٹتی ہے
یہ کس کی دلدوز ہچکیاں ہیں، یہ کس کی سانس آج چھوٹتی ہے

یہ کون بھائی ہے جس کی للکار سے ہر اِک دل دہل رہا ہے
یہ آج کوجے میں کس کی ناموس کا جنازہ نکل رہا ہے

یہ ایشیاء کی حسین بستی ہے یا کہ ڈالر کا کارخانہ
ہماری اپنی زمین ہے یا کہ سامراجی قمارخانہ
ہماری تہذیب کا ہے مامن کہ قحبگی کا نگار خانہ

جو تابِ نظارہ ہو تو دل میں گڑے ہوئے کارتوس دیکھو
سڑک سڑک پر برہنہ ماؤں کا، بیٹیوں کا جلوس دیکھو

جشنِ آزادی

ناچو گاؤ دھوم مچاؤ
آزادی کا جشن مناؤ

مت سوچو اے بھولے لوگو
کیا کچھ بیتی کُنجِ قفس میں
جیون کاٹ رہے ہو اب بھی
اپنے گھر میں یا محبس میں

دل کی بات زبان پر لا کر آزادی پر حرف نہ لاؤ
ناچو گاؤ دھوم مچاؤ

ہم اُس قوم کے لختِ جگر ہیں
جس کا ہمسر کوئی نہیں ہے
ساری دنیا اپنا وطن ہے
اپنا گھر در کوئی نہیں ہے
دنیا مانے یا نا مانے اپنی عظمت کے گن گاؤ
ناچو گاؤ دھوم مچاؤ

بچوں کی ہر بات نہ مانو
بچے ضدّی ہو جاتے ہیں
روتے ہیں تو رو لینے دو
روتے روتے سو جاتے ہیں
راہنماؤں کے گن گا کر بھوکے بچوں کو بہلاؤ
ناچو گاؤ دھوم مچاؤ

گِرد و پیش کی بات نہ چھیڑو
ایسی بات سے جی جلتا ہے

اپنا ملک ہے سب سے نیارا
اپنے ملک میں سب چلتا ہے
اوروں سے کیا لینا تم کو، تم کیوں اوروں کا غم کھاؤ
ناچو گاؤ دھوم مچاؤ

یہ دنیا دو روز کی دنیا
اِس میں اُلجھ کر کیا کر لو گے
راز کے اندر، راز نہاں ہے
سوچ سمجھ کر کیا کر لو گے
اصلی دنیا اور کہیں ہے اُس دنیا کی دُھن اپناؤ
ناچو گاؤ دھوم مچاؤ

اُونچ اور نیچ کی ساری باتیں
عقل کی چالیں، علم کی گھاتیں
سب کچھ ہے تقدیر کے بس میں
کس کے دن اور کس کی راتیں

جس کا بھید وہی جانے ہے تم کیوں اپنا دین گنواؤ
ناچو گاؤ دھوم مچاؤ

بھوک لگے تو روٹی کھا لو
پیاس لگے تو پانی پی لو
اور اگر یہ بھی نہ ملے تو
رب سے آس لگا کر جی لو
خلدِ بریں کے خواب سجا کر اپنی قبروں میں سو جاؤ
ناچو گاؤ دھوم مچاؤ

غم جب حد سے سوا ہوتا ہے
سنتے ہیں کہ دوا ہوتا ہے
درد کو حد سے بڑھ جانے دو
صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے
کل جو ہوگا، کل دیکھیں گے، کل کی بات نہ چھیڑو، آؤ
ناچو گاؤ دھوم مچاؤ

○ یہ نظم 'ابن مریم' کے نام سے ۲۳ مارچ ۱۹۵۸ء کو ہفت روزہ 'لیل و نہار' لاہور میں بھی شائع ہوئی تھی۔

زندگی اور پتھر

(اجنتا جانے کے لیے میرے آبائی شہر اورنگ آباد سے ہو کر جانا پڑتا ہے
جو 'ریاست حیدر آباد دکن' کا دوسرا بڑا شہر تھا)

اجنتا کا نظارہ کرنے والو
اِدھر بھی اِک نگاہِ طائرانہ
صنم خانے یہاں بھی کچھ ملیں گے
ذرا ذوقِ تجسس آزمانا

یہ شاہوں اور راجاؤں کی بستی
گناہوں کی کمیں گاہِ مقدس
محل زادوں کے حق میں خلد ساماں
رعایا کے لیے تاریک محبس

ہزاروں سال سے اِس سر زمیں پر
مرے جمہور کی دنیا ہے ویراں
ہزاروں انقلابات آئے لیکن
شہنشاہی کی جنت ہے گل افشاں

یہی جنت، یہی تاریک محبس
مرے پھولوں کا خاروں کا وطن ہے
سحر دم جن کو کفنایا گیا ہے
یہ اُن خورشید پاروں کا وطن ہے

یہ گرد آلود کچّے راستوں پر
شکستہ جھونپڑے، گرتے ہوئے کھم
کسی بوڑھے کی آنکھوں کی طرح، چپ
کسی بیوہ کے دامن کی طرح، نم

سرِ بازار چلتی پھرتی لاشیں
جہالت، بھوک، بیماری کے بیٹے

گزرتے ہیں رہِ شام و سحر سے
دریدہ دامنِ ہستی سمیٹے

جوانی کی سحر گوں مسکراہٹ
لبوں کی قبر میں سوئی ہوئی ہے
نظر شمس و قمر کی تابناکی
خلاؤں میں کہیں کھوئی ہوئی ہے

یہ انساں، ہند کے آزاد انساں
جھکے شانے، فسردہ رُخ، نظر چپ
سنائیں کس کو آہوں کا فسانہ
خدا چپ، ناخدا چپ، بحر و بر چپ

اجنتا کا نظارہ کرنے والو
اجنتا کے بتوں میں کیا رکھا ہے
اجنتا، پتھروں کی زندگانی
یہ بستی زندگی کا بت کدہ ہے

چاندنی سے سویرے تک

روشنی دوست نگاہوں کے سکوں کی خاطر
سالہا سال سے ڈھلتے ہوئے خورشید کا نور
رات کے ماتھے پہ بُنتا رہا زرّیں سا جال
لیکن اب تک نہ ہوئی رات سحر رنگ کبھی
چاندنی پا نہ سکی صبح کا دوشیزہ جمال

روشنی دوست نگاہوں کے سکوں کی خاطر
اب بھی ڈھلتے ہوئے سورج کا سسکتا ہوا نور
رات کے ماتھے پہ پھیلا ہے اُفق تا بہ اُفق
لیکن اس کوششِ ناکام سے حاصل کیا ہے
جس کی بنیاد میں ترتیب نہ وسعت نہ عمق

روشنی دوست نگاہوں کے سکوں کی خاطر
پھیر کر رخ شبِ کشکول بکف سے اپنا
اب سحر دوست کہیں اور نظر رکھتے ہیں
چاندنی گرچہ دیے جاتی ہے ہر گام فریب
اپنی منزل کی یہ ہر گام خبر رکھتے ہیں

کل تلک ڈوبتا سورج تھا چراغِ محفل
آج اُبھرتا ہوا خورشید ہے ان کی منزل
(۱۹۵۰ء)

کہکشاں

ہزاروں برس سے فضائے جہاں پر اندھیرے ہیں اپنا تسلط جمائے
مگر آج تک وہ جیالے ستاروں کی تابندگی چھین لینے نہ پائے

ستاروں کی تابندگی چھین لینے کی خاطر اندھیروں نے سو روپ دھارے
کبھی اُن پہ ابرِ سیہ بن کے چھائے، کبھی اُن کی محفل میں مہتاب اُتارے
کبھی رات کو صبح کا روپ دے کر مسلسل دکھاوے کے سورج اُبھارے
کبھی اُن کے مسکن پہ بجلی گرائی، کبھی اُن پہ برسائے اپنے شرارے

ہزاروں برس سے ستارے اِسی طرح ظلمت کے ظلم و ستم سہتے آئے
مگر آج تک ان اُجالے کے پیغمبروں کے قدم ڈگمگانے نہ پائے
(۱۹۵۰ء)

بھجن

ڈالر دیس کے راجہ او سب راجوں کے رکھوالے
کٹھن گھڑی ہے ہم بھگتوں پر، آ کر ہمیں بچا لے
او سب راجوں کے رکھوالے

آج ہمارے دیس میں ہمری جان کے پڑ گئے لالے
چار طرف سے اُمڈ پڑے ہیں لال پھریرے والے
تیرے بنا اب کون بھلا اِس آئی بلا کو ٹالے
سب کچھ تیرے حوالے
او، سب راجوں کے رکھوالے

بھارت میں ہر گاؤں کی جنتا ہم کو آنکھیں دکھائے
لاکھ جتن کر بیٹھے لیکن پھر بھی منہ کی کھائے
سورُگ کا لالچ، نرکھ کی دھمکی، کچھ بھی کام نہ آئے
لٹتی آن بچا لے
او، سب راجوں کے رکھوالے

(کوریا پر امریکہ کے حملے کے بعد جنوری ۱۹۵۱ء کو بمبئی میں یہ بھجن IPTA (انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن) کے اسٹیج پر پیش کیا گیا تھا۔ یوں کہ ایک پردے پر جنگ کی تباہ کاریاں دکھائی گئی تھیں۔ سامنے ڈالروں کے ڈھیر پر امریکہ کے صدر ٹرومن کی مورتی اپنے کئی ہاتھوں میں جنگی ہتھیار لیے کھڑی کی گئی اور اس کے اطراف بیٹھے امریکہ کے 'پٹھو حکمرانوں' نے اپنے مخصوص لباس پہن کر یہ بھجن گایا۔ اس بھجن کی دھن موسیقار پریم دھون نے بنائی تھی اور اُوشا جی نے اسے پیش کیا تھا)

O

'تاجر' کا دیں ہے ایک، برہمن ہو یا کہ شیخ
لیکن یہ راز سب پہ کہاں منکشف ہوا

نیا عہد نامہ

(ہجرت کے بعد پہلی نظم)

معاف کر دو مرے وطن کے عظیم لوگو
کہ میں نے تم سے عجب گھڑی بے وفائی کی ہے
تم آج اپنی صفوں کو ترتیب دے رہے ہو
اور آج میرے غرور نے جبہ سائی کی ہے

میں اپنی دنیا سے دور اِک دوسری زمیں پر
خود اپنے ہاتھوں ہی اپنی تحقیر کر رہا ہوں
بہ فیضِ افلاس، چند نانِ جویں کی خاطر
میں اپنی تُربت کی آپ تعمیر کر رہا ہوں

ہزاروں آہوں کے، آنسوؤں کے خموش نالے
مرے عزائم پہ آج آوازہ کس رہے ہیں
میں لاکھ ہنس ہنس کے دے رہا ہوں فریب خود کو
مگر مری روح کو سنپولے سے ڈس رہے ہیں

کچو کے دیتا ہے ہر نفس کوئی دل کے اندر
کوئی مسلسل لہو میں زہراب گھولتا ہے
تڑپ کے یک لخت چیخ اٹھتی ہے روحِ مضطر
کوئی کچھ ایسے ضمیر کی فصد کھولتا ہے

میں اپنے ہونٹوں کی قبر پر مسکراہٹوں کے
حسین پھولوں کی چادریں کب تلک چڑھاؤں
میں خود کو اور اپنے پیش و پس کو فریب دینے
بجھی سی شمعِ نظر کی لو کب تلک بڑھاؤں

نہیں نہیں میں فریب خود کو نہ دے سکوں گا
یہ زہر قطرہ بہ قطرہ اب میں نہ پی سکوں گا
میں اپنے پھولوں کو چند خاروں کی نذر کر کے
حیات کا دامنِ دریدہ نہ سی سکوں گا

میں دور رہ کر بھی تم سے نزدیک ہوں رفیقو!
تمہارے بے تاب دل کی دھڑکن کو سن رہا ہوں

تمہاری آنکھوں میں جاگتا ہے جو خوابِ فردا
میں اُس کی تعبیر کے حسیں پھول چن رہا ہوں

میں جانتا ہوں جو ظلمتیں آج پھن اُٹھائے
تمہاری دھرتی کے نونہالوں کو ڈس رہی ہیں
وہی بہ اندازِ دیگر اِس سر زمین پر بھی
مرے حسیں شبنمی اُجالوں کو ڈس رہی ہیں

یہاں بھی انسان کا وقار اِک حقیر شے ہے
جو چند سکّوں کے مول کانٹوں پہ تل رہا ہے
یہاں بھی تاریخ اپنا چولا بدل رہی ہے
خدائی کا، ناخدائی کا پول کھل رہا ہے

حسیں لفظوں کی اوٹ سے جھانکتی حقیقت
شعور کی سر بہ مُہر خبریں اُڑا رہی ہے
حرم کے محراب کے چراغوں کی اُونگھتی لو
خود اپنے انجام کا فسانہ سنا رہی ہے

عوام کے شب گزیدہ خوابوں کے سرد اُفق کو
اُبھرتا خورشید اپنی کرنوں سے دھو رہا ہے
عقیدتوں کے سیاہ محبس میں دھیرے دھیرے
حقیقتوں کا شعور بیدار ہو رہا ہے

میں عہد کرتا ہوں میرے خوابوں کے پاسبانو
میں راہِ حق میں ہمیشہ پرچم بکف رہوں گا
میں اپنے جمہور کے قدم سے قدم ملائے
تمہاری جہدِ حیات میں صف بہ صف رہوں گا

(۱۹۵۱ء)

O

تھے باغباں کے روپ میں گل چیں جگہ جگہ
آئی جو اب بہار تو اُٹھنے لگے نقاب

پچھتاوا

کس بزم میں لے آئی اے دل تری ویرانی

دیواروں کی رنگت فق، دروازوں پہ چپ طاری
مبہوت سی خاموشی، گم سم سی فضا ساری
ہر دل پہ گراں دھڑکن، ہر روح پہ تن بھاری
کعبہ ہو کہ بت خانہ، پتھر کی عمل داری

کیا چشم ولب و عارض، کیا زلف، جبیں، شانے
سب اپنے تضادوں کے منہ بولتے افسانے
دم توڑتے جاتے ہیں جلتے ہوئے پروانے
اور شمع نہیں جانے، اپنے ہیں کہ بیگانے

ہے اہلِ ہنر کی یہ کیا خوب ہنر کاری
جاگی ہوئی آنکھیں ہیں، سوئی ہوئی بیداری
ساقی ہے تو ساقی کی نظروں میں وہ پُرکاری
ہر رند تہی ساغر اور فیضِ کرم جاری

جس سمت نظر کیجے اِک عالمِ حیرانی
یا زیست کی ویرانی یا موت کی ارزانی
نے زہد شراب آگیں، نے کفرِ مسلمانی
کس بزم میں لے آئی اے دل تری ویرانی

(۱۹۵۱ء)

O

آنکھ کھلی تو پلکیں نم تھیں
دیکھ لیں خوابوں کی تعبیریں

نیپیر روڈ°

نیپیر روڈ پہ تحدید، بہت خوب مگر
نیپیر روڈ پہ تحدید کا آخر انجام!
چلتے پھرتے ہوئے کعبوں سے اُٹھاؤ تو غلاف
نیپیر روڈ رواں ہے کہ نہیں گام بہ گام
جہل زندہ ہے تو رسوا ہی رہے گی تہذیب
بھوک زندہ ہے تو بکتے ہی رہیں گے اجسام

(۱۹۵۲ء)

°طوائفوں کا محلّہ

پھر یومِ بہار آیا

(ایک استقبالیہ)

ہاں یہی ہے مری فردوسِ زمیں
میرے خوابوں کی سنہری تعبیر
میرا انعام، مرا حاصلِ جہد
میری گم گشتہ سحر کی تنویر
میرے ناکردہ گنہ کی تعزیر

ہاں، اِسی خندۂ نم کی خاطر
میں کہ پیتا رہا برسوں آنسو
اِسی جنت کو سجانے کے لیے
اپنی رگ رگ سے نچوڑا تھا لہو
اپنے گلشن کی لٹا دی خوشبو

کتنی دلکش ہے یہ تصویرِ بہار
ایک اِک نقش ہے ایک اِک شہکار
یہ ہر اِک گام پہ تا حدِ نظر
میرے خس پوش محلکوں کی قطار
سانس لیتی ہوئی لاشوں کے مزار

کوچہ و راہ میں بکھرے ہوئے پھول
زندگانی کے نئے نقش و نگار
گرد آلود، برہنہ، بھوکے
ناتواں، کالے کلوٹے، بیمار
میرے آزاد وطن کے معمار

جگمگاتے ہوئے بازاروں میں
خم لنڈھاتے ہوئے کعبوں کا خرام
بھوکے بچوں کو کلیجے سے لگائے
آنکھوں آنکھوں میں چکاتے ہوئے دام
ہوتا رہتا ہے تقدس نیلام

کتنے شائستہ ہیں آئینِ حیات
کتنا محفوظ ہے انساں کا وقار
فکر پابستہ، نگاہیں محصور
کوئی اقرار نہ کوئی انکار
زندگی کیا ہے بجز لاشۂ دار

عارفِ دیں ہو کہ علامۂ دہر
جہل افروز، توہّم بہ کمند
چیختے رہتے ہیں قسمت! قسمت!
مادرِ پاک کے بھولے فرزند
اور قسمت کہ تجوری میں ہے بند

اور اِس حال میں رہ کر بھی ہنوز
خندہ لب ہیں مرے جمہور تمام
زندگی صبر و قناعت بردوش
موت اِک عیشِ مسلسل کا پیام
زندہ باد اے مری تعمیرِ دوام

کیوں نہ خوش ہو مرا تابندہ ضمیر
کتنے جاں بخش ہیں یہ نظارے
دیکھتا ہوں تو اُمڈ آتے ہیں اشک
میری آنکھوں میں خوشی کے مارے

میرے محسن، مری جاں سے پیارے

تم تو ہر سال ہی آ جاتے ہو
آؤ، اِک اور عنایت کر جاؤ
کچھ نمک اور چھڑک دو اِن پر
بھر نہ جائیں مرے رِستے ہوئے گھاؤ
ضرب اِک اور لگاتے ہوئے جاؤ

(مطبوعہ۔ماہنامہ 'ادب لطیف' لاہور۔فروری ۱۹۵۲ء)

مزارِ قائد پر

ترے دیار کو ہم ظلمتوں کے ماروں نے
بڑے ہی پیار سے ارمان سے سنوارا تھا
قدم قدم پہ چھڑک کر جوانیوں کا لہو
ترے اُفق کو بڑے چاؤ سے نکھارا تھا
بچھا کے راہ میں کتنے ہی چاند تاروں کو
نئی سحر کے لیے راستہ اُبھارا تھا

خبر نہ تھی کہ سویرے کی رتھ پہ چڑھتے ہی
شعاعِ مہر، ستاروں کو بھول جائے گی
گلوں کی آنکھ بھر آئے گی مسکراتے ہی
صبا کی ساری تگ و دو فضول جائے گی

تھکا تھکا سا تبسم، اُڑا اُڑا سا رنگ
بہار، صحن چمن سے ملول جائے گی

یہ دھوپ چوس کے بیٹھی ہے جو شفق کا لہو
یہ کس وفا کا ہے انعام، سوچتا ہوں میں
اُبھر کے شرق سے مغرب٭ کی سمت ہے جو رواں
اُس آفتاب کا انجام سوچتا ہوں میں
ترا خلوص، ترا پیار معتبر ہی سہی
ترا مآل بہ ہر گام سوچتا ہوں میں

ذرا نگاہ اُٹھا کر یہ زندگی تو دیکھ
ترا مزار، مزاروں کے بیچ ہے کہ نہیں
وہ گلستاں جسے ہم نے خزاں سے چھینا تھا
وہ آج اپنے ہی خاروں کے بیچ ہے کہ نہیں
بہ زعمِ اوجِ فلک لاکھ بے نیاز رہے
یہ آفتاب ستاروں کے بیچ ہے کہ نہیں

مہ و نجوم کی تابانیاں ہیں کم نہیں
مہ و نجوم کی تابانیوں کو موت نہیں
سکوتِ موج میں مضطر ہیں سینکڑوں طوفاں
تہہِ سکوت کی طغیانیوں کو موت نہیں
ہزار روندے ستاروں کو چلچلاتی دھوپ
تغیرات کی جولانیوں کو موت نہیں

٭نواب زادہ لیاقت علی خاں کا دورۂ امریکہ

O

سورج سرِ جبینِ سحر چھوڑ آئے ہیں
تنہا سوادِ شب میں قمر چھوڑ آئے ہیں
اب کیا بتائیں تیری محبت میں جانِ من
کیا کیا متاعِ دیدۂ تر چھوڑ آئے ہیں

سوسائٹی گرل

تیری آزاد خرامی سے نہیں ہے شکوہ
تو نے اچھا ہی کیا، توڑ دی ہر قیدِ کہن
تیرے ملبوس کی خوشبو سے ہے پھولوں میں مہک
تیرے نقشِ کفِ پا سے ہے یہ ویرانہ، چمن

تیری زلفیں کہ بھری دھوپ میں پھیلی ہوئی چھاؤں
تیری پیشانی کہ جھیلوں پہ نہاتی ہوئی صبح
تیری آنکھیں کہ حسیں خواب دکھاتی راتیں
لب و رخسار کہ گلزار سجاتی ہوئی صبح

سنگِ مرمر سے تراشی ہوئی بانہیں گویا
انگلیاں جیسے ہتھیلی میں کنول کھلتا ہوا
تیری پاپوش کہ چلتی ہوئی پھولوں کی قطار
تیری رفتار کہ اٹھلاتی ہوئی موجِ صبا

وہ غرارہ کہ بچھی جاتی ہو قدموں میں سحر
وہ دوپٹہ کہ دھنک لوٹ رہی ہو جس پر

تیری سج دھج تری فطرت کا تقاضہ ہے مگر
تو ہے جس رہ پہ خراماں، وہ تری راہ نہیں
علم، احساس، شعور اور نظر کے باوصف
سر اُٹھایا نہیں کچھ اور جھکا دی ہے جبیں

جس چراغاں سے چکا چوند ہیں تیری آنکھیں
وہ چراغاں بجز اِک رقصِ شرر کچھ بھی نہیں
رونقِ نجم و قمر گھور اندھیرے تک ہے
شب گزر جائے تو یہ نجم و قمر کچھ بھی نہیں

تجھ کو احساس ہے اِس طرزِ روش کے باعث
ایک بازار ہوئی جاتی ہے محفل تیری
اپنے ماحول سے منہ پھیر کے جانے والی
نیپیر روڈ سے آگے نہیں منزل تیری

تو کہ جس طرح سرِ راہگزر کوئی سرائے
رات دلہن بنے اور صبح کو بیوہ ہو جائے

O

کچھ فرق نہ آیا سحر و شام کے ہوتے
دن پھر نہ سکے گردشِ ایام کے ہوتے
ساغر ہے کہ ہم تک کبھی آتا ہی نہیں ہے
ساقی کی نگاہِ کرم عام کے ہوتے

۸/جنوری ۵۳ء

(کراچی میں طلباء پر فائرنگ کا سانحہ)

ضعیف ماں! ترا فرزند، تیرا لختِ جگر
زمیں کی گود میں خاموش سو گیا ہے آج
جوان دل میں جواں حسرتوں کو دفنائے
وطن کی خاک کا پیوند ہو گیا ہے آج

کسے دکھاتی ہے تو اپنے دل کی ویرانی
چمن کا سوزِ دروں، گل فروش کیا جانے
یہاں تجارتِ گل ہے بہار کا مقصد
جو شاخِ گل پہ گزرتی ہے، وہ خدا جانے

بجھا بھی دے کہ یہ اشکوں کے ٹمٹماتے دیے
ترے کھنڈر میں چراغاں نہ کر سکیں گے کبھی

تری فغاں، ترے نالے فلک شگاف سہی
کسی خدا کو پشیماں نہ کر سکیں گے کبھی

ترا چٹان سا بیٹا زمیں میں گڑ تو گیا
ہوئی ہیں کتنوں کی عمریں دراز، یہ بھی تو دیکھ
ہر ایک قلب میں ہے سرنگوں بتِ 'محمود'
کہاں پہنچ گیا دستِ 'ایاز'، یہ بھی تو دیکھ

ضعیف ماں! یہ ہے انساں کا خوں، اِسے پی کر
یہ 'خواجگی' ○ کبھی سر سبز ہو نہیں سکتی
ہزار دل کی سیاہی کو داغِ زہد چھپائے
لہو کے داغ عبادت بھی دھو نہیں سکتی

ہر اِک کتاب ہے انساں کے ذہن کی تخلیق
کتاب ذہن سے مستور رہ نہیں سکتی
کچھ اِس قدر ہے فزوں تشنگیِ علم کہ اب
کسی تجوری میں محصور رہ نہیں سکتی

ہم اپنے خوں سے جلائیں گے علم وفن کے چراغ
اور اِن چراغوں سے اِک کہکشاں بنا لیں گے
جہاں جہاں بھی بہا ہے لہو شہیدوں کا
وہیں وہیں پہ بِنائے حیات ڈالیں گے

یہ قبر، قبر نہیں، مکتبِ شعور ہے یہ
یہیں پہ زیست کے نقشے سنورنے والے ہیں
یہ شمع، ہاں اِسی شمعِ مزار کی لو سے
ہزارہا مہ و خورشید اُبھرنے والے ہیں

○ خواجہ ناظم الدین کی وزارت

O

اہلِ کارواں کو جب، ہو نہ فکرِ منزل تب، راہبر کو کیا کہیے
اپنی لغزشِ پا ہی، چاہتی ہے گمراہی، رہگزر کو کیا کہیے

دیوانی

(کراچی، ۸جنوری ۱۹۵۳ء۔طلباء پر فائرنگ کے دوران ایک بوڑھی عورت زخمیوں کے درمیان سڑکوں پر دیوانہ وار قہقہے مارتی ہوئی 'پاکستان زندہ باد' کے نعرے لگا رہی تھی۔ (ایک خبر)

خوشیاں مناؤ، رقص کرو، قہقہے لگاؤ
لوگو! خموش کیوں ہو، مرے ساتھ تم بھی گاؤ

گاؤ کہ آج بے خود و سرشار ہے حیات
گاؤ کہ آج رقص میں ہے ساری کائنات
گاؤ کہ آج رات ہے رشکِ شبِ برات
گاؤ کہ آج موت بھی ہے مژدۂ ثبات

گاؤ کہ آج رنگ پہ حسن بہار ہے
گاؤ کہ آج ارضِ وطن لالہ زار ہے

گاؤ کہ آج نغمہ بہ لب ہے سکوتِ نَے
گاؤ کہ آج وجد میں ہے زندگی کی لَے
گاؤ کہ ظرف جام سے باہر ہے موجِ مَے
گاؤ کہ ہو گئے ہیں کڑے کوس آج طے

دیکھا تھا میرے شاعرِ مشرق نے کل جو خواب
تعبیر سے وہ خواب ہوا آج فیض یاب

خلدِ وطن کی جھومتی گاتی ہواؤ آؤ
آؤ مری حسین فضاؤں کی اپسراؤ
دامن میں پھول بھر کے مرے لال پر لٹاؤ
دولہا بنا ہے آج مرا لال، تم بھی گاؤ

بندوقیں دے رہی ہیں سلامی اُٹھا کے ہات
اُٹھتی ہے میرے لال کی کس شان سے برات

کیا وقت ہے کہ آنکھ میں آنسو بھی آ گئے
نزدیک و دور، قوس قزح بن کے چھا گئے
کس آئینے میں چہرۂ فردا دکھا گئے
کن موتیوں کی آب زمیں پر لٹا گئے

ہر پا سبانِ علم کا، مکتب کا شکریہ
ذرّے سے تا بہ شمس وقمر، سب کا شکریہ

کیا کیا نہ حسرتوں کے شکستہ ہوئے ایاغ
کتنے دیے بجھا کے جلایا تھا یہ چراغ
کن آنسوؤں سے دھوئے گئے ہیں جگر کے داغ
کس فصلِ گل نے آج کِھلایا ہے دل کا باغ

واماندہ رخشِ عمر کو آرام مل گیا
برسوں کے صبر و شکر کا انعام مل گیا

دو اپنے اِس دیارِ حسیں کو دعائیں دو
اِس نوبہارِ خلدِ زمیں کو دعائیں دو
سنگیں بکف، محافظِ دیں کو دعائیں دو
ہر ناخدائے عرش نشیں کو دعائیں دو

یہ جشن میرے لال کا جشنِ ثبات ہے
یہ نوشۂ عروسِ وطن کی برات ہے

ناچو، خوشی مناؤ، ہنسو، قہقہے لگاؤ
لوگو خموش کیوں ہو، مرے ساتھ تم بھی گاؤ

اجنبی مہمان

(امریکی وزیرِ خارجہ فوسٹر ڈلس کی آمد پر)

اِک نئے دوست آئے ہیں گھر میں
دوستو! کوئی اہتمام کرو
نفرتوں کے جلال کے باوصف
اپنے مہماں کا احترام کرو
بھیگی آنکھوں میں، خشک ہونٹوں پر
مسکراہٹ کا انتظام کرو
اپنی آزادیوں پہ ناز کرو
اپنی قبروں میں جشن عام کرو
کھل کے نعرے لگاؤ گام بہ گام
اور اونچا وطن کا نام کرو

یہ ہیں وہ صاحبِ خدا اوصاف
جن کے صدقے میں ملک پلتے ہیں
جن کی رحمانیت کی جنت میں
اختیاراتِ عرش چلتے ہیں
جن کی قہاریت کے دوزخ سے
آفتابوں کے دل دہلتے ہیں
جن کی ابرو کے اِک اشارے پر
انقلابات رُخ بدلتے ہیں
جن کے بت خانۂ سیاست میں
ناخدا کیا، خدا بھی ڈھلتے ہیں

یہ بہت دُور، دُور مغرب سے
ارضِ مشرق سجانے آئے ہیں
ایشیاء کے اُمڈتے طوفاں سے
ایشیاء کو بچانے آئے ہیں

تپتے جسموں کے پاؤں کے نیچے
چھاؤں اپنی بچھانے آئے ہیں
مصر کی طرح ارضِ پاک کو بھی
ایک ترکی بنانے آئے ہیں
اِک دکاں کی بساط اُلٹا کر
ایک دوکاں جمانے آئے ہیں

آج اپنے وطن میں اِن کے لیے
سج رہا ہے حیات کا بازار
دستِ گل چیں سے ہو رہا ہے پھر
صحنِ گلشن میں اہتمامِ بہار
ہر کمیں گاہِ ماہ و انجم سے
ہونے والی ہے صبح پر یلغار
اِک نیا کوریا ہے زیرِ وجود
ہو رہی ہے نئی زمیں ہموار

موت سے ہے غمِ حیات کا لطف
غم نہیں ہے تو ہر خوشی بیکار

کتنے خوش بخت ہیں یہ سکۂ زر
کتنا بد بخت ہے یہ اپنا دیار
کیسی سازش کو دے رہے ہیں پناہ
معبدوں کے بلند تر مینار
ماؤں کی گود میں بصد اخلاص
زندہ جسموں کے سج رہے ہیں مزار
ایک اِک گھر میں کوئی ہیر سیال
خونِ رانجھا سے کر رہی ہے سنگھار
شاہراہوں کے خشک کھیتوں میں
ابنِ آدم کی فصل ہے تیار

دوستو! کچھ تو بہرِ استقبال
اپنے مہمان پر نثار کرو
کچھ تو ہو گا تمہارے دل میں لہو
کچھ تو نذرِ جمال یار کرو
یہ شبِ وصل کٹ نہ جائے کہیں
اپنی بانہوں پہ اعتبار کرو
کوئی اقدام، کوئی جرأتِ شوخ
کچھ تو اِس شب کو شرمسار کرو
کچھ تو ہو، دردِ عشق کی سوغات
کچھ تو اِس گلبدن کو پیار کرو

(۱۹۵۳ء)

مہاجر بستیاں

صبح ہوتے ہی چیخ پڑتے ہیں قبروں کے دہن
اپنے مسکن سے نکل آتا ہے لاشوں کا ہجوم
مادرِ پاک کے خوابوں سے تراشے ہوئے جسم
عقل مجہول، نگہ کور، زباں بے مفہوم
اپنے امروز کا کچھ علم نہ فردا کی خبر
اپنی ہستی کی حقیقت ہی نہیں ہے معلوم
ایک اِک دوش کہ پشتارۂ غم سے بوجھل
ایک اِک رگ کہ رمِ قطرۂ خوں سے محروم

ایک اِک دل میں دہکتے ہوئے دوزخ لاکھوں
اور آنکھیں کہ بسائے ہوئے خلدِ معدوم
کچھ نہیں فکر، بجز نانِ جویں، نانِ جویں
اور ہو گی بھی تو کیا حاجتِ قلبِ مرحوم
شام ہوتی ہے تو پھر صبح کی بھوکی قبریں
چاٹ جاتی ہیں ہر اِک سایہ و ہر نقشِ قدوم

عمر تا عمر اِسی طرح سے کٹ جاتی ہے
اپنی آنکھوں میں لیے گم شدہ منزل کی تلاش
اپنی پلکوں پہ اُٹھائے ہوئے 'اِک خواب' کی لاش
زندگی موت کی گودی میں سمٹ جاتی ہے

یہ نظم 'ابن مریم' کے نام سے ۱۹۵۴ء میں ماہنامہ 'افکار' میں شائع ہوئی تھی۔ (شاعر)

O

اشجار دھوپ میں ہیں مسلسل کھڑے ہوئے
کیسے اُٹھائیں پاؤں، زمیں میں گڑے ہوئے

دلاسہ

(اپنے پھوپی زاد بھائی قاضی شفیع کے نام)

نہ رو میرے بھائی کہ دنیا یہی ہے

یہ دنیا جہاں عرصۂ زندگی بھی
ہمارے لیے موت سے کم نہیں ہے
ہر اِک پل میں اِک عمر کا طول پنہاں
یہاں پر تو اِک پل بھی ہمدم نہیں ہے
کلی کی چٹک سے گلوں کی پھبن تک
کوئی لمحۂ زیست محکم نہیں ہے
سحر کا تبسم ہو یا شب کی سج دھج
کہاں وقت کی آنکھ پرنم نہیں ہے

تم اپنی یتیمی پر نوحہ کناں ہو
مگر اِس فغانِ مسلسل سے حاصل
یہ وہ غم ہے جس کا مداوا نہیں ہے
یہ وہ بحر ہے جس میں طوفاں نہ ساحل
یہ وہ دشت ہے جس میں سبزہ نہ چھاؤں
یہ وہ آگ ہے جو ہے خود شمعِ محفل
کہاں تک تم اِس آگ میں جل سکو گے
کہ ہیں اشک ہی ہر تبسم کی منزل

میں یہ جانتا ہوں کہ اِس غم کا باعث
تقاضائے عمرِ طبیعی نہیں ہے
یہ غم، ہر غمِ زندگی کا ہے عنواں
یہ داغ اپنی دنیا کا داغِ جبیں ہے
یہ مرقد ہے اِس نظمِ دوراں کا محور
اِسی قبر میں اپنی دنیا ہے، دیں ہے
یہ آنسو ہے اپنا ہی خونِ بصیرت
اور اِس خوں میں تر اپنی ہی آستیں ہے

مرے دوست اِس اشک پرور جہاں میں
ہمیں ہنس کے ہر اشک پینا پڑے گا
بہ ہر گام دامانِ دل چاک ہو گا
بہ ہر طور، ہر چاک سینا پڑے گا
بہ ہر جام، زہرِ ہلاہل ملے گا
مگر ہم کو ہر جام پینا پڑے گا
بدل جائے جب تک نہ یہ نظمِ گیتی
ہمیں موت کی زد میں جینا پڑے گا

(۱۹۵۴ء)

(۱۵/دسمبر ۱۹۷۶ء کو قاضی شفیع کا بھی انتقال ہو گیا)

سکوتِ مضطرب

(اپنے عزیز دوست لطیف ساجد کے انتقال پر)

ہم نشیں تیری جدائی سے جو دل پر گزری
کاش میں اُس کو کسی طرح بیاں کر سکتا
کاش وہ غم کہ جو شرمندۂ مژگاں نہ ہوا
اپنے اشعار میں اُس غم کو عیاں کر سکتا
کوئی اسلوب، کوئی لفظ سہارا دیتا
کسی عنوان، کسی طور، فغاں کر سکتا

دل میں اِک حشر سا برپا ہے کہ خاموش بھی ہے
ایک طوفاں ہے کہ ساکت بھی ہے پر جوش بھی ہے

زہرخند

(اُن نام نہاد ُ ثقہ' ادیبوں کے نام جو منٹو کی موت کی خبر سن کر قہقہے لگا رہے تھے)

خوش ہو اے ارضِ بے ضمیر کہ آج
تیرا اِک بارِ دوش اُتر ہی گیا
تیرے فیضِ کرم سے آخرِ کار
ایک زندہ ادیب مر ہی گیا

خوش ہو اب تیرے غم گساروں کے
جیب و دامن نہ ہو سکیں گے چاک
وہ قلم تو نے آج توڑ دیا
جس نے کھولے حیات کے پیچاک

خوش ہو اب تیرے غازۂ رخ کی
کوئی اِک تہہ نہیں اُتارے گا
تیرے بازار کا گرے گا نہ بھاؤ
یوں کوئی نقدِ جاں نہ ہارے گا

خوش ہو، یہ موت تیری محفل میں
زندگی کا پیام لائی ہے
چند لمحوں کے واسطے ہی سہی
قہقہے کا مقام لائی ہے

آج جی بھر کے دورِ جام چلے
کاگ اُڑتے رہیں سروں کی طرح
مرتا جائے گا یوں ہی ہر فن کار
تیری پچھلی روایتوں کی طرح

○ یہ نظم فروری ۱۹۵۵ء میں 'ابن مریم' کے نام سے 'افکار' کراچی میں شائع ہوئی تھی۔ (شاعر)

ایک سرکش دماغ تھا۔۔۔نہ رہا

(سعادت حسن منٹو کی موت پر ایک اور نظم)

کیا کچھ نہ دل پہ بیت گئی ہے نہ پوچھیے
جب یہ کہا کسی نے کہ منٹو گزر گیا
یوں دل دھڑک کے ہو گیا خاموش یک بہ یک
جیسے خود اپنے گھر کا کوئی فرد مر گیا

اُس پر سکوت لمحۂ سوزاں سے آج تک
جب بھی قلم اُٹھایا ہے آنسو نکل گئے
اُس کا خیال آتے ہی یوں چیخ اُٹھی ہے روح
گویا دل و دماغ پہ آرے سے چل گئے

احساس پہلے کم تھے دلِ غم پناہ پر
جو ہم نئے کرم سے نوازے گئے ہیں آج
کس کو خبر اس ایک جنازے کے ساتھ ساتھ
قبروں تک اپنی، کتنے جنازے گئے ہیں آج

یہ دور جس میں دل کا نہیں ہے کوئی مقام
پتھر سے کر رہا ہے جو شیشے کا احترام
اِس دور میں بہ جرأتِ رندانہ دل کی بات
کہتا رہا ہے کوئی تو منٹو تھا اُس کا نام

منٹو کہ جس نے زہر پیا ہے بہ ہر نفس
اور زندگی کا نام لیا ہے تمام عمر
تہذیب کا کھرچ کے ہر اِک غازۂ فریب
انساں کا انتقام لیا ہے تمام عمر

وہ زندگی اسیرِ جہاں کب رہی کہ آج
قیدِ نفس سے بھی اُسے آزاد کر دیا

کس وقت آ گیا ہے تری رحمتوں کو جوش
یہ تو نے آج کیا میرے صیاد کر دیا

یہ محفلِ ادب کہ بہ قحطِ چراغِ فکر
اِک عرصۂ دراز سے ظلمت بدوش ہے
اِک طاق پر کہیں بہ تپِ شعلۂ دروں
'اِک شمع جل رہی تھی سو وہ بھی خموش ہے'

(۱۹۵۵ء)

O

ناقدریٔ فن کا، مرے فن کار گلہ کیا
آئینے کی قسمت میں ہے، پتھر کے سوا کیا

بازار میں آئے ہیں تو بولی بھی اُٹھے گی
فن جنس ہی ٹھہرا ہے تو گاہک کی خطا کیا

انسان امر ہے

(عالمی جنگ کے خلاف امریکی باغی جوڑے ایتھل اور جولیس روزن برگ کی موت پر)

نئے جہاں کے نئے خداؤ تمھیں بھی نیچا دِکھا کے آخر یہ پیچ انساں اُبھر گیا ہے
جو خون تم دفن کر چکے تھے وہ خوں نشیبوں میں تہہ نہ پا کر اُفق اُفق تک بکھر گیا ہے

ذرا نگاہیں اُٹھا کے دیکھو چمن چمن سے قفس قفس تک یہ شعلے کیسے بھڑک رہے ہیں
تباہ تو ایک گھر ہوا ہے مگر اِس اِک گھر کے غم میں تپ کر تمام عالم بپھر گیا ہے

کہاں وہ رابرٹ و مائیکل° کے پلک پلک سے ٹپکتے آنسو کہاں یہ مشرق کا چاک دامن
ہزار ہا دوریاں ہیں لیکن یہ خون ہر موڑ سے گزر کر ہر ایک دل میں اُتر گیا ہے

نہ جانے اِس خوں میں کیا نہاں ہے نہ جانے کتنے دلوں کی دھڑکن نہ جانے کتنی شبوں کی صبحیں
کہ آج اِس خون میں نہا کر حیات کا حسن اور بھی کچھ نکھر گیا ہے سنور گیا ہے

نئے جہاں کے نئے خداؤ نہ جانے اِن پستیوں کی تہہ میں بلندیاں کس قدر نہاں ہیں
کہ کل ہی تم ایک ہیروشیما زمیں میں دفن کر کے اُٹھے اور آج اِک چین اُبھر گیا ہے

° روزن برگ کے دو معصوم بچے

O

نئے جہاں کے نئے خداؤ تمہارے مدفن ہی بن نہ جائیں تمہارے اپنے قفس ہزاروں
تمہارا یہ عرشِ زر سلامت کہ اب تمہاری ہی جنتوں میں نہاں ہیں آتش نفس ہزاروں

تمھیں یقیں آئے یا نہ آئے زمیں چٹانوں کے ناز سہہ کر نشیب کے غم کو پا گئی ہے
فرازِ دار و رسن کی تہہ میں جمے ہوئے خوں سے جھانکتے ہیں تمہارے بیتے برس ہزاروں

تمہارا ہر اِک طلسمِ رنگیں خود اپنے ہی جال میں اُلجھ کر بہ ہر قدم ٹوٹتا چلا ہے
حقیقتوں کے حضور ہر سو سروں کے بل گرتے جا رہے ہیں عظیم تر 'مالتھس' ہزاروں

مجھے خبر ہے تم آج ہر سو حقیر انساں کے نقشِ پا سے زمین کو پاک کر رہے ہو
مگر ذرا اِس طرف بھی دیکھو یہ کونپلیں سر اُٹھا رہی ہیں کہ بکھرے خاشاک و خس ہزاروں

نئے جہاں کے نئے خداؤ محبتوں کو فنا نہیں ہے صداقتیں مٹ نہیں سکیں گی
ہزار تم اِن کا خوں نچوڑو ہر ایک گھر میں ہے ایک 'ایتھل' سڑک سڑک 'جولیس' ہزاروں

(۱۹۵۶ء)

O مالتھس کا نظریہ آبادی جنگ کو ایک حیاتیاتی ضرورت بتاتا ہے (شاعر)

منظرو پس منظر

چلتے چلتے ٹھٹک گئے دو پاؤں
اِک دکاں پر نگاہ جم سی گئی
خشک آنکھوں میں برق سی تڑپی
دل کی دھڑکن مچل کے تھم سی گئی

رنگ رنگ آبدار ملبوسات
جیسے نظروں کے سامنے منشور
تہہ بہ تہہ آئینوں میں قوس قزح
کتنی نزدیک اور کتنی دور

ساڑیاں جیسے سطحِ آبِ رواں
ساڑیاں جیسے کہکشاں لہرائے
ساڑیاں جیسے چاندنی لبِ جو
ساڑیاں جیسے گلستاں لہرائے

چھوٹے چھوٹے سے شیش محلوں میں
حسنِ فطرت، جمالِ فن محدود
یہ تجارت، یہ ارتقا کا کمال
کائنات اِک دکاں پہ سر بہ سجود

ایک شوکیس میں بنارس قید
ایک شوکیس محبسِ کشمیر
ایک شوکیس، اِک حسیں زنداں
برِّاعظم سے تا بہ برِصغیر

اُس کی ظلمت زدہ نگاہوں میں
ان حقائق کی اِک کرن بھی نہ تھی
جانے کیا سوچتی رہی وہ غریب
اُس کے ماتھے پہ اِک شکن بھی نہ تھی

وہ کھڑی دیکھتی رہی چپ چاپ
جگمگاتے ہوئے جہان پرائے

آرزؤں کے رنگ محلوں میں
اجنبی جنتوں کے خواب سجائے

وہ کھڑی دیکھتی رہی چپ چاپ
خشک آنکھوں میں سیلِ اشک چھپائے
ہڈیوں کے نحیف سینے میں
دل کی بے نام خواہشات دبائے

وہ کھڑی دیکھتی رہی چپ چاپ
زندگی کی عجیب تصویریں
اِس اُجالے میں ڈھونڈتی ہی رہی
اپنے خوابوں کی شوخ تعبیریں

یک بہ یک ایک کار آ کے رکی
یک بہ یک ایک برق سی لہرائی
یک بہ یک تن گئی فضا میں دھنک
ایک عورت دکاں کے اندر آئی

ایک عورت کہ یاسمن کی بیل
ایک عورت کہ چلتی پھرتی برق
ایک عورت کہ چاندنی میں تاج
ایک عورت کہ اپنی آب میں غرق

وہ کھڑی دیکھتی رہی چپ چاپ
جگمگاتی دکاں سے کار تلک
کتنی یکساں تھی، کتنی ہم آہنگ
قہقہوں اور روپیوں کی کھنک

خشک آنکھوں میں بجلیاں پیہم
ناچتی، کوندتی، لپکتی رہیں
کار میں قہقہے سمٹ بھی گئے
خشک آنکھیں پلک جھپکتی رہیں

وہ کھڑی دیکھتی رہی چپ چاپ
زندگی کے نشیب اور فراز

قصرِ 'محمودؔ' سے ہے کتنی دور
گرد آلود رہگزارِ 'ایازؔ'

وہ خدیجہؓ ہو یا کہ سیتا ہو
کوئی کعبہ ہو یا صنم خانہ
آرزوؤں ہی سے عبارت ہے
زندگی کا حسین افسانہ

گرد آلود پاؤں اُٹھنے لگے
دل میں طوفانِ حشر خیز دبائے
آرزوؤں کے کانپتے تابوت
تھرتھراتی پلک پلک پہ اُٹھائے

وہ چلی تو گئی مگر چپ چاپ
نظمِ دوراں کا وزن تول گئی
کتنی اوجھل حقیقتوں کا پول
اہلِ فکر و نظر پہ کھول گئی

طبقاتی مساوات

(فلسفۂ عینیت کی روشنی میں)

یہ محض حادثات ہیں
کہ آج الگ الگ ہیں ہم
وگرنہ دل، بہ فیضِ غم
ازل سے ساتھ ساتھ ہیں

تمہارے اور ہمارے غم
الگ نہیں، جدا نہیں
جہاں کے دو خدا نہیں
وہ مہر ہے، ستارے ہم

ہماری محفلِ حسیں
اُسی کی جلوہ گاہ ہے
یہ سب اُسی کی چاہ ہے
کوئی کہیں، کوئی کہیں

یہ دل کی رسم و راہ ہے
یہ عشق کے ہیں سلسلے
یہ قربتیں، یہ فاصلے
'عنایتِ نگاہ' ہے

غلط شکایتیں، گِلے
جو پاس ہے تو چاند ہے
جو دور ہے وہ ماند ہے
کہ فاصلے ہیں فاصلے

مگر یہ بات بھی ہے طے
جو ہم 'قریبِ ذات' ہیں

تو کتنے باثبات ہیں
حیات پھر حیات ہے

یہ محض حادثات ہیں
کہ آج الگ الگ ہیں ہم
وگرنہ دل، بہ فیضِ غم
ازل سے ساتھ ساتھ ہیں

(۱۹۵۵ء)

O

اِک ذرا جرأتِ پرواز کہ آج
سو گئے تھک کے نگہبانِ قفس

O

کیا ظلم ہے ہر کوششِ پرواز پہ صیاد
ہنس پڑتا ہے اور داد دیے جاتا ہے مجھ کو

رموزِ حیات

کتنے نادان ہیں مرے جمہور
اپنی سرکار سے اُلجھتے ہیں
جانتے بوجھتے رموزِ حیات
زہر کو انگبیں سمجھتے ہیں

اِس دو روزہ حیات میں آخر
خوابِ عیشِ دوام سے حاصل
موت کے بعد، زندگی ہی ہے
راستے کے قیام سے حاصل

کیسے سمجھاؤں یہ نکاتِ دوراں
مفلسی بھی خدا کی نعمت ہے

اِس جہاں میں جو دکھ اُٹھاتے ہیں
اُس جہاں میں انہیں کی جنت ہے

اور وہ لوگ جن کو دنیا میں
ساری عیاشیاں ہیں آج نصیب
جلتے بھنتے رہیں گے دوزخ میں
اُس 'حیاتِ مدام' میں وہ غریب

کس قدر ہے عظیم یہ ایثار
'خوابِ عیشِ دوام' کی خاطر
خود اُٹھائیں گے مستقل تکلیف
صرف اپنے عوام کی خاطر

کتنے نادان ہیں مرے جمہور
زہر کو انگبیں سمجھتے ہیں
جانتے بوجھتے رموزِ حیات
اپنی سرکار سے اُلجھتے ہیں

کافی ہاؤس

سبھی 'عظیم' یہاں ہیں، سبھی ہیں دانشور
یہاں، مرے دلِ ناداں، کہاں ہے تیرا گزر
یہ وہ مقام ہے جس جا عوام کے فنکار
غمِ عوام میں دن رات ایک کرتے ہیں
یہیں تو آتے ہیں زیرِ وجود وہ شہکار
کہ جن کے حسن پہ ہم دل فگار مرتے ہیں
یہ پیالیاں ہیں کہ جامِ جہاں نما، مت پوچھ
انھی کی تہ سے یہ 'افکارِ نو' اُبھرتے ہیں

جو ایک گھونٹ اُترتا ہے حلق سے نیچے
تو ذہن، عرش کے اسرار فاش کرتے ہیں
یہ سگرٹوں کے دھوئیں، حلقہ ہائے دامِ خیال
یہ ایک کش میں کہاں سے کہاں گزرتے ہیں
وہ کوریا ہو کہ وتنام ہو کہ زلفِ حبیب
تمام گیسوئے برہم یہیں سنورتے ہیں
جو اِس فضا میں ہو باہم سخن کی فرمائش
تو جبرئیل کے مانند شعر اُترتے ہیں
یہاں، مرے دلِ ناداں، کہاں ہے تیرا گزر
سبھی عظیم یہاں ہیں، سبھی ہیں دانشور

(۱۹۵۵ء)

O

رہِ طلب میں ہے دار و رسن بھی اِک منزل
وگرنہ موت کا ہوتا ہے کون شیدائی

لاشوں کی بستی

صبر کر اے دل کہ اِس دنیا میں کیا کیا غم نہیں
اور پھر یہ سر زمیں، اِس کے بھی احساں کم نہیں

ہر نفس اِک داستانِ غم ہے، لب چپ ہیں تو کیا
کوئی آنکھ ایسی ہے جس میں خندۂ پرنم نہیں

کٹ رہی ہے ہر رگِ جاں ٹوٹتی جاتی ہے سانس
چیخ ہی اُٹھیں کم از کم، اِس قدر بھی دم نہیں

اِک سکوتِ مضمحل ہے ذرے ذرے پر محیط
وقت کے دھارے میں لیکن کوئی زیر و بم نہیں

زندگانی اِک مسلسل موت ہو کر رہ گئی
اِس قدر خاموش ہیں سب جیسے کوئی غم نہیں

O

موت سے کس کو مفر ہے موت کا ماتم نہیں
غم تو یہ ہے اِس زمیں پر زندگی کا غم نہیں

ایک دوکاں میں سمٹ کر رہ گئی ہے کائنات
جُز تجارت، قدر کوئی زیست کی محکم نہیں

کیسے کیسے لوگ دنیا سے چلے منہ موڑ کر
اور دنیا کا یہ عالم، فرصتِ ماتم نہیں

کوئی منٹو چل بسے، حسرتؔ° بچھڑ جائے کوئی
لیلیٰء شام و سحر کی زلف تک برہم نہیں

اِس فضا میں کوئی کیا نغمے بکھیرے، خوں جلائے
جس فضا میں حرفِ غم کا کوئی بھی محرم نہیں

(۱۹۵۵ء)

° چراغ حسن حسرتؔ

مادرِوطن کا نوحہ

میرے بدن پر بیٹھے ہوئے گِدھ
میرے گوشت کی بوٹی بوٹی نوچ رہے ہیں
میری آنکھیں ۔۔۔میرے حسیں خوابوں کے نشیمن
میری زباں ۔۔۔موتی جیسے الفاظ کا درپن
میرے بازو ۔۔۔خوابوں کی تعبیر کے ضامن
میرا دل ۔۔۔جس میں ہر ناممکن بھی ممکن
میری روح، یہ سارا منظر دیکھ رہی ہے
سوچ رہی ہے
کیا یہ سارا کھیل تماشا
(خونخواروں کے دسترخوان پہ میرا لاشہ)
لذتِ کام ودہن کے لیے تھا؟

(۱۹۵۸ء)

ایک مصرعہ ۔۔۔ ایک نظم

(عوام)
رات سورج کو نگل سکتی ہے، تاروں کو نہیں

(دوشیزگی)
نہ مسکرائے تو گلزار، مسکرائے تو پھول

(مستقبل)
رات کی گود میں سویا ہوا مہتاب کا خواب

(مطبوعہ ۔ ادبِ لطیف، لاہور فروری ۱۹۵۲ء)

رباعیات

ہر نقش سے اِک خوابِ مجسّم اُبھرا
ہر ذرّے سے اِک ساختۂ عالم اُبھرا
قدرت کی حقیقت کا ملا جب بھی سراغ
ہر عکس سے عکسِ رخِ آدم اُبھرا

ہر قلب کی رگ رگ کو نچوڑا برسوں
جو ظلم بھی تھا بس میں نہ چھوڑا برسوں
فطرت نے خود انسان کی عظمت کے لیے
انسان کی غیرت کو جھنجھوڑا برسوں

لب سی دیے ہلکے سے تبسّم کے عوض
دم کھینچ لیا ایک ترنّم کے عوض
کیا دوست ہمارا ہے کہ جس نے بہ خلوص
خوں چوس لیا دانۂ گندم کے عوض

ہر راز کا ہے آج جگر شق ہم سے
فطرت کا بہ ہر گام ہے منہ فق ہم سے
کھینچا گیا منصور سرِدار تو کیا
زندہ ہیں روایاتِ اَناالحق ہم سے

ہر راہ پُرآلام، نہ جانے کیا ہو
ہر موڑ پہ کہرام، نہ جانے کیا ہو
جس دور کا ہے موت ہی عنوانِ حیات
اُس دور کا انجام، نہ جانے کیا ہو

فطرت کے تلوّن کو نہ کھونے دیجے
میں روتا ہوں، چلیے مجھے رونے دیجے
لیکن مرے سرکار بنامِ تقدیر
انسان کو حیوان نہ ہونے دیجے

نفرت کی حدیں پاٹ رہی ہے کب سے
خود اپنا لہو چاٹ رہی ہے کب سے
اِک شخص کی ناعاقبت اندیشی کی
اِک قوم، سزا کاٹ رہی ہے کب سے

نظروں سے ہوئے دور، نظر میں آ کر
منزل ہوئی معلوم، سفر میں آ کر
تاریخ میں ہو گا کوئی ہم سا خوش بخت
بے گھر ہوئے ہم اپنے ہی گھر میں آ کر

(مطبوعہ۔صبا، حیدرآباد۔دکن ۱۹۵۵ء)

متفرق اشعار

کس کے لہو سے نکھرے ہیں چہرے گلاب سے
تیوری پہ بل نہ آئیں تو پوچھوں جناب سے

کتنی ہے دل نواز، ادائے گریز بھی
کچھ اور بڑھ گئی ہے طلب اجتناب سے

چلمن گری جو در پہ تو ہر پردہ اُٹھ گیا
کیا کیا کھلے ہیں راز، ترے اِس حجاب سے

O

کٹ گئی رات، رات باقی ہے
گفتنی ہے جو بات، باقی ہے

رشتۂ روشنی بہ فیضِ طلب
سائے سائے کے ساتھ باقی ہے

کعبۂ دل میں آج بھی شاعر
نقشِ لات و منات باقی ہے

O

خزاں میں لوگ کہتے تھے بہار آئے بہار آئے
بہار آئی تو جانے کیوں چمن سے اشک بار آئے

وہ محفل ہے نظر میں اور اتنا یاد ہے ہم کو
گئے تھے پُرسکوں لیکن بہت ہی بے قرار آئے

وفورِ ظلمتِ شب تھا تو کتنے نام تھے اُن کے
مگر یہ ماہ انجم جب شبِ ظلمت گزار آئے!

مٹی کا قرض

(نظمیں،غزلیں)

(۱۹۵۷ء تا ۱۹۷۴ء)

ازل سے ایک عذابِ قبول و رد میں ہوں
کبھی خدا تو کبھی ناخدا کی زد میں ہوں
(حمایت علی شاعر)

مسلم ضیائی کے نام

’پروانہ چراغِ حرم و دیر نداند‘
(عرفی)

ترتیب

میزان	حمایت علی شاعر	۲۰۹
گفتنی و ناگفتنی	(منظوم عرضِ حال)	۲۱۱

نظمیں

تجدید	۲۱۷
اردو اور بابائے اردو	۲۱۸
سمندر اور انسان	۲۱۹
ہوا	۲۲۱
تضاد	۲۲۳
آدمی	۲۲۶
سنگ میل	۲۲۷
جواب	۲۲۸
ایک منظر۔۔۔ایک سوچ	۲۲۹
اندیشہ	۲۳۰
سناٹا	۲۳۱
حسن ناصر	۲۳۳
دھڑکا	۲۳۵
مٹی کا قرض	۲۳۷
لہو	۲۴۱
مارچ پاسٹ	۲۴۵

لمحۂ فکر	۲۴۷
پسِ دیوارِ حرف	۲۵۰
چاند، خورشید کا رازداں	۲۵۴
وفاداری بہ شرطِ استواری	۲۵۷
بادل	۲۶۰
شاہ بھٹائی	۲۶۳
بابائے اُردو	۲۶۵
ماجد، میرا دوست	۲۶۷
ٹھہرا ہوا لمحہ	۲۷۰
تشنگی کا سفر	۲۷۵
ان کہی	۲۷۹
پَرتو	۲۸۳
تذبذب	۲۶۶
بہروپ	۲۸۸
خلاء	۲۹۰
کلفٹن	۲۹۱
متوسط طبقہ	۲۹۳
بازگشت	۲۹۵

غزلیں

دستک ہوا نے دی ہے ذرا غور سے سنو	۲۹۹
پیشِ نظر تا دور سلگتا ملبہ ہے	۳۰۲
راہ دشوار ہے، فرشِ گُل تر ہونے تک	۳۰۴
یہ بات تو نہیں ہے کہ میں کم سواد تھا	۳۰۵

کل تک تو اِک فریب یقیں تھا، گماں کے ساتھ ۳۰۷
میں تو سمجھ رہا تھا کہ سورج گہن میں تھا ۳۰۸
اِس دشتِ سخن میں کوئی کیا پھول کھلائے ۳۱۰
منزل کے خواب دیکھتے ہیں پاؤں کاٹ کے ۳۱۱
ٹوٹا نہیں بکھر کے بھی خوابِ جنوں ہنوز ۳۱۲
آتش کدۂ دل کو ہوا کیوں نہیں دیتے ۳۱۴
دل پر گراں گزرتا ہے اب تیرا ساتھ بھی ۳۱۶
اُٹھنے لگا دھواں، دلِ غم انتساب سے ۳۱۸
اہلِ نظر کو دولت حسن نظر ملی ۳۲۱
میں سوچتا ہوں مگر میری سوچ ہی کیا ہے ۳۲۲
میں وہ یقیں ہوں، نظر آئے جو گماں کی طرح ۳۲۳
الفاظ ہیں کہ زہر کے پیالے بھرے ہوئے ۳۲۵
لٹا دیا ہے غمِ آب و تاب میں کیا کیا ۳۲۶
کیسے کیسے خواب دکھلائیں مہ و اختر مجھے ۳۲۸
اس عرض سخن کا مجھے یارا تو نہیں تھا ۳۳۰
اس دشت پہ احساں نہ کرے ابرِ رواں اور ۳۳۲
پندارِ زہد ہو کہ غرورِ برہمنی ۳۳۳
یم بہ یم پھیلا ہوا ہے پیاس کا صحرا یہاں ۳۳۵
اپنا اندازِ جنوں سب سے جدا رکھتا ہوں میں ۳۳۶
میرا شعور مجھ کو یہ آزار دے گیا ۳۳۸
دل میں تھا جو خیال وہ لکھا نہ جا سکا ۳۴۰
شاعر صاحب اس بستی میں کس کو گیت سناتے ہو ۳۴۲
رات سنسان، دشت و در خاموش ۳۴۴

آج کی شب جیسے بھی ہو ممکن جاگتے رہنا ۳۴۶
راستہ تیرہ و تار ہے، کچھ کہو ۳۴۸
نالۂ غم، شعلہ اثر چاہیے ۳۵۰
رکتا ہے اُجالا کہیں ظلمت کی سپر سے ۳۵۲
کسی طرح یہ شبِ تار مختصر ہو تو ۳۵۴
ہر قدم پر نت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ ۳۵۵
جب تک زمیں پہ رینگتے سائے رہیں گے ہم ۳۵۷
آئے تھے تیرے شہر میں کتنی لگن سے ہم ۳۵۸
ہر رہنمائے وقت ہے رہزن، ترے سوا ۳۶۰
پندارِ یوسفی سہی، پندار ہی تو ہے ۳۶۲
جس کو دیکھ کے شاعر تم للچائے بہت ۳۶۵
آدمی ہوں کہ دیوتا ہوں میں ۳۶۷
اُس کے غم کو غمِ ہستی تو مرے دل نہ بنا ۳۶۹
ہر زخمِ دل کا لطف تھا تیغِ جفا کے ساتھ ۳۷۰
یہ آرزو ہی رہی، کوئی آرزو کرتے ۳۷۲
متاعِ درد ملی، سوزِ جاودانہ ملا ۳۷۴
خداوندا، یہ کیسی آگ سی جلتی ہے سینے میں ۳۷۶
اہتمامِ شبِ ہجراں ہوگا ۳۷۷
ادھوری غزلیں ۳۷۸

(’مٹی کا قرض‘ کی ثلاثیاں ’کلیاتِ شاعر‘ میں شامل پانچویں مجموعۂ کلام ’ثلاثیاں اور ہائیکو‘ میں ہیں)

میزان

وقت کی آنکھ مجھے دیکھ رہی ہے۔ میرا ہر عمل اُس کی نگاہ کی زد میں ہے۔ میں جو کچھ دیکھتا ہوں، جو کچھ سوچتا ہوں اور جو کچھ کہتا ہوں ۔۔۔ لمحوں میں تقسیم ہو کر وقت کی اکائی میں سمٹ جاتا ہے، مجھے یہ اختیار نہیں کہ میں اِس اکائی سے اپنے کسی عمل کو الگ کر سکوں، میں گزرتے لمحوں کو روک سکتا ہوں اور نہ آنے والے لمحوں کے احتساب سے بچ سکتا ہوں۔ میں چاہوں یا نہ چاہوں، میری فردِ عمل مرتب ہو رہی ہے اور میرے دل میں یہ دھڑکا بیدار ہے کہ تاریخ کا فیصلہ میرے حق میں کیا ہوگا؟

میں جو بیک وقت شاعر بھی ہوں اور ایک ایسا آدمی بھی جو اپنی پرچھائیوں میں بٹ چکا ہے۔ اِن پرچھائیوں میں اپنی وحدت کی تلاش اکثر مجھے اپنے آپ سے نبرد آزما رکھتی ہے اور شکست و ریخت کے اِس عمل میں اکثر وہ شاعر بھی ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے جو میری روح کا استعارہ ہے اور میں عرصے تک اپنے بکھرے ہوئے ریزوں کو جمع کرنے اور انہیں پھر سے جوڑنے میں سرگرداں رہتا ہوں۔ یہ عرصہ مجھ پر ایک عذاب کی طرح گزرتا ہے۔

'آگ میں پھول' سے لے کر 'مٹی کا قرض' تک میں کتنی ہی بار اس روح فرسا اذیت سے گزرا ہوں اور خدا جانے ابھی کتنے کرب انگیز مراحل سے گزرنا باقی ہے۔

میں نہیں جانتا کہ روح اور بدن کی اس جنگ میں میرا کیا حشر ہوگا میں پرچھائیوں میں بٹے ہوئے آدمی کے ملبے تلے دب کر رہ جاؤں گا یا اُس شاعر کو بچالاؤں گا جو مر کر بھی زندہ رہنا چاہتا ہے جو فنا میں بھی ثبات کے خواب دیکھتا ہے اور ظہور کے نت نئے پیرائے تلاش کرتا رہتا ہے

ظہور کی یہی آرزو شاعر کو تجربوں پر اُکساتی ہے اور اس کے فن کو وقت کی رفتار سے ہم آہنگ رکھتی ہے لیکن فن کا وقت کی رفتار سے ہم آہنگ ہونا ہی شاعری کی خوبی نہیں ہے۔ شاعری

جب تک تاریخ کے شعور سے روشن نہ ہو، اندھیرے میں چمکتے ہوئے جگنو کی طرح ہے۔ تاریخ کا شعور، شاعر کو عہد شناس بناتا ہے اور معاشرے میں اقدار کے جدلیاتی عمل سے آگاہ رکھتا ہے۔

شاعری اسی معنی میں اپنے عہد کی تنقید بھی ہے کہ وہ تاریخ کے تسلسل میں عصرِ رواں کا نہ صرف محاسبہ کرتی ہے بلکہ محاکمہ بھی کرتی ہے اور یہ محاکمہ ثابت کرتا ہے کہ شاعر کا اپنے زمانے سے رشتہ مجازی تھا یا حقیقی، جزوی تھا یا کُلّی ۔۔۔ وہ گرد و پیش کی دنیا میں صرف اپنی ذات کا سفیر تھا یا اپنے عہد کا وہ ہرکارہ بھی جو گھر گھر کا پیامبر ہوتا ہے، اس نے محض آبِ حیات پی کر خضر کی ابدیت کے خواب دیکھے یا وہ زہر بھی پیا ہے جو اپنی دھرتی کی محبت میں 'نیل کنٹھ' کو پینا پڑا تھا۔

حیاتِ ابدی کی لالچ میں تو سکندر نے بھی خضر کو رہنما کیا تھا اور اسُر (راکھشش) بھی وہ امرت لے بھاگے تھے جو دیوتاؤں نے سمندر کو متھ کر نکالا تھا لیکن ۔۔۔ زہر وہی پیتا ہے جسے اپنی مٹی عزیز ہوتی ہے۔

یہ مٹی کی محبت تھی جس نے آدم کو زمین پر اُتارا اور اپنی توہین کے انتقام پر اُکسایا۔ فطرت کی آتشیں قوت کے خلاف انسان کی جنگ جو ازل سے آج تک زندگی کے مختلف مورچوں پر لڑی جارہی ہے، اِسی محبت کا اقرار ہے۔

شاعر اِس اقرار کو الفاظ عطا کرتا ہے اور ان الفاظ کو اپنے عہد کی آواز دے کر تاریخ کے حوالے کر دیتا ہے۔ پھر تاریخ یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اُس آواز میں صداقت کتنی تھی اور حسنِ بیان کتنا۔

میں نہیں جانتا کہ تاریخ کا فیصلہ میرے حق میں کیا ہوگا ۔۔۔ میں جو صداقت کی تلاش میں اپنے کفن کا احرام باندھے کبھی اپنی ذات کا طواف کرتا ہوں اور کبھی اپنی دھرتی کا ۔۔۔ اور ادب کی بارگاہ میں آواز دیے جاتا ہوں کہ میں حاضر ہوں ۔۔۔ میں حاضر ہوں۔

حمایت علی شاعر

(۱۹۷۴ء)

گفتنی ناگفتنی

بہت دنوں سے میں خاموش تھا خدا کی طرح
زمیں میں گاڑے ہوئے سنگِ رہنما کی طرح

میں اپنی ذات کے صحرا میں کھو گیا تھا کہیں
صدائیں دیتا تھا دل، نالۂ دِرا کی طرح

ہوا کی زد میں تھا گویا چراغ راہگزر
پڑا ہوا تھا سرِ راہ، نقشِ پا کی طرح

یہ کون عکس کے مانند رُو برو آیا
میں خیرہ چشم، وہ خورشید کی ضیا کی طرح

یہ میرے دل کی ہے دھڑکن کہ فکر کی آواز
کوئی صدا سی ہے جبریل کی صدا کی طرح

یہ میری خلوتِ دل ہے کہ جلوتِ کونین
یہ میری ذات میں ہے کون ماسوا کی طرح

کھلی کتاب کے مانند کائنات تمام
نظر ہے خلوتیِ گوشۂ حِرا کی طرح

کھلا کہ 'لا' ہی حقیقت ہے، 'لا' ہی افسانہ
عدم وجود میں پوشیدہ ہے خدا کی طرح

بس اِک تسلسلِ جذب و گریز جاری ہے
ہر انتہا نظر آتی ہے ابتدا کی طرح

یہ آسمان، ازل سے بہ فیضِ کم نگہی
زمیں کے دوش پہ ہے پیرِ تسمہ پا کی طرح

عجب ہے نشۂ خود آگہی کہ دنیا میں
ہر اجنبی نظر آتا ہے، آشنا کی طرح

کسے خبر کہ ہے کیا ربطِ ظاہر و باطن
پہن کے بیٹھے ہیں سب جسم کو قبا کی طرح

اگر اُڑوں بھی تو سایہ زمین ہی پہ رہے
تو کیوں اُڑوں میں ہوائے گریز پا کی طرح

وہ بستیاں تھیں تو کیوں مجھ کو یہ ہوا محسوس
میں جنگلوں میں بھٹکتا پھرا ہوا کی طرح

اسیر ہے دلِ وحشی بدن کے زنداں میں
حیات کاٹ رہا ہوں، مگر سزا کی طرح

زمیں پہ پاؤں نہیں اور آسماں پہ دماغ
یہ 'ہجرتی' بھی ہیں بس سایۂ خدا کی طرح

میں اپنے آپ سے مصروفِ جنگ ہوں شاعرؔ
لہولہان ہے دل، دشتِ کربلا کی طرح

O

آدمی تھا، تم بنا بیٹھے خدا پیکر مجھے
میں تمہارا آئینہ تھا، کر دیا پتھر مجھے

میں نے جو کچھ بھی کہا، معنی کی صورت میں کہا
تم سمجھ بیٹھے مگر الفاظ کا دفتر مجھے

میری مٹی نے دیا تھا مجھ کو میرا رنگ روپ
ڈھالتی جاتی ہے دنیا اپنی صورت پر مجھے

میں کہ میری خاک کی لَو سے ہوا میرا ظہور
کاش ڈھونڈے کوئی میری خاک کے اندر مجھے

میرا ہر نقشِ کفِ پا صفحۂ تاریخ ہے
تم مورّخ ہو تو لکھو ہر قدم پڑھ کر مجھے

میں نے سوچا، میں نے سمجھا اور میں نے کہہ دیا
تم نے سوچا اور نہ سمجھا کہہ دیا کافر مجھے

میں ہوں اپنی روح پر لادے ہوئے 'مٹی کا قرض'
کوئی شاعر کہہ رہا ہے، کوئی پیغمبر مجھے

O

آرائشیں جدا سہی، بنیاد ایک ہے
کعبے سے مختلف نہیں پتھر کنشت کا

اب راستے میں زیست ملے یا اجل پڑے
تم سوچ کر اٹھاؤ قدم، ہم تو چل پڑے

تجدید

وقت، آوارہ ہوا کے مانند
شعلۂ جسم ہے، شبنم کی طرح
آ، مٹا دیں یہ تفاوت، یہ جمود
آ، کہ ہو پھر کسی عیسیٰ کا ورود
تو بھی مظلوم ہے مریم کی طرح
میں بھی تنہا ہوں، خدا کے مانند

اُردو اور بابائے اُردو

(ایک تصویری نظم)

جیسے آغوشِ محبت میں ہمکتی ہوئی ننھی بچی
اپنے بابا کو کسی فکر میں ڈوبا ہوا پا کر، خود بھی
کھیلتے کھیلتے چپ چاپ کسی سوچ میں کھو کر رہ جائے
اور پھر باپ کی پلکوں پہ لرزتا ہوا کوئی آنسو
اپنی بچی کے کھلے پھول سے رخسار پہ گر کر بہہ جائے

سمندر اور انسان

قلزمِ بیکراں! ترا پھیلاؤ
زندگی کے شعور کا غماز
تیری موجوں کا پر سکون بہاؤ
زندگی کے سرور کا غماز
تیرے طوفان کا اُتار چڑھاؤ
زندگی کے غرور کا غماز

سوچتا ہوں کہ تیری فطرت سے
میری فطرت ہے کتنی ہم آہنگ
تیری دنیا ہے کتنی بے پایاں
میری دنیا ہے کیسی رنگا رنگ
تو ہے کتنا وسیع اور محدود
میں ہوں کتنا وسیع، کتنا تنگ

میرے ماتھے پہ کتبۂ تقدیر
تیری موجیں ترے لیے زنجیر

ہَوا

جو دور رہ کر بھی نزدِ جاں ہے
نفس نفس میں رواں دواں ہے

ازل سے محوِ سفر ہے اب تک
حیات کی رہگزر ہے اب تک

لطیف اتنی کہ یادِ یاراں
کثیف اتنی کہ دشمنِ جاں

ہر ایک رازِ دروں کی محرم
کوئی تغیر ہو ایک عالم

ہزار انداز سے عیاں ہے
مگر ہر اِک آنکھ سے نہاں ہے

کبھی گماں ہے، کبھی یقیں ہے
کہیں یہی تو خدا نہیں ہے

تضاد

میں سوچتا ہوں
میں ایک انساں ہوں، ایک مشتِ غبار ہوں میں۔۔۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا
کہ ایک آواز سرسرائی فضا کی خاموش وسعتوں میں
میں چونک اُٹھا
پلٹ کے دیکھا
کوئی ہوائی جہاز پرواز کر رہا تھا
جو لمحہ لمحہ بلندیوں کی طرف رواں تھا
میں اُس کو تکتا رہا مسلسل

نہ جانے کب تک۔۔۔
نہ جانے اِس لمحۂ گریزاں کے تنگ دامن میں
کتنی صدیاں سمٹ گئی تھیں
نہ جانے میری نظر میں کتنے نئے اُفق جگمگائے
کتنے ہی چاند سورج اُبھر کے ڈوبے
نہ جانے وہ کون سا جہاں تھا
زمیں، کہ پیروں تلے کوئی فرشِ زر ہو جیسے
فلک، کہ سر پر ردائے آبِ گہر ہو جیسے
فضا، منوّر
ہوا، معطر
نفس نفس میں بسی ہوئی نکہتِ گُلِ تر
خلاؤں میں مشتری و زہرہ کا رقص جاری
تمام عالم پہ ہلکا ہلکا سرور طاری

نہ جانے میں کس خیال میں گم
کس ابر پارے پہ اُڑ رہا تھا
غرور سے سر بلند کر کے ہر اِک ستارے کو دیکھتا تھا

کہ ایک دلدوز چیخ گونجی فضا کی خاموش وسعتوں میں
میں چونک اُٹھا
پلٹ کے دیکھا
گلی سے اِک ہڈیوں کا ڈھانچہ گزر رہا تھا
جو چیخ کر ایک اِک سے کہتا تھا
’ایک روٹی، خدا تمہارا بھلا کرے گا‘

نوٹ: یہ نظم جولائی ۱۹۶۰ء میں اِسی عنوان سے ’ادبی دنیا‘ لاہور میں شائع ہوئی تھی۔ ’مٹی کا قرض‘ کے پہلے ایڈیشن میں اس کا عنوان ’بگولہ‘ کر دیا گیا جو مناسب نہیں تھا۔ (شاعر)

آدمی

کل بھی میں جنگل میں تھا اور آج بھی جنگل میں ہوں
کل مرے ہمسائے تھے خونی درندے، بھیڑیئے
آج انسانوں میں ہوں اور خون کے جل تھل میں ہوں
مجھ کو تہذیبوں نے آئینہ دکھایا تو کھلا
روح کا قاتل ہوں میں اور جسم کے مقتل میں ہوں

سنگ میل

میرے سینے کے دہکتے ہوئے انگارے کو
اب تو جس طرح بھی ممکن ہو بجھا دے کوئی
اپنی آنکھوں میں بھی ہوں، آنکھ سے اوجھل بھی ہوں
میں گماں ہوں کہ حقیقت ہوں، بتا دے کوئی
دھوپ چھاؤں کا یہ انداز رہے گا کب تک
مجھ کو اِس خواب کے عالم سے جگا دے کوئی

میں ہوں اِس دشتِ طلسمات کا وہ شہزادہ
جس کے سر پر ہے فلک، گنبدِ بے در کی طرح
میری منزل، مرے سینے پہ لکھی ہے لیکن
اپنی ہی راہ میں ہوں نصب، میں پتھر کی طرح

رہنما ہوں مگر اِک گام نہیں چل سکتا
ایسی اِک ضرب کہ ٹوٹے یہ مسلسل سکتہ

جواب

سورج نے جاتے جاتے بڑی تمکنت کے ساتھ
ظلمت میں ڈوبتی ہوئی دنیا پہ کی نظر
کہنے لگا کہ کون ہے اب اِس کا پاسباں
میرے سوا ہے کون زمانے کا راہبر
میں تھا تو اپنی راہ پہ تھی گامزن حیات
اب میں نہیں رہوں گا تو یہ ساری کائنات
ظلمات میں بھٹکتی پھرے گی تمام رات

سورج یہ کہہ کے جا ہی رہا تھا کہ اِک دِیا○
چپکے سے جل اُٹھا اور اُسے دیکھنے لگا

○ رابندناتھ ٹیگور کا خیال علامہ اقبال کے اس مصرعے کی روشنی میں (شاعر)
'تو شب آفریدی چراغ آفریدم'

ایک منظر۔۔۔ایک سوچ

کہکشاں کی جگمگاتی فصل لہرائی ہوئی
دور، اُفق کی اوٹ سے محوِ نظارہ ماہتاب
شب کسی اندیشۂ فردا سے کجلائی ہوئی

سوچتا تھا، یہ چمکتی فصل جب کٹ جائے گی
دامنِ مہتاب میں کھل جائیں گے چاندی کے پھول
رات کے ماتھے سے گردِ تیرگی چھٹ جائے گی

سوچتا تھا میں کہ دیکھا، رات ساری کٹ گئی
ایک سورج ناگہاں اُبھرا بصد جاہ و جلال
چاند کی دولت، سحر کے غاصبوں میں بٹ گئی
سورج اپنی کامرانی پر بہت مغرور ہے
سوچتا ہوں، اِس سحر سے شام کتنی دور ہے

یہ نظم پہلے مارشل لا پر ماہنامہ 'صبا' حیدرآباد دکن (جولائی اگست ۱۹۵۹ء) میں شائع ہوئی تھی۔

اندیشہ

سہمی سہمی کھل رہی تھی اِک کلی
میں نے پوچھا
کیا خزاں کا خوف ہے؟
جی نہیں، اِک دن خزاں تو آئے گی
پھر؟
سنا ہے۔۔۔(اُس نے چپکے سے کہا)
اِس چمن کا باغباں، گل چیں بھی ہے

سناٹا

اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے سرمایۂ ہوش
رات اِک چور کے مانند گزرتی ہے خموش

اتنا گہرا ہے اندھیرا کہ جدھر آنکھ اُٹھے
اپنی ہی کور نگاہی کا گماں ہوتا ہے
دور و نزدیک مسلّط ہے وہ غمناک سکوت
جو کسی قبرِ شکستہ میں نہاں ہوتا ہے

آسماں کوئی مجاور ہے کہ بیٹھا ہے خموش
کوئی اندیشۂ فردا ہے، نہ فکرِ غمِ دوش

کوئی بجلی، کوئی تارا، کوئی جگنو، کوئی شمع
کوئی ایسا نہیں جو نور کا عنواں بن جائے
کوئی خورشید بھی اِس شب کے تعاقب میں نہیں
کون اِس مقبرۂ زیست کی تقدیر جگائے

رات اِک چور کے مانند گزرتی ہے خموش
اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے سرمایۂ ہوش

کامریڈ حسن ناصر

(جسے شاہی قلعہ لاہور میں فیلڈ مارشل صدر ایوب خان نے قتل کروا دیا)

میری آنکھوں میں بھی آنسو اُمڈ آئے آخر
میری آنکھیں جو زمانہ ہوا اپنے آنسو
اپنے ارمانوں کی تربت پہ لٹا بیٹھی ہیں
اپنے خوابوں کے شگفتہ سے گلوں کی خوشبو
اپنے گل چیں کی عنایت پہ لٹا بیٹھی ہیں
میری آنکھوں میں بھی آنسو اُمڈ آئے آخر

میرے ہمدم، مری پلکوں پہ لرزتے ہوئے اشک
میرے دامن میں ندامت سے ٹپک جاتے ہیں
میرے ادراک و عزائم کے سرافراز ستون
تیری عظمت کے تصور سے لچک جاتے ہیں

سوچتا ہوں کہ مرے دل کا وہ شعلہ ہے کہاں
جو ہر اِک دور میں تابندہ و پرنور رہا
کوئی آندھی، کوئی طوفاں جسے گُل کر نہ سکا
کبھی فیوچک، کبھی زویا، کبھی منصور رہا

آج اخبار کی سرخی پہ نظر پڑتے ہی
میرے اندر سے کوئی مہر بہ لب چیخ پڑا
میرے جذبات کی غیرت، میرے ہونٹوں کا سکوت
میرا فن چیخ پڑا، میرا ادب چیخ پڑا

یہ زمیں حق کی پرستار ہے، باطل باطل
سینۂ حق سے صدا آتی ہے، قاتل قاتل

دھڑکا

اور کچھ تیز کرو شمع کی لو

وقت کیا جانے خبر کیا لائے
سنسناتی ہیں ہوائیں ہر سمت
پتیاں تال دیئے جاتی ہیں
رقص کرتی ہیں بلائیں ہر سمت
کس کو معلوم کہ کیا ہو جائے
سہمی سہمی سی ہے لمحات کی رو
اور کچھ تیز کرو شمع کی لو

تیرگی حدِ نظر تک ہے محیط

کوئی تارا کوئی جگنو بھی نہیں
اِک فقط برق چمک جاتی ہے
اِس اندھیرے پہ نشانہ باندھے
تیر کی طرح لپک جاتی ہے
ایسے عالم میں بھلا کیا ہو یقیں
کس طرف جائے گی دنیائے بسیط
تیرگی حد نظر تک ہے محیط

اور کچھ تیز کرو شمع کی لو

آج کی رات بہت بھاری ہے
دور تک کوئی نہیں راہِ نجات
اِس گھڑی فاصلہ و قیدِ حدود
زیست کے حق میں ہے تحقیر کی بات
موت کی ضرب بہت کاری ہے
تھم نہ جائے کہیں جذبات کی رو
اور کچھ تیز کرو شمع کی لو

مٹی کا قرض

ہم کہ مشتِ خاک ہیں
خاک کی اِملاک ہیں
خاک، جس کا نم، لہو
خاک، جس کا رم، نمو
خاک کا آہنگ، صَوت
خاک چپ ہو جائے، موت
خاک کی میزان، وقت
خاک کا وجدان، وقت
خاک کا امکاں، وجود
خاک ہی بود و نبود

ہر عمق، ہر ارتفاع
خاک کا خطِّ شعاع
خاک، بطنِ خیر و شر
خاک ہی اُمِ بشر
نقشِ دستِ آزری
خاک کی صورت گری
جلوۂ شمس و قمر
خاک کا حسنِ نظر
زندگی کا ہر شعار
خاک سے ہے مستعار

ہم کہ اپنی خاک کے
اپنی خاکِ پاک کے
آپ صورت گر بھی ہیں
بت بھی ہیں آزر بھی ہیں
خواب بھی، تعبیر بھی
رنگ بھی، تصویر بھی

لفظ بھی، آہنگ بھی
مانی و ارژنگ بھی
روپ بھی، درپن بھی ہم
دل بھی ہم، دھڑکن بھی ہم
در بھی ہم، روزن بھی ہم
تیرہ بھی، روشن بھی ہم
خاک، یہ خاکِ وطن
یہ متاعِ جان و تن
مہرباں، گھر کی طرح
ماں کی چادر کی طرح
ہم پہ جو کچھ فرض ہے
خاک ہی کا قرض ہے

لہو

(۱۹۶۵ء)

لہو جو سرحد پہ بہہ چکا ہے
لہو جو سرحد پہ بہہ رہا ہے
ہم اُس لہو کا خراج لیں گے

یہ خون، سرمایۂ وطن ہے
یہ خون، رنگِ رخِ چمن ہے
یہ خون، ہر ماں کے دل کی دھڑکن
یہ خون، ہر باپ کا بدن ہے

یہ خون، بہنوں کے سر کی چادر
یہ خون، بھائی کا بانکپن ہے
یہ خون، دلہن کا خوابِ رنگیں
یہ خون، بچّوں کا بھولپن ہے
یہ خوں، جوانی کی کج ادائی
یہ خوں، بڑھاپے کا سارا دھن ہے
یہ خون، دہقان کا پسینہ
یہ خون، ہر کھیت کی پھبن ہے
یہ خون، محنت کا آبگینہ
یہ خون، مزدور کی لگن ہے
یہ خون، افکار کا اُجالا
یہ خون، نغمہ ہے، علم و فن ہے
یہ خون، تہذیب کی امانت
یہ خون، حسنِ ہر انجمن ہے
یہ خون، سرمایۂ وطن ہے
یہ خون، سرحد پہ بہہ رہا ہے
یہ خون، ہم سب سے کہہ رہا ہے

مٹی کا قرض

ہم اُس لہو کا علم بنا لیں
سنان و سیف و قلم بنا لیں
اِسے سمجھ لیں متاعِ ہستی
اور اپنی روحوں کا غم بنا لیں
خلوص و مہر و وفا کا حاصل
نگاہ و دل کا حرم بنا لیں
خیال و خواب و عمل کی منزل
قدم کا اندازِ رم بنا لیں
وطن کو دے کر مقامِ کعبہ
اِسی کو احرام ہم بنا لیں
یہ آئینہ کر کے اور صیقل
اِسی کو اِک جام جم بنا لیں
یہ خون ماتھے پہ مَل کے نکلیں
اِسے نشانِ حشم بنا لیں
جو نقش اِس نے بنا دیا ہے
اُسی کو نقش قدم بنا لیں
برس پڑیں دشمنوں کے سر پر

وطن کو تیغِ دودم بنا لیں
ہم اِس لہو کا علم بنا لیں
وطن کے بیدار سورماؤ
اُٹھاؤ اپنا علم اُٹھاؤ

جہاں پہ کر دیں یہ آشکارا
ہمیں غلامی نہیں گوارا
کوئی اِدھر بھول کر نہ آئے
یہ دیس ہم کو ہے سب سے پیارا
یہ خاک وردی ہے ہر جری کی
یہ خون، پرچم ہے اب ہمارا
یہی ہلال، ایک تیغ بھی ہے
یہی ستارہ ہے اِک شرارا
جو ہم پہ یلغار کرنے آئے
وہ آ نہ پائے گا یوں دوبارا
حصار کھینچیں گی یہ چٹانیں
بڑھے گا راوی کا تیز دھارا

وہ آگ برسے گی آسماں سے
زمیں پہ دوزخ کا ہو نظارا
ہر ایک للکار، صور ہو گی
دھماکا ہو گا، ہر ایک نعرا
وہ رن پڑے گا، وہ جنگ ہو گی
کہ بھاگنے کا نہ ہو گا یارا
جہاں پہ کر دیں یہ آشکارا
ہم اُس لہو کا خراج لیں گے

لہو جو سرحد پہ بہہ چکا ہے
لہو جو سرحد پہ بہہ رہا ہے

مارچ پاسٹ

(۱۹۷۱ء)

سپاہی جنگ پر چلے ہیں کتنی آن بان سے
بدن پہ وردیاں سجائے کس عجیب شان سے
تڑپ کے دیکھتی ہے صبح جھک کے آسمان سے
جوان جا رہے ہیں آج، آپ اپنی جان سے
نبرد آزما ہے کون، پردۂ مجاز میں
نہ جانے کتنے راز ہیں نہاں اِس ایک راز میں

ہوائیں چپ، فضائیں چپ، زمین و آسمان چپ
خلا میں تک رہا ہے آنکھ اُٹھائے ہر مکان چپ
ہجوم در ہجوم لوگ اور ہر زبان چپ
ہر ایک سمت حشر کا سماں مگر ہیں کان چپ
کسے خبر، سنور رہے ہیں یا بکھر رہے ہیں ہم
بڑے عجیب امتحان سے گزر رہے ہیں ہم

یہ جنگ کس کی جنگ ہے، خود اِس وطن سے پوچھیے
وطن سے دور 'دوستوں کی انجمن' سے پوچھیے
جبیں جبیں پہ مضطرب، شکن شکن سے پوچھیے
خدا بنا ہوا ہے جو اُس 'اہرمن' سے پوچھیے
ہوائیں چیختی پھریں، انارکی، انارکی
یہ زرگری کی جنگ ہے، یہ جنگ اقتدار کی

○ مشرقی پاکستان پر جنرل یحییٰ خان کی فوجی یلغار، جس کی بنا پر وہاں علیحدگی کی تحریک چلی اور ۱۹۷۲ء میں 'بنگلہ دیش' بن گیا۔ (شاعر)

لمحۂ فکر

تم بھی فریب خوردہ ہو ہم بھی تھے بے خبر
دونوں ہی باشعور نہ تھے قصہ مختصر
تاریخ ہر قدم پہ دکھاتی تھی آئینہ
تاریخ کا مذاق اُڑاتے تھے دیدہ ور
اب زخمِ سر کھلا تو ملا سنگ کا سراغ
پتھر سے بے نیاز تھا ہر ایک شیشہ گر

پتھر، کہ حرف و صوت بھی نقش و نگار بھی
پتھر، کہ رنگِ رخ بھی، لہو کا خمار بھی
پتھر، بلند و پست کا خود ساختہ نظام
پتھر، زمیں کا غم بھی، فلک کا وقار بھی
پتھر، خدا کے نام پہ تکبیرِ ناخدا
پتھر ہی سنگِ میل بھی، سنگِ مزار بھی

ہر اِک قدم پہ سنگ کو نسبت تھی سر کے ساتھ
اور سائے کی تلاش میں ہم تھے شجر کے ساتھ
سوچا نہ تھا کہ سایہ ہے سورج کا ہم سفر
سورج مگر نہیں ہے کسی ہم سفر کے ساتھ
خوابوں کی دھوپ چھاؤں میں افلاک کے تلے
تھا رقصِ گردباد، نہایت ہنر کے ساتھ

یہ آگہی کا نور کہ خیرہ ہے چشمِ دل
احساسِ تیرگی کہ ہے تابندگی خجل

دل ہے لہو لہو تو جگر داغ داغ ہے
افکار گرد گرد ہیں، جذبات مشتعل
گردوں دھواں دھواں ہے فضا ہے شرر شرر
سَر ہیں ہَوا کے دوش پہ اور روح پا بہ گِل

اِس معرضِ فنا میں ذرا کل کی سوچیے
جینے کی آرزو میں نہ مقتل کی سوچیے
'سومل' ٥ کا پیرہن تو نظر کا فریب تھا
'رانو' کی فکر کیجیے، 'مومل' کی سوچیے
مالیر، 'ماروی' کا رہے گا سدا مگر
صدیوں کے ارتباط میں اِس پَل کی سوچیے

٥ سندھ کی عوامی کہانیوں کے مختلف کردار

پسِ دیوارِ حرف

(لسانی فسادات پر)

کس کو قاتل کہوں، کس کو بسمل کہوں
یہ مرا دوست ہے، وہ مرا بھائی ہے
اپنی تاریخ سے گر اِسے پیار ہے
اپنی تہذیب کا وہ بھی شیدائی ہے
بے زبانی کا ہے یہ بھی مارا ہوا
وہ بھی اپنی زباں کا تمنائی ہے

میں کہ دونوں ہی میرے لیے جان و دل
میری نظروں میں دونوں ہی معصوم ہیں
وقت کا جبر کہیے کہ تاریخ کا
وہ بھی مظلوم تھے، یہ بھی مظلوم ہیں
وہ کہ اُن کے سروں پر ہے مٹی کا قرض
یہ زمیں کی رفاقت سے محروم ہیں

آسماں لاکھ سر پر ہو سایہ فگن
زندگی ماسوائے زمیں کچھ نہیں
گر یقیں ہو تو ہر اِک تصور حسیں
اور گماں ہو تو دنیا و دیں کچھ نہیں
جس کا ماضی نہ ہو، اُس کا فردا ہی کیا
دور تک اِک خلا ہے، کہیں کچھ نہیں

ایسے عالم میں درکِ حقیقت ہو کیا
فکر گنجلک، نظر تنگ، دل بدگماں
حرفِ حق، ایک پیرایۂ مکر و فن
مصلحت، معنی و لفظ کے درمیاں
عکس در عکس افسونِ آئینہ ساز
شکل در شکل بہروپیے مہرباں

کون جانے پس آئینہ کون تھا
کون سوچے کہ پیشِ نظر کون ہے
روپ بہروپ میں ربط پنہاں ہے کیا

دستِ پرکار سے باخبر کون ہے
شیشہ و سنگ میں عہد و پیماں ہیں کیا
سنگ زن کون ہے، شیشہ گر کون ہے

سوچتا ہوں تو چپ چاپ روتا ہوں میں
خود فریبی نے پہنچا دیا ہے کہاں
کعبۂ فکر ہیں صرف لفظوں کے بُت
آنکھ اُوجھل، معانی کی پہنائیاں
گرد کی طرح بکھرا ہوا فرد فرد
بادلوں کی طرح بے جہت کارواں

خواب میں طے ہوا زندگی کا سفر
خواب ہی میں جلے منزلوں کے چراغ
خواب ہی میں ہوا وہمِ تعبیرِ خواب
خواب ہی میں فروزاں ہوئے دل کے داغ
خواب در خواب، بے خوابیِ چشمِ وا
خواب ٹوٹے تو ہاتھ آئے اپنا سراغ

آج وا ہو گئے زخمِ لب تو کھلا
سینہ در سینہ ہر زخم ناسور تھا
بادۂ ناب کا تو فقط نام تھا
ہر بدن نشۂ زہر سے چور تھا
قرب کے ہر تصور میں تھے فاصلے
آدمی آدمی سے بہت دور تھا

اب کہ دامانِ یوسف کے ہر چاک سے
آئینہ ہو گیا ہر فریبِ کہن
ضربتِ تیشہ کی زد پہ ہے بے ستوں
روبرو آگئے خسرو و کوہکن
'بوذری' اپنی منزل ہے یا زرگری
فیصلہ چاہتی ہے زمینِ وطن

○ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے دوران صوبائی اسمبلی میں 'سندھی زبان' کو صوبہ سندھ کی 'سرکاری زبان' بنانے کا بل پاس کیا گیا جس کی بنا پر روزنامہ 'جنگ' میں رئیس امروہوی کی ایک نظم شائع ہوئی

'اُردو کا جنازہ ہے بڑی دھوم سے نکلے'

کراچی میں لسانی فسادات اسی 'دھوم' کا نتیجہ تھے۔ (شاعر)

چاند۔۔۔خورشید کا رازداں

(تحریکِ پاکستان کی روشنی میں)

میں اندھیرے میں تھا
دور، گردوں پہ بکھری ہوئی کہکشاں
روشنی کے صحیفے کی تفسیر
نور کی آیتیں
تیرگی میں چمکتا ہوا حرف حرف
مجھ کو سورج کا پیغام دیتا رہا
اور میں شب نورد
صبح کی آس میں
سالہا سال چلتا رہا
اِک چراغ سرِ رہگزر کی طرح
تند موجِ ہوا میں بھی جلتا رہا

میں اندھیرے میں تھا
دور، گردوں میں بکھری ہوئی کہکشاں
دھیرے دھیرے سمٹنے لگی
روشنی کے صحیفے کی تکریم کے نام پر
حسنِ تنظیم و آدابِ تقویم کے نام پر
منتشر کہکشاں
اپنے خورشید کی منتظر کہکشاں
دھیرے دھیرے سمٹنے لگی
اور جب ہر طرف سے اندھیرے کی یورش بڑھی
کہکشاں، نور کی ڈھال میں ڈھل گئی
چاند میں ڈھل گئی

چاند، خورشید کا راز داں
چاند، خورشید کا ترجماں
اور خورشید، اِس چاند کے روپ میں
میرے خوابوں کے تاریک اُفق پر چمکنے لگا
میرے خوابوں کے تاریک اُفق پر چمکتا رہا

میں اندھیرے میں تھا
چاند اُبھرا تو بادل اُمڈنے لگے
بادلوں اور ستاروں کی سرگوشیاں۔۔۔
چاند کے گرد اِک جال بننے لگیں
ایک ہالہ بنا
اور چاند اپنی ہی روشنی کے حصاروں میں گھرنے لگا
دائرہ تنگ ہونے لگا
دائرہ تنگ سے تنگ تر ہو گیا
اور چاند اپنی ہی روشنی کی چکاچوند میں کھو گیا
روشنی کے صحیفے کی تفسیر
نور کی آیتیں
تیرگی میں چمکتا ہوا حرف حرف
منتشر ہو گیا
اور میں، شب نورد
میں، چراغِ سرِ رہگزر
دور، تیرہ فضاؤں میں اب
صرف اِک چاند سا مقبرہ دیکھتا ہوں

وفاداری بہ شرطِ استواری

اے صبحِ وطن ہم ترے سورج کی لگن میں
جلتے رہے شب بھر مہ و انجم کی طرح چپ
سہتے رہے ہر ضربتِ سنگِ غمِ ایّام
اشکِ سرِمژگاں کے تلاطم کی طرح چپ
کہتے رہے افسانۂ دل بادِ صبا سے
غنچوں کے دہن بستہ تکلم کی طرح چپ
تکتے رہے حسرت سے ہر اِک ابرِ رواں کو
پھولوں کے خزاں دیدہ تبسم کی طرح چپ

آدابِ غمِ عشق کا احساس کیا ہے
ہر حال میں اِس دل نے ترا پاس کیا ہے

اے صبحِ وطن تو نے ہم آشفتہ سروں کو
گل ریز بھی دیکھا ہے، شرر بار بھی دیکھا
فرہاد کے مانند کبھی تیشہ بکف بھی
مجنوں کی طرح خاکِ رہِ یار بھی دیکھا
سقراط کے مانند کبھی زہر بہ ساغر
عیسیٰ کی طرح ہم کو سرِ دار بھی دیکھا
منصور کے مانند کبھی کشتۂ حق بھی
ناکردہ گناہی کا سزاوار بھی دیکھا

تکریم کی ہر دور میں پندار جنوں کی
توہین نہ ہونے دی کبھی سوزِ دروں کی

اے صبح وطن اب بھی ہے یہ عہد ہمارا
ہم عہد وفا، خون سے تحریر کریں گے

وہ خواب کہ جو تشنۂ تعبیر ہے اب تک
اُس خواب کو شرمندۂ تعبیر کریں گے
جو دشتِ تخیل میں ہے آوارۂ منزل
اُس آہوئے رم خوردہ کو زنجیر کریں گے
یہ شعلۂ مثبت جو فروزاں ہے تو اِک دن
ہر ذرّے کو خورشید کی تصویر کریں گے

اے صبحِ وطن ہم ترے سورج کی لگن میں
تاحدِ نظر پھول کھلا دیں گے چمن میں

بادل

(پاکستان میں ایک طوفانی بارش کے بعد)

دھرتی اپنا خون جلا کر تجھ کو امر بنائے
موجِ ہوا شانوں پہ اُٹھا کر جگ جگ تجھے اُڑائے

تو مچلے تو چاندنی تجھ سے آنکھ مچولی کھیلے
تو روئے تو دھرتی تیرے آنسو خود پی جائے

تجھ کو اُڑتا دیکھ کے ہر دل اُڑنے کو پر تولے
روح میں ٹھنڈک پھیلتی جائے تیرے سائے سائے

دھوپ میں جلتی دھرتی تجھ کو سر کا آنچل سمجھے
تجھ کو خدا کی رحمت کہہ کر تیرا مان بڑھائے

ڈالی ڈالی ہاتھ اُٹھا کر، رب سے دعائیں مانگے
تو سورج کے تخت پہ بیٹھا، اونچا اُڑتا جائے

O

دھرتی تو اے بادل تجھ سے اتنا پیار جتائے
اور تو اپنی فلک نشینی پر کیا کیا اِترائے

قریہ و شہر ڈبوتا جائے ساگر کی سازش سے
سورج سے انگارے لے کر دھرتی پر برسائے

کہساروں کے تاج اُتارے، پتھر پر دے مارے
دریاؤں کا زہر نکالے، کھیتوں میں پھیلائے

تیز ہوا کے شہپر لے کر دشت و جبل پر دوڑے
اِک خونخوار درندہ بن کر شہروں پر غرائے

تیری بلندی ہی غماز ہے تیرے ہلکے پن کی
دھرتی تجھ سے دہائی مانگے، اور تو ہنستا جائے

O

اے بادل کم ظرف، ترا یہ وار نہ خالی جائے
ہم بھی ہیں دھرتی کے بیٹے، اور کوئی انیّائے

ہم بھی سینہ سپر ہیں ، دیکھیں، تجھ میں کتنا دم ہے
جسموں کی دیوار کھڑی ہے اپنے پاؤں جمائے

ہم اپنی دھرتی کی خاطر، ساگر کو پی جائیں
یہ سیلاب چٹانوں سے ٹکراتا ہے، ٹکرائے

روز ازل سے جاری ہے فطرت سے ہماری جنگ
اُس کو ہر ہر گام پچھاڑیں، جو بھی مقابل آئے

کل اِن کھیتوں کھلیانوں پر کاہکشاں اُترے گی
اوجِ فلک پر رشک کریں گے، دھرتی کے ہمسائے

شاہ بھٹائی

اے بادِ صبا تیرا مہکتا ہوا دامن
اِک شاعرِ درویش کے نغموں کا امیں ہے
ہے تیری ہر اِک موج میں وہ خاکِ کفِ پا
جس خاک سے روشن مرے گردوں کی جبیں ہے
تو نے اُسے دیکھا ہے اُسے پیار کیا ہے
وہ شخص کہ جو سندھ کے ہر دل میں مکیں ہے

اے چاند تری چھاؤں میں سوئی ہیں وہ آنکھیں
جو آنکھ تھی خورشید جمالوں کا نشیمن

اُس ذہن سے پائی تری کرنوں نے تب و تاب
جو ذہن تھا پرنور خیالوں کا نشیمن
اُس دل سے عبارت ہے ترا حسن جہانگیر
جو دل تھا محبت کے اُجالوں کا نشیمن

اے وادیٔ مہران، یہ اعزاز مبارک
سویا ہے تری گود میں وہ شاعرِ بینا
وہ جس کا ہر اِک نغمہ تھا اِک نغمۂ فردوس
وہ جس کا ہر اِک شعر تھا اِک حسن کی دنیا
وہ جس کا ہر افسانہ تھا اِک زندہ حقیقت
وہ جس کا ہر اِک لفظ تھا، آئینۂ فردا

اے شاہ، اجازت ہو تو یہ خاک اُٹھا لوں
اِس خاک کو چوموں، اِسے آنکھوں سے لگا لوں

○ سندھ کے صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی

بابائے اُردو

وہ اِک چراغ کہ روشن ہے انجمن کے لیے
وہ اِک دماغ کہ مشعل ہے اہلِ فن کے لیے
وہ جل رہا ہے کہ اوروں کو روشنی مل جائے

دلوں کی آگ، نگاہوں کا نور زندہ رہے
خیال و خواب کی راہوں کا نور زندہ رہے
لبوں پہ حرفِ تمنا کے پھول ہنستے رہیں
جہانِ دل کے یہ ننھے رسول ہنستے رہیں
مگر یہ غم کہ دلوں کو زباں نصیب نہیں
خیال و خواب کو حسنِ بیاں نصیب نہیں

لبوں پہ کاغذی پھولوں کی مسکراہٹ ہے
نظر میں جھوٹے نگینوں کی جگمگاہٹ ہے
سکوتِ درد کو اذنِ فغاں نصیب نہیں
یہ وہ زمیں ہے جسے آسماں نصیب نہیں
میں سوچتا ہوں کہ وہ ہے چراغِ آخر شب
اور اُس کی بزم کا ہر نغمہ گر ہے مہر بہ لب
نہ جانے وقت کی تقدیر میں لکھا کیا ہے
چراغِ آخرِ شب کی حیات کا کیا ہے
خدا کرے کہ اُسے میری زندگی مل جائے

○ پاکستان کے دستور کے مطابق 'اردو' ہماری قومی زبان ہے۔ مگر آج تک وہ نہ سرکاری زبان بنائی گئی نہ تعلیمی۔ (شاعر)

ماجد، میرا دوست

اپنے ہاتھوں کیسے اپنے ماجد کو مرحوم لکھوں
کیسے ایک دھڑکتے دل کو دھڑکن سے محروم لکھوں
جب بھی سوچوں، دل بھر آئے، آنکھوں میں وہ پھر پھر جائے؟
ایسے زندہ شخص کو کیسے اِک نقشِ موہوم لکھوں
اپنے ہاتھوں کیسے اپنے ماجد کو مرحوم لکھوں

ماجد وہ فنکار تھا جس پر مجھ کو بھی تھا ناز بہت
دل میں اُتر کر رہ جاتا تھا، اُس کا ہر انداز بہت
ہنستا چہرہ، دلکش باتیں، جھوٹا غصہ، سچا پیار
ایسا دوست کہاں سے لاؤں، ویسے دوست نواز بہت
ماجد وہ فنکار تھا جس پر مجھ کو بھی تھا ناز بہت

سوچ رہا ہوں، اچھے لوگوں سے فطرت کو بیر ہے کیوں
عرصۂ خیر و شر میں آخر، راندۂ ہستی خیر ہے کیوں
فنکاروں کے خونِ جگر سے ہوتی ہے تخلیق جمال
پھر اِن فنکاروں کو جہاں میں، کم کم اِذنِ سیر ہے کیوں
سوچ رہا ہوں، اچھے لوگوں سے فطرت کو بیر ہے کیوں

فطرت کا اندازِ رقابت، فطرت کا غماز بھی ہے
تخلیقِ آواز میں پنہاں، رازِ شکست ساز بھی ہے
شمع بجھا کر موجِ ہوا، لہرا کے گزر تو جاتی ہے
موجِ ہوا کیا جانے، فطرت آپ سپر انداز بھی ہے
فطرت کا اندازِ رقابت، فطرت کا غماز بھی ہے

ماجد جل کر بجھ تو گیا ہے، شعلۂ مستعجل کی طرح
اُس کی صورت ہے نظروں میں، حسنِ مہِ کامل کی طرح
اُس کا فن، اُس کی تحریریں، اُس کا ہر اندازِ بیاں
وقت کے سینے میں ہے فروزاں، شمع سوز دل کی طرح
ماجد جل کر بجھ تو گیا ہے، شعلۂ مستعجل کی طرح

اے دل رولے، یا چپ ہولے، اور کرے گا بھی تو کیا
اُس کے غم کے آگے تیری آہیں کیا ہیں، آنسو کیا
یہ وہ غم ہے جس کے لیے الفاظ کا دامن بھی ہے تنگ
اِن لفظوں سے نکلیں گے، تسکین دل کے پہلو کیا
اے دل رولے، یا چپ ہولے، اور کرے گا بھی تو کیا

○ عبدالماجد۔ ریڈیو پاکستان کراچی کا ایک ہم عصر اور بڑا صداکار (ایک اسٹاف آرٹسٹ) شاعر

ٹھہرا ہوا لمحہ

آج بھی گرچہ غمِ دہر کا عالم ہے وہی
دلِ سوزاں ہے وہی، دیدۂ پرنم ہے وہی
روح میں گھلتے ہوئے زہر کا عالم ہے وہی

فکر چپ چپ ہے، پریشان نہیں ہے لیکن
ذہن پر بار نہیں، آج کا ڈھلتا ہوا دن
شام خاموش ہے، ویران نہیں ہے لیکن

وقت نے کس لیے بے وجہ عنایت کی ہے
میرے ہونٹوں کو تبسم کی اجازت دی ہے
ایک ناگفتہ تمنا کی حمایت کی ہے

دل کا اصرار بہت دور نکل جاؤں کہیں
کوئی وادیٔ سمن پوش ہو اور میری جبیں
کسی گل میں نہ سہی، خار میں ڈھل جاؤں کہیں

لاکھ پہرے ہوں مگر دل پہ کوئی قید نہیں
اِس چمن میں کوئی صیاد نہیں صید نہیں
زندگی کی اِسی منزل پہ کوئی قید نہیں

میں کہاں اور کوئی بار گہہِ ناز، کہاں
رہ گئی چیختی ماحول کی زنجیرِ گراں
لے کے آئی مجھے تخئیل کی پرواز، کہاں

ایسا عالم ہے کہ نظروں میں سماتا ہی نہیں
اور حدِ نگہِ شوق سے جاتا بھی نہیں
اتنی روشن ہے نظر، کچھ نظر آتا ہی نہیں

میرا احساس دروں ہے کہ فضا ہے مخمور
ذرہ ذرہ متبسم ہے ہر اِک شے مسرور
نشہ و کیف سے ہو جیسے یہ دنیا معمور

جانے کس قاف کی وادی میں نکل آیا ہوں
پاؤں دھرتی پہ ہیں اور آپ اُڑا جاتا ہوں
ہر نظر مجھ پہ ہے، کس کس کا میں سرمایہ ہوں

سبزہ تکتا ہے، اُٹھائے ہوئے بھیگی پلکیں
ندیاں ہیں کہ بچھائے ہوئے رہ میں آنکھیں
اور گھٹائیں کہ مئے ناب کے ساغر چھلکیں

شبنم اُٹھ کر میرے پیروں سے چمٹ جاتی ہے
ایک اِک چیز قدم بوسی کو بڑھ آتی ہے
بانہیں پھیلا کے ہوا مجھ سے لپٹ جاتی ہے

کس طرف جاؤں، ہر اِک سمت، بلاتی ہے مجھے
ہر طرف زیست، نیا رنگ دکھاتی ہے مجھے
اور مری فکر، کہ اِک شمع جلے، ایک بجھے

میں ہی کچھ کھویا ہوا ہوں کہ فضا گم سم ہے
جانے کس خواب حسیں میں مری دنیا گم ہے
دل کی دھڑکن ہے، دھڑکنے کی صدا گم سم ہے

کس کی آمد ہے، جو یوں موجِ ہوا رقص میں ہے
لہریئے بنتے ہیں، زنجیر کے حلقے جیسے
اور مرا دل ہے کہ زنجیر بہ پا رقص میں ہے

یک بہ یک تیز ہوا، رقصِ مئے جامِ خیال
اور پھر آپ اُلجھ سا گیا تخئیل کا جال
اور پھر ٹوٹ گیا، دائرۂ دامِ خیال

پھر اندھیرا ہے وہی، دہر کا عالم ہے وہی
دلِ سوزاں ہے وہی، دیدۂ پُرنم ہے وہی
روح میں گھلتے ہوئے زہر کا عالم ہے وہی

تشنگی کا سفر

ایک چھناکا سا ہوا
وقت یوں ٹوٹ کے بکھرا کہ اُفق تا بہ اُفق
کہکشاں پھیل گئی
ہر ستارہ مرا آئینہ ہوا
اور ہر آئینہ گزرے ہوئے لمحات کی تصویر بنا

ایک لمحہ
وہ سیہ رات میں اِک روزنِ در
اور اُس روزنِ در میں کوئی دزدیدہ نگہ
اور دزدیدہ نگاہوں میں وہ اُجلا پیکر
چاندنی جیسے مجسم ہو جائے

ایک لمحہ
وہ سیہ آنکھوں میں اِک نور کی لہر
اور اُس لہر میں اِک پیاس، سمندر کی طلب
اور اُس پیاس کی ناگفتہ تمناؤں میں خاموش سا مہر
کاش دل، آنکھ کا محرم ہو جائے

ایک لمحہ
وہ تعارف، وہ ملاقات، وہ اِک بات جو افسانہ بنی
دل نے آنکھوں کی سنی، آنکھوں نے دل پہچانا
حجلۂ خواب کی ہر شب، شبِ پیمانہ بنی
ایک حسرت کہ وصالِ گل و شبنم ہو جائے

ایک لمحہ
وہ سفر، منزلِ نایافت کا بے نام سفر
حسرتِ قرب مگر فاصلۂ جسم کے ساتھ
روح سرشار بہ صد تشنگیٔ قلب و نظر
سائے میں سایہ کچھ اِس طرح سے مدغم ہو جائے

ایک لمحہ

وہ تمناؤں کے صحرا کے بگولے، وہ سراب
حسرتِ لمس میں بیدار لہو کی گردش
ٹوٹتے تاروں کی چھاؤں میں سلگتی ہوئی تنہائی کا خاموش عذاب
آرزو، آگ یہ کم ہو جائے

ایک لمحہ

وہ مہ و سال کے فرسنگ میں اِک سایۂ ابرِ گزراں
سایۂ ابر میں سمٹے ہوئے دلِ محوِ سفر
لرزشِ لب میں چٹکتے ہوئے غنچوں کا سماں
کاش ابرِ گزراں، ابرِ کرم ہو جائے

ایک لمحہ

وہ نیا نام، نئے عہد کا پیمان نیا
دور رہ کر بھی سدا قرب، سدا پیار کے خواب
روح کے روح میں کھو جانے کا امکان نیا
جسم یوں جسم میں ضم ہو جائے

آج ہر لمحہ مرے خواب میں بیدار رہا
مجھ سے ہر قرضِ گزشتہ کا طلب گار رہا
دل سے دل برسرِ پیکار رہا
اِک چھناکا سا ہوا
وقت یوں ٹوٹ کے بکھرا کہ اُفق تا بہ اُفق
کہکشاں پھیل گئی
ہر ستارہ مرا آئینہ ہوا
اور ہر آئینہ گزرے ہوئے لمحات کی تصویر بنا
میری تقدیر بنا

میری تقدیر کہ پتھر وہ پگھلتا ہی نہیں
میرا آئینہ مرے عکس میں ڈھلتا ہی نہیں

اَن کہی

تجھ کو معلوم نہیں، تجھ کو بھلا کیا معلوم

تیرے چہرے کے یہ سادہ سے اچھوتے سے نقوش
میری تخئیل کو کیا رنگ عطا کرتے ہیں
تیری زلفیں، تری آنکھیں، ترے عارض، ترے ہونٹ
کیسی اَن جانی سی، معصوم خطا کرتے ہیں

تیرے قامت کا لچکتا ہوا مغرور تناؤ
جیسے پھولوں سے لدی شاخ ہوا میں لہرائے
وہ چھلکتے ہوئے ساغر سی جوانی، وہ بدن
جیسے شعلہ سا نگاہوں میں لپک کر رہ جائے

خلوتِ بزم ہو یا جلوتِ تنہائی ہو
تیرا پیکر مری نظروں میں اُبھر آتا ہے
کوئی ساعت ہو، کوئی فکر ہو، کوئی ماحول
مجھ کو ہر سمت، ترا حسن نظر آتا ہے

چلتے چلتے جو قدم آپ ٹھٹک جاتے ہیں
سوچتا ہوں کہ کہیں تو نے پکارا تو نہیں
گم سی ہو جاتی ہیں نظریں تو خیال آتا ہے
اِس میں پنہاں تری آنکھوں کا اشارہ تو نہیں

دھوپ میں سایہ بھی ہوتا ہے گریزاں جس دم
تیری زلفیں مرے شانوں پہ بکھر جاتی ہیں
تھک کے جب سر کسی پتھر پہ ٹکا دیتا ہوں
تیری باہیں مری گردن میں اُتر جاتی ہیں

آنکھ لگتی ہے تو دل کو یہ گماں ہوتا ہے
سرِ بالیں کوئی بیٹھا ہے بڑے پیار کے ساتھ

میرے بکھرے ہوئے اُلجھے ہوئے بالوں میں کوئی
انگلیاں پھیرتا جاتا ہے بڑے پیار کے ساتھ

جانے کیوں تجھ سے دلِ زار کو اتنی ہے لگن
کیسی کیسی نہ تمناؤں کی تمہید ہے تُو
دن میں تو اِک شب مہتاب ہے میری خاطر
سرد راتوں میں مرے واسطے خورشید ہے تُو

اپنی دیوانگیء شوق پہ ہنستا بھی ہوں میں
اور پھر اپنے خیالات میں کھو جاتا ہوں
تجھ کو اپنانے کی ہمت ہے نہ کھو دینے کا ظرف
کبھی ہنستے کبھی روتے ہوئے سو جاتا ہوں

کس کو معلوم مرے خوابوں کی تعبیر ہے کیا
کون جانے کہ مرے غم کی حقیقت کیا ہے
میں سمجھ لوں بھی اگر اِس کو محبت کا جنوں
تجھ کو اِس عشقِ جنوں خیز سے نسبت کیا ہے

تجھ کو معلوم نہیں، تجھ کو نہ ہو گا معلوم

تیرے چہرے کے یہ سادہ سے اچھوتے سے نقوش
میری تخئیل کو کیا رنگ عطا کرتے ہیں
تیری زلفیں، تیری آنکھیں، ترے عارض، ترے ہونٹ
کیسی اَن جانی سی، معصوم خطا کرتے ہیں

پَرتَو

جب بھی دیکھا ہے اُسے دل نے یہ محسوس کیا
جیسے میرے سحر و شام کا محور ہے یہی
میری تخیّل کے آزر نے تراشا ہے جسے
میرے خوابوں کا وہ بے نام سا پیکر ہے یہی

کوئی خلوت ہو کہ جلوت، وہ کسی بزم میں ہو
مجھ کو ہر رنگ میں دلدار نظر آئی ہے
کوئی عالم ہو، کوئی حال ہو میرا، لیکن
وہ مجھے میری طلب گار نظر آئی ہے

اُس کی آنکھوں کی وہ معصوم سی دزدیدہ چمک
کتنے ناگفتہ فسانوں کی ہے تمہید نہ پوچھ
اُس کے گل رنگ لبوں کا وہ تبسم وہ حجاب
کس تمنا کی ہے، بے ساختہ تائید نہ پوچھ

اُس کے اندازِ تکلم کی وہ محتاط روش
کس نوازش کی ہے غماز، کوئی کیا جانے
پاس رہ کر بھی، وہ کچھ دور ہی رہنے کی ادا
کس رفاقت کا ہے آغاز، کوئی کیا جانے

اتنا مانوس ہے اُس کا ہر اِک انداز کہ دل
اُس کی ہر بات کا افسانہ بنا لیتا ہے
اُس کے ترشے ہوئے پیکر سے چرا کر کچھ رنگ
اپنے خوابوں کا صنم خانہ سجا لیتا ہے

جانے اِس حسنِ تصور کی حقیقت کیا ہے
جانے اِن خوابوں کی قسمت میں سحر ہے کہ نہیں

جانے وہ کون ہے، میں نے اُسے سمجھا کیا ہے
جانے اُس کو بھی مرے دل کی خبر ہے کہ نہیں

کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ حسنِ دلدار
میری تخئیل کے پَرتَو کے سوا کچھ بھی نہ ہو
اضطراب اور سکوں کی یہ کشاکش یہ ستیز
خود فریبی کی تگ و دَو کے سوا کچھ بھی نہ ہو

تذبذب

دیدۂ نم، دلِ آشفتہ بخوں کی توہین
شکوۂ غم، تپشِ جذبِ دروں کی توہین
دامنِ چاک، شعورِ غم دل کی تحقیر
پاسِ اِدراک، تقاضائے جنوں کی توہین

دل کو آزادِ رسومات کروں یا نہ کروں

آج وہ کیفیتِ غم ہے کہ جی جانتا ہے
دل میں سوزاں وہ جہنم ہے کہ جی جانتا ہے
گرچہ آئینہ در آئینہ ہے ہر سُو رخِ دوست
ایسا تنہائی کا عالم ہے کہ جی جانتا ہے

نذر اشکوں کی یہ سوغات کروں یا نہ کروں

کیسی گمبھیر اُداسی ہے فضا پر طاری
کتنی سنسان نظر آتی ہے دنیا ساری
ذہن ساکت، نظر آوارہ، سخن بے مفہوم
کس کو معلوم یہ لمحات ہیں کتنے بھاری

تجھ سے منسوب یہ لمحات کروں یا نہ کروں

اب کہ یہ دہر، بجز حدِ نظر، کچھ بھی نہیں
اب کہ یہ زیست، بجز دردِ جگر، کچھ بھی نہیں
اب کہ ہر صبح ہے اِک شعلۂ بے دوُد کا نام
اب کہ ہر شام، بجز دیدۂ تر، کچھ بھی نہیں

اب بھی میں دل کی مدارات کروں یا نہ کروں

بہروپ

اِک مدت سے اِک عہد وفا
سینے سے لگائے پھرتا ہوں
اِک مدت سے اِک دولتِ غم
دنیا سے چھپائے پھرتا ہوں

مری آنکھوں میں کوئی اشک تو کیا
اِک آہِ زیرِ لب بھی نہیں
کوئی خلوت ہو کوئی جلوت ہو
مرا دل ہے کہیں اور میں ہوں کہیں

ہنستا ہوں کہ ویراں آنکھوں سے
کوئی راز نہ افشا ہو جائے
گاتا ہوں کہ چپ چپ رہنے سے
غمِ عشق نہ رسوا ہو جائے

دل چیختا رہتا ہے لیکن
میں ہنستا ہنساتا رہتا ہوں
اِک مٹی کے مادھو کی طرح
دنیا سے نبھاتا رہتا ہوں

خلاء

خود فریبی کا اِک بہانہ تھا
آج اُس کا فسوں بھی ٹوٹ گیا
آج کوئی نہیں ہے دور و قریب
آج ہر ایک ساتھ چھوٹ گیا
چند آنسو تھے بہہ گئے وہ بھی
دل میں اِک آبلہ تھا پھوٹ گیا

اب کوئی صبح ہے نہ کوئی شام
روشنی ہے نہ تیرگی ہے کہیں
اُس کا غم تھا تو کتنے غم تھے عزیز
وہ نہیں ہے تو آسماں نہ زمیں
ہر طرف ایک ہُو کا عالم ہے
سوچتا ہوں کہ میں بھی ہوں کہ نہیں

کلفٹن

کلفٹن، یہ شہرِ کراچی کا ساحل
یہ عشرت گہہِ وحشتِ دیدہ و دل
ہواؤں میں کیفیتِ بادہ پنہاں
فضا میں جمالِ رُخِ سادہ پنہاں
ہر اِک موج جیسے کوئی زلف پرخم
سنکتی ہواؤں میں کھل جائے اِک دم

تھکا ہارا آہستہ رفتار سورج
یہ خود سوز سورج، خود آزار سورج
سمندر سے اِک پل کو کیا مل گیا ہے
سمندر کا دل پھول سا کھل گیا ہے

ذرا دور اِک سمت، گم سم چٹانیں
سناتی ہوئی اَن کہی داستانیں
کنارے پہ چپ چاپ نظریں جمائے
خدا جانے کیا آس دل سے لگائے
ہزاروں برس سے یونہی ہر گھڑی ہیں
سمندر کے طوفاں کی زد میں کھڑی ہیں

بہت دور جا کر کوئی رازِ پنہاں
سمندر سے کہتا ہوا چرخِ گرداں
بہ احساسِ پستی جو کچھ جھک گیا ہے
بہ پاسِ ادب، بحر بھی رُک گیا ہے

یہ منظر، یہ حسنِ نظر کا فسانہ
یہ دنیا، یہ فطرت کا آئینہ خانہ
یہاں کون کس کے لیے نوحہ گر ہے
کسی تودۂ ریگ کو کیا خبر ہے

متوسط طبقہ

یہ زلفِ پریشاں بھی، بڑی چیز ہے ہمدم
اِس زیست کے صحرا میں جہاں ریت ہے، لؤ ہے
جس سمت نظر کیجیے، اِک عالمِ ہُو ہے
اِک سائے کا امکاں بھی، بڑی چیز ہے ہمدم

یہ عارض و لب جن میں کوئی رنگ نہیں ہے
کس کو خبر اِن عارض و لب میں ہے نہاں کیا
کیا جانے کوئی کیفیتِ قلبِ تپاں کیا
وہ قلب جو آسودۂ آہنگ نہیں ہے

ہم اپنے مقدر کے تراشے ہوئے پتھر
عشرت کدۂ دہر کے دیوار و در و بام
رقصِ مئے گلفام ہو یا گردشِ ایام
ہے اپنی نظر میں تو سدا ایک ہی منظر

دنیا یونہی چلتی ہے، یونہی چلتی رہے گی
ہر صبح کے بعد آئے گی اِک شامِ کشاکش
کیا سوچیے کیا ہو گا اب انجامِ کشاکش
اللہ کی مخلوق، یونہی پلتی رہے گی

آ۔آج کی شب دؤر، کہیں دؤر نکل جائیں
کل پھر وہی دن ہو گا، وہی دن کی تمازت
کل پھر وہی ہم ہوں گے، وہی اپنی مشقت
آ۔رات کی آغوش میں چپ چاپ پگھل جائیں

بازگشت

عجیب رات ہے، پُرنور، پُرسکوں، خاموش

فلک پہ چاند ہے تنہا، قریب و دور کہیں
کوئی ستارہ نہیں، کوئی ابرپارہ نہیں
نظر سے حدِ نظر تک، اُفق سے تا بہ اُفق
ہر ایک کنج منوّر، ہر ایک گوشہ حسیں
کچھ اِس طرح نکھر آیا ہے حسنِ ارض و سما
کہ ایک سے نظر آتے ہیں آسمان و زمیں

ہر ایک ذرّہ ہے خود اپنے نشے میں مدہوش
عجیب رات ہے، پُرنور، پُرسکوں، خاموش

یہی تو رات تھی، جب ہم ملے تھے پہلے پہل

سکوتِ دل میں نہاں تھے، ہزار ہا طوفاں
نظر نظر سے عیاں تھا، حجابِ کیفِ نہاں
لرزتے ہونٹ تھے، چپ چاپ محوِ ناز و نیاز
نفس کی آنچ میں پگھلے ہوئے تھے جسم و جاں
نہ فکرِ دوش نہ اندیشۂ غمِ فردا
نشاطِ قرب نے پہنچا دیا تھا جانے کہاں

عجیب طرح کے یہ سلسلے تھے پہلے پہل
یہی تو رات تھی، جب ہم ملے تھے پہلے پہل

وہی ہے رات، وہی چاندنی، وہی ہم تم

چلو کہ پھر اُسی ساعت کا اہتمام کریں
نگاہ و دل کو حریفِ مہِ تمام کریں

خنک فضاؤں کی آغوش میں پگھل جائیں
کبھی تو اپنی جوانی کا احترام کریں
یہ رات پھر کبھی آئے نہ آئے کیا معلوم
تمام عمر اِسی رات میں قیام کریں

ہزار کشتۂ دنیائے غم سہی، ہم تم
وہی ہے رات، وہی چاندنی، وہی ہم تم

گردش میں زندگی ہے بسر کر رہا ہوں میں
سورج کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا ہوں میں

O

دستک ہوا نے دی ہے ذرا غور سے سنو
طوفاں کی آ رہی ہے صدا غور سے سنو

شاخیں اُٹھا کے ہاتھ دعا مانگنے لگیں
سرگوشیاں چمن میں ہیں کیا غور سے سنو

محسوس کر رہا ہوں میں کربِ شکستگی
تم بھی شگفتِ گل کی صدا غور سے سنو

گل چیں کو دیکھ لیتی ہے جب کوئی شاخِ گل
دیتی ہے بددعا کہ دعا غور سے سنو

یہ اور بات، خشک ہیں آنکھیں، مگر کہیں
کھل کر برس رہی ہے گھٹا غور سے سنو

شاخوں سے ٹوٹتے پتوں کو دیکھ کر
روتی ہے منہ چھپا کے ہوا غور سے سنو

یہ دشتِ بے کراں، یہ پراسرار خامشی
اور دوُر اِک صدائے دِرا، غور سے سنو

یہ باز گشت، میری صدا کی ہے یا مجھے
آواز دے رہا ہے خدا، غور سے سنو

بڑھتی چلی ہے، ارض و سما میں کشیدگی
کونین میں ہے حشر بپا، غور سے سنو

کب تک زمیں اُٹھائے رہے آسماں کا بوجھ
اب ٹوٹتی ہے رسمِ وفا، غور سے سنو

میں ٹوٹتا ہوں، خیر مجھے ٹوٹنا ہی ہے
دھرتی چیخ رہی ہے ذرا، غور سے سنو

صحرا میں چیختے ہیں بگولے، تو شہر شہر
اِک شور ہے، سکوت فزا، غور سے سنو

شاعؔر تراشتے تو ہو دل میں خدا کا بت
آوازۂ شکستِ انا، غور سے سنو

O

پیشِ نظر تا دور سلگتا ملبہ ہے
ہاتھ اُٹھا کر دھواں دہائی دیتا ہے

اِک چہرے میں کتنے ادھورے چہرے تھے
بات کھلی جب آئینہ اپنا ٹوٹا ہے

کچی دیواروں پر بھاری چھت رکھ دی
دیکھتے دیکھتے کیسا بھرا گھر بیٹھا ہے

شاخ سے شاخ لپٹ کر روئے، بین کرے
گلدانوں کی خاطر گلشن اُجڑا ہے

شکل بدل کر آئے ہیں پھر لوگ وہی
کل بھی دل دھڑکا تھا، آج بھی دھڑکا ہے

خاک اُڑاتی گلیوں میں بچّوں کا شور
میرے وطن کے مستقبل کا نوحہ ہے

روشنیوں میں آئے تو معلوم ہوا
اپنے تعاقب میں اپنا ہی سایہ ہے

محنت کی ناجائز بیٹی ہے دولت
قسمت کیا ہے، اِس قحبہ کا پردہ ہے

پھر وہ پتھر، سنگِ میل بنا شاعؔر
وہ پتھر جو اپنی قبر کا کتبہ ہے

O

راہ دشوار ہے، فرشِ گلِ تر ہونے تک
پاؤں کے زخم ہیں آغازِ سفر ہونے تک

یہ الگ بات کہ خاموش ہیں اہلِ زنداں
ورنہ یہ حبس ہے دیوار میں در ہونے تک

ہم نے تاروں سے ہنر سیکھا ہے شب تابی کا
اِک چراغاں سرِ مژگاں ہے سحر ہونے تک

ہائے وہ بیج جو مٹی میں دبا رہتا ہے
کن مراحل سے گزرتا ہے شجر ہونے تک

کیا خبر تم کو کہ یہ سقف یہ دیوار ہے کیا
ہم پہ کیا گزری ہے اِس چھاؤں کے گھر ہونے تک

O

(۱۹۷۲ء میں پاکستان کے ٹوٹنے پر)

یہ بات تو نہیں ہے کہ میں کم سواد تھا
ٹوٹا ہوں اِس بنا پہ کہ میں کج نہاد تھا

الزام اپنی موت کا موسم پہ کیوں دھروں
میرے بدن میں میرے لہو کا فساد تھا

اب میں بھی جل کے راکھ ہوں، میرے جہاز بھی
کل میرا نام، ’طارقِ ابنِ زیاد‘ تھا

ایماں بھی لاج رکھ نہ سکا میرے جھوٹ کی
اپنے خدا پہ کتنا مجھے اعتماد تھا

گہرے سمندروں میں بھی پتھر ملے مجھے
تھا میں گہر شناس، مگر سنگ زاد تھا

وہ بادباں دریدہ سفینے کا ناخدا
اور قلزمِ سراب کا میں ’سندباد‘ تھا

اب ہوں زباں بریدہ تو یہ سوچ کر ہوں چپ
یہ بھی سخن شناس کا اندازِ داد تھا

O

کل تک تو اِک فریبِ یقیں تھا، گماں کے ساتھ
اور آج یہ زمیں بھی نہیں آسماں کے ساتھ

ہر ذرہ اپنی حدِ کشش سے نکل گیا
تنہا ہر ایک دل ہے غمِ بیکراں کے ساتھ

ہر نقشِ پا کا آپ ہی بنتی رہی کفن
گردِ سفر جو اُڑتی رہی کارواں کے ساتھ

تم اِس کو جبرِ وقت کہو یا ہوا کا رخ
اِک نسبتِ قفس بھی رہی آشیاں کے ساتھ

تنہا ہے تُو بھی میری طرح اے خدائے کُل
اِک رشتۂ نہاں بھی ہے ہم میں عیاں کے ساتھ

O

(روئے سخن ہے اُس کی طرف جو بھی زد میں ہے)

میں تو سمجھ رہا تھا کہ سورج گہن میں تھا
دیکھا جو روشنی میں تو سایہ بدن میں تھا

آئینے میں کھلا ترا سحرِ کمالِ فن
تیرے ہی دل کا عکس ترے مکر و فن میں تھا

سانپوں کی طرح جسم سے لپٹی ہوں جب رگیں
حیرت ہی کیا جو زہر بھی حرفِ سخن میں تھا

شبنم سے روئے صبح رہا باوضو تو کیا
خوشبو کا راز، بسترِ گل کی شکن میں تھا

دیکھا وہ خواب، رات کہ میں چیخ چیخ اُٹھا
میرا خدا بھی حلقۂ دارورسن میں تھا

یادوں کے سائبان میں شمعیں جلی ہوئیں
تنہا بھی تھا جو میں تو بھری انجمن میں تھا

وہ دھوپ چاندنی تھی وہ پتھر بھی پھول تھے
کیا جانے سحر کیا مری خاکِ وطن میں تھا

شفاف سطحِ آب پہ کھلتے کنول سے لوگ
یہ زندگی کا روپ بھی ارضِ دکن میں تھا

O

اِس دشتِ سخن میں کوئی کیا پھول کھلائے
چمکی جو ذرا دھوپ تو جلنے لگے 'سائے' ٥

سورج کے اُجالے میں چراغاں نہیں ممکن
سورج کو بجھا دو کہ زمیں جشن منائے

مہتاب کا پَرتَو بھی ستاروں پہ گراں ہے
بیٹھے ہیں شبِ تار سے اُمید لگائے

ہر موجِ ہوا شمع کے درپے ہے ازل سے
دل سے کہو، لَو اپنی ذرا اور بڑھائے

کس کوچۂ طفلاں میں چلے آئے ہو شاعؔر
آوازہ کسے ہے تو کوئی سنگ اُٹھائے

٥ روئے سخن کسی کی طرف ہے۔۔۔(شاعر)

O

منزل کے خواب دیکھتے ہیں پاؤں کاٹ کے
کیا سادہ دل یہ لوگ ہیں گھر کے نہ گھاٹ کے

اب اپنے آنسوؤں میں ہیں ڈوبے ہوئے تمام
آئے تھے اپنے خون کا دریا جو پاٹ کے

شہرِ وفا میں حقِ نمک یوں ادا ہوا
مخمل میں ہیں لگے ہوئے پیوند ٹاٹ کے

کھینچی تھی جن کے خوف سے سدّ سکندری
سوئے نہیں ہیں آج وہ دیوار چاٹ کے

اب تو درندگی کی نمائش بھی حسن ہے
دیوار پر سجاتے ہیں سر کاٹ کاٹ کے

O

ٹوٹا نہیں بکھر کے بھی خوابِ جنوں ہنوز
سر چڑھ کے بولتی ہے کوئی موجِ خوں ہنوز

بار گراں ہے پھر بھی اُٹھائے ہوئے ہیں لوگ
اپنے سروں پہ یہ فلکِ واژگوں ہنوز

کوئی دکھائے پھر یدِ بیضا کا معجزہ
طاری ہے سامری کا دلوں پر فسوں ہنوز

پھر جوئے شِیر کا کوئی دینے لگا فریب
مانگے ہے ضربِ تیشہ کوئی بے ستوں ہنوز

دل بھی ہے رہنِ غیر، بدن بھی ہے رہنِ غیر
اپنی کلاہ کج ہے بہ حالِ زبوں ہنوز

نعروں میں گونجتا ہوں تو چپ ہوں کتاب میں
معنی سے بے نیاز، میں اِک لفظ ہوں ہنوز

جو شاخ بے ثمر ہے یہاں، سر بلند ہے
اور شاخِ باردار کا ہے سرنگوں ہنوز

سورج پگھل گیا نہ ہو پہلو میں رات کے
اِس نم فضا میں آتشِ دل ہے فزوں ہنوز

شاؔعر میں شعر بھی نہ کہوں اب تو کیا کروں
دل تھا جو بے سکون، سو ہے بے سکوں ہنوز

○

آتش کدۂ دل کو ہوا کیوں نہیں دیتے
پتھر تو نہیں لوگ، صدا کیوں نہیں دیتے

سرمست اگر ہو تو سرِ بزمِ رقیباں
اِک نعرۂ مستانہ، لگا کیوں نہیں دیتے

سایہ ہے کہ خورشید کے دل کی ہے سیاہی
محرم ہو تو یہ راز بتا کیوں نہیں دیتے

سودا ہے اگر سر میں تو ٹکراتے نہیں کیوں
دیوار میں در کوئی بنا کیوں نہیں دیتے

سلجھاتے ہو بے کار یہ پیچیدہ لکیریں
یہ نقش غلط ہے تو مٹا کیوں نہیں دیتے

بیٹھے ہو جو یوں جسم کی قبروں میں سمٹ کر
کتبہ بھی سرِ قبر لگا کیوں نہیں دیتے

صیقل ہے خیالات کا آئینہ تو شاعؔر
یہ آئینہ دنیا کو دکھا کیوں نہیں دیتے

○

دل پر گراں گزرتا ہے اب تیرا ساتھ بھی
اِک ہتھکڑی سا لگتا ہے، ہاتھوں میں ہاتھ بھی

تپ تپ کے اپنی آگ میں بجھ تو گیا ہے دن
اب قبر کے عذاب میں گزرے گی رات بھی

اِک لمحۂ رواں سے بھی کم ہے سکوتِ مرگ
اِک لفظ سے زیادہ نہیں ہے حیات بھی

اِک خوابِ ناتمام کا عالم نگاہ میں
اِک وہم کا شکار، یقینِ ثبات بھی

اُڑتے ہوئے غبارے سے مہر و مہہ و نجوم
اور ان میں اِک کھلونا ہے انساں کی ذات بھی

اِک دوسرے کی زد میں ہیں مُہرے کچھ اِس طرح
ڈر ہے، اُلٹ نہ جائے کہیں یہ بساط بھی

O

اُٹھنے لگا دھواں، دلِ غم انتساب سے
کجلا نہ جائے اور زمیں آفتاب سے

لفظوں میں گُھٹ نہ جائے معانی کا دم کہیں
لَو دے اُٹھے نہ حرفِ جنوں احتساب سے

زیرِ زمیں درختوں کی بڑھنے لگیں جڑیں
خورشید، اَبر اُٹھانے لگا سطحِ آب سے

تہہ کی خبر تو کیا، انہیں اپنی خبر نہیں
اُبھرے ہیں سطحِ آب پہ سر جو حباب سے

چہروں پہ جو لکھا ہے وہ الفاظ میں کہاں
اِک جھوٹ کا اضافہ ہوا ہے کتاب سے

میرے لہو کی آب میں چہرہ نما بھی ہیں
منظر تری نگاہ میں ہیں جو سراب سے

ہر حجلۂ سکوت میں طوفاں ہے مضطرب
کب تک بندھے رہیں گے یہ خیمے طناب سے

کانوں میں آ رہی ہے کسی صور کی صدا
دھڑکے ہوئے ہیں دل کسی روزِ حساب سے

ہر شخص اپنی فردِ عمل کو سمیٹ کر
آئینہ دیکھتا ہے بڑے اضطراب سے

جسموں پہ پیرہن کی سجاوٹ ہے دیدنی
لیکن عرق عرق سے ہیں چہرے گلاب سے

بیدار دل میں ہے کوئی بے نام خوف سا
سہمی ہوئی ہے روح سوال و جواب سے

سنتے ہیں بازگشت جب اپنی صداؤں کی
رہ رہ کے جاگ پڑتے ہیں کچھ لوگ خواب سے

اُن پر بھی فاش ہو گئے شاید فلک کے راز
سوئے زمیں جو آنے لگے ہیں شہاب سے

O

اہلِ نظر کو دولتِ حسنِ نظر ملی
مجھ کم نظر کو اور ہی کوئی خبر ملی

اِک خواب سا تھا، ٹوٹ گیا، آنکھ کھل گئی
تعبیرِ خواب، خواب سے بھی پیشتر ملی

دیکھا تو آج اپنے مکینوں کی یاد میں
روتی ہوئی خموشیء دیوار و در ملی

آنکھوں میں جگمگاتے رہے جنتوں کے خواب
جنت میں پاؤں رکھا تو ہر چشم تر ملی

اِک عمر کی مسافتِ بے نام کے عوض
گر کوئی شے ملی بھی تو گردِ سفر ملی

O

میں سوچتا ہوں مگر میری سوچ ہی کیا ہے
بس ایک خوابِ حقیقت ہے، آگہی کیا ہے

ہر ایک بات زباں پر ہے، گفتنی کے سوا
اِس اختیار پہ یہ جبرِ خامشی کیا ہے

وہ روشنی ہے کہ ہر شے نظر سے اُوجھل ہے
یہ روشنی ہے تو پھر اور تیرگی کیا ہے

وہ مشتِ خاک ہوا نے جسے بکھیر دیا
سمیٹنے کی تگ و دَو ہے آدمی کیا ہے

میں آئینے میں بھی ہوں، آئینے کے باہر بھی
مرے وجود کی وحدت میں یہ دوئی کیا ہے

O

میں وہ یقیں ہوں، نظر آئے جو گماں کی طرح
تری زمیں پہ ازل سے ہوں آسماں کی طرح

مجھے غروب نہ جانو جو میں اُفق پہ نہیں
بکھر گیا ہوں اندھیرے میں کہکشاں کی طرح

وہ نقش آب ہی اچھا جو ہر نظر میں نہیں
اُبھر کے کون مٹے نقشِ رائگاں کی طرح

نظر نظر کا تماشا بنوں تو کیا حاصل
رہوں تو دل میں رہوں یادِ رفتگاں کی طرح

اُس اَبر کو بھی اُڑا لے گئی یہ تیز ہوا
جو میرے سر پہ رہا دستِ مہرباں کی طرح

مری متاعِ سخن ہے تمہارا سرمایہ
اِسے سنبھال کے رکھنا متاعِ جاں کی طرح

O

الفاظ ہیں کہ زہر کے پیالے بھرے ہوئے
یہ مدرسے، یونہی تو نہیں، مقبرے ہوئے

خود آگہی نہ تھی تو خدا آشنا تھے ہم
خود آشنا ہوئے تو ہیں خود سے ڈرے ہوئے

اِک مرکزِ نگاہ پہ کوئی نہ آ سکا
ہر چند ذہن و دل میں بہت مشورے ہوئے

اب کیوں نہ شاخِ دار پہ آئے سروں کی فصل
شہروں کا خوں پیا ہے تو جنگل ہرے ہوئے

اِک جرمِ بے وفائی، بنامِ وفا سہی
الزام یوں بھی سر پہ ہیں کتنے دھرے ہوئے

O

لٹا دیا ہے غمِ آب و تاب میں کیا کیا
وگرنہ خواب تھے چشمِ پُر آب میں کیا کیا

بلندیوں کا بھی اُٹھا ہے پستیوں سے خمیر
زمیں کے راز ہیں اُڑتے سحاب میں کیا کیا

یقیں نہ ہو تو کوئی ڈوب کر ذرا دیکھے
بھنور ہیں سوئے ہوئے نقشِ آب میں کیا کیا

کوئی تو دیکھے مجھے میری آنکھ سے یارب
دکھائی دیتا ہے مجھ کو سراب میں کیا کیا

میں لفظ لفظ جو پڑھتا گیا تو بات کھلی
کھنچی ہوئی تھیں لکیریں کتاب میں کیا کیا

فقط سکوں کی طلب ہے بنامِ خلدِ بریں
فریب خود کو دیے اضطراب میں کیا کیا

وہ روشنی تھی کہ کچھ بھی نظر میں آ نہ سکا
سیاہیاں تھیں رُخِ آفتاب میں کیا کیا

ہجومِ رنگ میں خوشبو کی جستجو کے لیے
دیے جلائے ہیں طاقِ گلاب میں کیا کیا

ہر ایک نام تھا حرف غلط، بجز شاعرؔ
کھلا ہے ذوقِ نظر انتخاب میں کیا کیا

O

کیسے کیسے خواب دکھلائیں مہ و اختر مجھے
اپنی گردش سے نہ ہٹنے دے مرا محور مجھے

آئی تھی موجِ ہوا، مجھ کو اُڑانے کے لیے
سر پٹک کر رہ گئی، دیکھا جو اِک پتھر مجھے

گھر کی دیواروں نے ڈالی ہے بِنائے قید و بند
اب تو زنداں بھی نظر آتا ہے اپنا گھر مجھے

ذہن چھنتا جائے مجھ کو جسم کی دیوار میں
اور دل لے جائے، اپنے آپ سے باہر مجھے

میں ہی کچھ بدلا ہوا ہوں یا مرے گھر کی فضا
اجنبی سے لگ رہے ہیں اپنے بام و در مجھے

سلوٹوں کے سانپ لہراتے رہے پھولوں کے بیچ
رات بھر ڈستا رہا مہکا ہوا بستر مجھے

O

اِس عرضِ سخن کا مجھے یارا تو نہیں تھا
درپردہ ترے غم کا اشارا تو نہیں تھا

دنیا مری دشمن سہی، تو کیوں ہے گریزاں
مشکل میں تجھے میں نے پکارا تو نہیں تھا

روٹی کے لیے طاق پہ رکھ دوں گا کتابیں
جینا مجھے اِس طرح گوارا تو نہیں تھا

کیوں آئینہ دیکھا تو ندامت ہوئی مجھ کو
میں رزم گہہِ زیست میں ہارا تو نہیں تھا

ماں کی طرح پالا ہے زمیں نے مجھے ورنہ
افلاک تلے کوئی سہارا تو نہیں تھا

کرتا میں کسی خال پہ کس طرح نچھاور
یہ ملک 'سمر قند و بخارا' تو نہیں تھا

کیوں کاٹ دیا میرے قلم نے مجھے شاؔعر
لکھا ہوا میں حرف، دوبارہ تو نہیں تھا

O

اِس دشت پہ احساں نہ کر اے ابرِ رواں اور
جب آگ ہو نم خوردہ تو اُٹھتا ہے دھواں اور

وہ قحطِ جنوں ہے کہ کوئی چاک گریباں
آتا ہے نظر بھی تو گزرتا ہے گماں اور

یہ سنگ زنی میرے لیے بارشِ گل ہے
تھک جاؤ تو کچھ سنگ بدستِ دگراں اور

سورج کو یہ غم ہے کہ سمندر بھی ہے پایاب
یارب مرے قلزم میں کوئی موجِ رواں اور

شاؔعر یہ زمیں حضرتِ غالبؔ کی زمیں ہے
ہر شعر طلب کرتا ہے خونِ رگِ جاں اور

O

پندارِ زہد ہو کہ غرورِ برہمنی
اِس دورِ بت شکن میں ہے ہر بت شکستنی

صر صر چلے کہ تند بگولوں کا رقص ہو
موجِ نمو رواں ہے تو ہر گُل شگفتنی

گل چین و گلفروش کی خاطر ہے فصلِ گل
اور قسمتِ جنوں ہے فقط چاک دامنی

دیوارِ ابر کھینچئے کرنوں کی راہ میں
ذروں میں قید کیجیے سورج کی روشنی

موجِ نفس سے لرزے ہے تارِ رگِ حیات
پھیلی ہے شہرِ دل میں وہ پرہول سنسنی

کل تک تھا جس پہ ناز وہی شاعرِ غریب
احباب کی نگاہ میں ٹھہرا ہے کشتنی

O

دیکھے جو آبلے کسی رہرو کے پاؤں میں
نادم کھڑے ہوئے ہیں درخت اپنی چھاؤں میں

اب آدمی سے دور یہاں بھی ہے آدمی
شہروں کی وسعتیں سمٹ آئی ہیں گاؤں میں

O

یم بہ یم پھیلا ہوا ہے پیاس کا صحرا یہاں
اِک سرابِ بیکراں ہے ایک اِک قطرہ یہاں

روشنی کے زاویوں پر منحصر ہے، زندگی
آپ کے بس میں نہیں ہے آپ کا سایہ یہاں

آتے آتے آنکھ تک دل کا لہو پانی ہوا
کس قدر ارزاں ہے اپنے خون کا سودا یہاں

تیرے میرے درمیاں حائل ہے اِک دیوارِ حرف
رکھ لیا ہے بات ہی نے بات کا پردہ یہاں

دیکھیے تو یہ جہاں ہے، اِک جہانِ آب و گِل
سوچیے تو ذرہ ذرہ میں ہے اِک دنیا یہاں

O

اپنا اندازِ جنوں سب سے جدا رکھتا ہوں میں
چاکِ دل، چاکِ گریباں سے سوا رکھتا ہوں میں

غزنوی ہوں اور گرفتارِ خمِ زلفِ ایاز
بت شکن ہوں اور دل میں بت کدہ رکھتا ہوں میں

ہے خود اپنی آگ سے ہر پیکرِ گِل، تابناک
لے ہوا کی زد پہ مٹی کا دیا رکھتا ہوں میں

میں کہ اپنی قبر میں بھی زندہ ہوں گھر کی طرح
جسم پر اپنا کفن، احرام سا رکھتا ہوں میں

دشتِ غربت میں ہوں آوارہ، مثالِ گرد باد
کوئی منزل ہے نہ کوئی نقشِ پا رکھتا ہوں میں

میرا سایہ بھی نہیں میرا، اُجالے کے بغیر
اور اُجالے کا تصور خواب سا رکھتا ہوں میں

O

میرا شعور مجھ کو یہ آزار دے گیا
سورج کی طرح دیدۂ بیدار دے گیا

ہر پھول اِک شرر ہے تو ہر شاخ ایک برق
جنت کا خواب، دوزخِ گلزار دے گیا

سورج کا رُخ بدلتے ہی خود بھی بدل گیا
کیسا فریب سایۂ دیوار دے گیا

لب بستگی میں حسرتِ گفتار جاگ اُٹھی
خوفِ سکوت، جرأتِ اظہار دے گیا

جلتا ہوں اپنی آگ میں خورشید کی طرح
کیسی سزا یہ شعلۂ پندار دے گیا

سائے میں آسماں کے بھی مجھ کو نہ مل سکا
وہ آسرا جو سایۂ دیوار دے گیا

O

پڑ جائے راہ میں نہ کہیں خاک دیکھ کر
ملتے ہیں لوگ شہر میں پوشاک دیکھ کر

شاید ہمیں عزیز نہیں اپنی زندگی
لوٹ آئے لوگ، راہ خطرناک دیکھ کر

O

دل میں تھا جو خیال وہ لکھا نہ جا سکا
جامہ تھا اتنا تنگ کہ پہنا نہ جا سکا

کل رات اتنی تیز تھی آوازِ خامشی
سو مسئلے تھے، ایک بھی سوچا نہ جا سکا

دل کو تھا شب، عجیب سا دھڑکا لگا ہوا
مجھ سے کھلی فضا میں بھی سویا نہ جا سکا

کانوں میں آ رہی تھی صدائے رحیلِ صبح
آنکھوں میں تھی وہ نیند کہ جاگا نہ جا سکا

میں چشم وا کیے اُسے تکتا رہا مگر
وہ نور تھا نظر میں کہ دیکھا نہ جا سکا

لرزاں رہا لبوں پہ کوئی حرفِ آرزو
طاری تھا وہ سکوت کہ بولا نہ جا سکا

اُترا سوادِ ماہ سے وہ اِس ادا کے ساتھ
اُس کو زمینِ شعر پہ لایا نہ جا سکا

O

شاعر صاحب اِس بستی میں کس کو گیت سناتے ہو
سایوں کے سنسان نگر میں کس کا دل گرماتے ہو

سونے چاندی کی دنیا میں پیار کی قیمت کیا ہو گی
دل کا کھوٹا سکّہ لے کر کس بازار میں جاتے ہو

جلتا سورج، تپتی دھرتی، اونچی نیچی راہگزر
اپنے سائے سائے چل کر پگ پگ ٹھوکر کھاتے ہو

اُڑتے بگولوں کے پیچھے کیوں دوڑ رہے ہو، رُک جاؤ
اِس آباد خرابے میں کیوں اپنی جان گنواتے ہو

تنہا تنہا، کھوئے کھوئے، چپ چپ رہنے سے حاصل
کونے کونے رو لیتے ہو، دل کی آگ بجھاتے ہو

جن پر تم کو ناز تھا وہ بھی بک گئے دوکوڑی کے مول
اب بھی وقت کا رُخ پہچانو، وقت سے کیوں ٹکراتے ہو

ایسے روشن سورج سے تو رات کے تارے ہی اچھے
ساتھ نہ دے جو اندھیارے میں کیوں اس کے گن گاتے ہو

O

رات سنسان، دشت و در خاموش
چاند تارے شجر حجر خاموش

کوئی آوازِ پا نہ بانگِ جرس
کارواں اور اِس قدر خاموش!

ہر طرف اِک مہیب سناٹا
دل دھڑکتا تو ہے مگر خاموش

ہوئے جاتے ہیں کس لیے آخر
ہم سفر، بات بات پر خاموش

ہیں یہ آدابِ رہگزار کہ خوف
راہرو چپ ہیں، راہبر خاموش

مختصر ہو نہ ہو شبِ تاریک
ہم کو جلنا ہے تا سحر خاموش

ڈھل چکی رات، بجھ گئیں شمعیں
راہ تکتی ہے چشمِ تر خاموش

جانے کیا بات کر رہے تھے کہ ہم
ہو گئے ایک نام پر خاموش

ہم سے شاعر بھی ہو گئے آخر
رنگِ حالات دیکھ کر خاموش

O

(بحر میں ایک تجربہ)

آج کی شب جیسے بھی ہو ممکن جاگتے رہنا
کوئی نہیں ہے، جان کا ضامن، جاگتے رہنا

قزاقوں کے دشت میں جب تک قافلہ ٹھہرے
قافلے والو، رات ہو یا دن، جاگتے رہنا

تاریکی میں لپٹی ہوئی پُرہَول خموشی
اِس عالم میں، کیا نہیں ممکن، جاگتے رہنا

آہٹ آہٹ پر جانے کیوں دل دھڑکے ہے
کوئی نہیں اطراف میں لیکن، جاگتے رہنا

ٹھنڈی ہواؤں کا اے دل، احساں نہ اُٹھانا
کوئی یہاں ہمدرد نہ محسن، جاگتے رہنا

راہنما سب دوست ہیں لیکن اے ہم سفرو!
دوست کا کیا ظاہر، کیا باطن، جاگتے رہنا

تاروں کی آنکھیں بھی بوجھل بوجھل سی ہیں
کوئی نہیں اب شاؔعر تجھ بن جاگتے رہنا

o تاک دِھنا دِھن (تین بار)

O

راستہ تیرہ و تار ہے، کچھ کہو
ہر قدم اِک گراں بار ہے، کچھ کہو

کوئی نغمہ نہیں، کوئی نالہ نہیں
خامشی مرگ آثار ہے، کچھ کہو

کون مشعل بکف ہے ذرا دیکھ لو
کیوں ہراساں دلِ زار ہے، کچھ کہو

ہر نظر، خار کی طرح چبھتی ہوئی
ہر نفس، تیغ کی دھار ہے، کچھ کہو

برق چمکی، خلاء میں کہیں کھو گئی
روشنی کتنی لاچار ہے، کچھ کہو

سرسراتی ہوا کی ہیں سرگوشیاں
یا کہ ناگن کی پھنکار ہے، کچھ کہو

O

وہ ایک لفظ جو شرمندۂ بیاں نہ ہوا
اُس ایک لفظ کا چرچا کہاں کہاں نہ ہوا

اُس ایک اشک سے قائم ہے آبروِ غم کی
جو دل میں ڈوب گیا آنکھ سے رواں نہ ہوا

O

نالۂ غم، شعلہ اثر چاہیے
چاکِ دل اب تا بہ جگر چاہیے

کتنے مہ و نجم ہوئے نذرِ شب
اے غمِ دل، اب تو سحر چاہیے

منزلیں ہیں زیرِ کفِ پا مگر
ایک ذرا عزمِ سفر چاہیے

آئینہ خانے میں ہے درکار کیا
چاہیے اِک سنگ اگر چاہیے

توڑ چکا حدِ تعین جنوں
اب کوئی دیوار نہ در چاہیے

تشنگیِ لب کا تقاضہ ہے اب
بادہ ہو یا زہر مگر چاہیے

راہ نہیں کوئی بجز راہِ عشق
عشق کا ادراک مگر چاہیے

دور ہے دل منزلِ غم سے ہنوز
اِک غلط اندازِ نظر چاہیے

وہ کہ انہیں دل سے غرض ہی نہیں
دل کی یہ ضد اُن کو مگر چاہیے

ق
سہل نہیں پیروی رنگِ میرؔ
سوزِ دل و دیدۂ تر چاہیے
شاعرؔ اِس اندازِ سخن کے لیے
میرؔ سا عرفانِ ہنر چاہیے

O

رُکتا ہے اُجالا کہیں ظلمت کی سِپر سے
سورج تو در آئے گا ہر اِک روزنِ در سے

کجلائی ہوئی دھوپ ہے یا تپتی ہوئی چھاؤں
یہ راز بھی کھل جائے گا نکلو گے جو گھر سے

اِس دور میں جو شخص ہے دستار بہ سر ہے
ہو کوئی تو، نکلے جو کفن باندھ کے سر سے

یوں دل کی سیاہی میں قلم ڈوب گئے ہیں
تحریر کو نسبت نہ رہی خونِ جگر سے

خود اپنے تعاقب میں ہیں پرچھائیں کے مانند
ہم لوگ جو پوشیدہ ہیں خود اپنی نظر سے

کٹتی ہے تو سایوں میں بدل جاتی ہے ہر رات
شب کا کوئی گہرا ہی تعلق ہے سحر سے

O

کسی طرح یہ شبِ تار، مختصر ہو تو
سحر کے ہم بھی پرستار ہیں، سحر ہو تو

یہ اہتمامِ بہاراں بجا سہی، لیکن
بہار کی کوئی تدبیر، معتبر ہو تو

ہمیں بھی حسن سے رغبت ہے، زندگی سے لگاؤ
غمِ معاش سے لیکن کبھی مفر ہو تو

اب استعاروں میں ہوتی ہیں راز کی باتیں
یہ خوف ہے کہ کوئی پیش و پس اگر ہو تو

ہمارے چاکِ جگر کی کسے خبر شاعرؔ
کسی کو اپنے سوا اور کی خبر ہو تو

O

ہر قدم پر نت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ
دیکھتے ہی دیکھتے، کتنے بدل جاتے ہیں لوگ

کس لیے کیجیے کسی گم گشتہ جنت کی تلاش
جب کہ مٹی کے کھلونوں سے بہل جاتے ہیں لوگ

کتنے سادہ دل ہیں اب بھی، سن کے آوازِ جرس
پیش و پس سے بے خبر، گھر سے نکل جاتے ہیں لوگ

اپنے سائے سائے سر نہوڑائے، آہستہ خرام
جانے کس منزل کی جانب آج کل جاتے ہیں لوگ

شمع کے مانند اہلِ انجمن سے بے نیاز
اکثر اپنی آگ میں چپ چاپ جل جاتے ہیں لوگ

شاؔعر اُن کی دوستی کا اب بھی دم بھرتے ہیں آپ
ٹھوکریں کھا کر تو سنتے ہیں سنبھل جاتے ہیں لوگ

O

جب تک زمیں پہ رینگتے سائے رہیں گے ہم
سورج کا بوجھ سر پہ اُٹھائے رہیں گے ہم

کھل کر برس ہی جائیں کہ ٹھنڈی ہو دل کی آگ
کب تک خلا میں پاؤں جمائے رہیں گے ہم

جھانکے گا آئینوں سے کوئی اور جب تلک
ہاتھوں میں سنگ وخشت اُٹھائے رہیں گے ہم

اِک نقش پا کی طرح سہی اِس زمین پر
اپنی بھی ایک راہ بنائے رہیں گے ہم

جب تک نہ شاخ شاخ کے سر پر ہو تاجِ گُل
کانٹوں کا تاج سر پہ سجائے رہیں گے ہم

O

آئے تھے تیرے شہر میں کتنی لگن سے ہم
منسوب ہو سکے نہ تری انجمن سے ہم

یوں بے رخی سے پیش نہ آ، اہلِ دل کے ساتھ
اُٹھ کر چلے نہ جائیں تری انجمن سے ہم

یہ سرکشی جنوں نہیں، پندارِ عشق ہے
گزرے ہیں دار سے بھی اِسی بانکپن سے ہم

ملتے ہیں روز دستِ صبا سے پیامِ گُل
زنداں میں بھی قریب ہیں اہلِ چمن سے ہم

اے ریگزارِ سندھ ترا چاند بجھ نہ جائے
آئے ہیں اِس کی چاہ میں ارضِ دکن سے ہم

شاعر ادب کے محتسبوں کو خبر نہیں
کیا کام لے رہے ہیں تغزل کے فن سے ہم

O

(ایک 'خود پرست' سیاسی رہنما کے نام)

ہر رہنمائے وقت ہے رہزن، ترے سوا
سچ ہے، ہر ایک دوست ہے، دشمن، ترے سوا

اِک تو کہ ہے جنوں میں بھی پاسِ خرد تجھے
ہر شخص کا دریدہ ہے دامن، ترے سوا

فہرستِ دلبراں میں کوئی معتبر نہیں
لے کس کا نام، دل کی یہ دھڑکن، ترے سوا

لب تشنگاں کے واسطے ابرِ کرم ہے تو
صحرا ترے سوا ہے نہ گلشن، ترے سوا

تو ہے تو مرغزار ہے یہ ریگزار بھی
ملبے کو نام کون دے خرمن، ترے سوا

دامن کسی کا چاک تو دل ہے کسی کا چاک
کس کو غمِ سلامتیِ تن، ترے سوا

بازی گروں میں آج بچھی ہے بساطِ دل
ہر ایک مہرہ باز ہے پُر فن، ترے سوا

منسوب میری موت ہے جب تیرے نام سے
کیوں اور نام ہو سرِ مدفن، ترے سوا

’بعداز خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر‘
زیرِ فلک کہیں نہیں مامن، ترے سوا

O

پندارِ یوسفی سہی، پندار ہی تو ہے
بازار کی یہ شے، سرِ بازار ہی تو ہے

بہروپ میں عبث ہے تمھیں روپ کی تلاش
جھوٹی کہانیوں کا وہ کردار ہی تو ہے

وہ آدمی ہی کیا کہ جو ماضی کو بھول جائے
آخر زمانہ، گردشِ پرکار ہی تو ہے

آج اِس کی گود میں ہے تو کل اُس کی گود میں
دولت ہے چیز کیا، زنِ بازار ہی تو ہے

شہرت تو وہ ہے سینہ بہ سینہ جو چل سکے
ناز اِس پہ کیا کہ شہرتِ اخبار ہی تو ہے

گر دھوپ سے بچا بھی تو بارش سے دھل گیا
یہ اشتہار، نقش بہ دیوار ہی تو ہے

چہروں کو پوجتا نہیں کوئی خدا پرست
چہرہ پرست، بت کا پرستار ہی تو ہے

ٹوٹے تو کیا کہ دل سے تو نسبت نہیں اُسے
ربطِ دکاندار و خریدار ہی تو ہے

کب تک وفا کے نام پہ جھیلے کوئی عذاب
دل اُس کی دوستی کا گنہگار ہی تو ہے

کب تک رہے گی راہ میں حائل یہ بنتِ خاک
اِک روز ٹوٹ جائے گی، دیوار ہی تو ہے

میں سخت جاں تو مر نہ سکا دشمنوں سے بھی
وہ دوستی میں درپئے آزار ہی تو ہے

میں بھی انا پرست ہوں ° اقرار کیا کروں
میرے لبوں پہ آج بھی انکار ہی تو ہے

° ۱۹۷۰ء کا وہ لمحہ جب میں نے فلم انڈسٹری چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ پس منظر غزل کے اشعار میں موجود ہے۔(شاعر)

O

جس کو دیکھ کے شاعر تم للچائے بہت
اس میں بھی تھی روشنی کم اور سائے بہت

آئینے کا سحر ہے یا اندازِ نظر
اپنا عکس ہی اپنے روپ دکھائے بہت

کل جو چہرہ نظر نظر کا محور تھا
آج وہ چہرہ دیکھ کے جی بھر آئے بہت

جوڑے میں جو پھول تھا کل، اب گود میں ہے
دیکھ کے اُس کو بیتے دن یاد آئے بہت

تجھ سے تھا پیمانِ وفا سو قائم ہے
پھول سے لوگوں نے پتھر برسائے بہت

چہرے کی خاموش لکیریں کہتی ہیں
شرط سخن ہے، کہنے کے پیرائے بہت

ہونٹوں پر اِک زخمِ تبسم آج بھی ہے
جسموں کی تکفین نے راز چھپائے بہت

بہرے جذبے روح کی چیخیں کیا سنتے
ٹھنڈی پٹڑی ریل تلے چلّائے بہت

حبس سہی کمرے میں رہو تو اچھا ہے
باہر تیز ہوا تو دھول اُڑائے بہت

اپنے وطن میں وہ سچا ہے جو یارو
سچائی کو جھوٹے منہ بہلائے بہت

شاعؔر اپنے گھر کا خدا ہی حافظ ہے
اِس گھر کو ہیں گھیرے ہوئے ہمسائے بہت

O

آدمی ہوں کہ دیوتا ہوں میں
جو بھی ہوں، تیرا آئینہ ہوں میں

کبھی خلوت ملے تو غور سے سن
تیرے دل کی کوئی صدا ہوں میں

تیری ہر اِک ادا سے تھا جو عیاں
وہی خاموش مدعا ہوں میں

اور یہ بات بھی ہے غور طلب
کل تھا کیا اور آج کیا ہوں میں

اِس قدر دور تھا تو پھر کیسے
اتنا نزدیک آ گیا ہوں میں

کوئی پتھر نہ تھا کہ چپ رہتا
آگ ہی تھا، دہک اُٹھا ہوں میں

تو بھی ہے طعنہ زن تو سوچ میں ہوں
واقعی کس قدر بُرا ہوں میں

تو مری حد میں کیا سمٹ آیا
اپنی حد سے گزر گیا ہوں میں

O

اُس کے غم کو، غمِ ہستی تو مرے دل نہ بنا
زیست مشکل ہے اِسے اور بھی مشکل نہ بنا

تو بھی محدود نہ ہو مجھ کو بھی محدود نہ کر
اپنے نقشِ کفِ پا کو مری منزل نہ بنا

اور بڑھ جائے گی ویرانیِ دل، جانِ جہاں
میری خلوت گہہِ خاموش کو محفل نہ بنا

دل کے ہر کھیل میں ہوتا ہے بہت جاں کا زیاں
عشق کو عشق سمجھ، مشغلۂ دل نہ بنا

پھر مری آس بندھا کر مجھے مایوس نہ کر
حاصلِ غم کو خدارا غمِ حاصل نہ بنا

O

ہر زخمِ دل کا لطف تھا تیغِ جفا کے ساتھ
کیا کیا معاملے تھے کسی کج ادا کے ساتھ

وہ اِک سپردگی سی، بہ اندازِ بے رخی
وہ دوریوں میں قرب سا عہدِ وفا کے ساتھ

وہ ایک التفات کا عالم بہ احتیاط
وہ بے نیازیاں تری، ناز و ادا کے ساتھ

وہ اِک نگاہِ قہر بہ عنوانِ دوستی
وہ دوست داریاں، ستمِ ناروا کے ساتھ

وہ جلوتوں کا روپ کہ بیگانگی تمام
وہ خلوتوں میں جلوہ نمائی حیا کے ساتھ

وہ پھول پھول زخم، وہ آنسو گہر گہر
کتنے چراغ بجھ گئے موجِ ہوا کے ساتھ

وہ کیفِ درد، کربِ مسرت، نشاطِ غم
کیا کیا نوازشیں تھیں کسی بے نوا کے ساتھ

اے کاش ہم بھی سیکھتے آدابِ بندگی
دو چار دن نباہتے ہم بھی خدا کے ساتھ

کیا جانے کب بر آئے تمنائے بازدید
شاعؔر وداع کیجیے اُس کو دعا کے ساتھ

O

یہ آرزو ہی رہی، کوئی آرزو کرتے
خود اپنی آگ میں جلتے، جگر لہو کرتے

ترے جمال کا پَرتَو نگاہ میں ہوتا
کبھی صبا سے، کبھی گُل سے گفتگو کرتے

ترے خیال میں گم ہو کے اِک غزل کہتے
اور اِس کلام کو رسوا نہ کو بہ کو کرتے

ہم اہلِ دل کو بہت تھا یہ نشۂ غم بھی
اِسی شراب سے روشن سبو سبو کرتے

یہ احترامِ جنوں ہے کہ سی لیا دامن
وگرنہ ایک تماشا سا کو بہ کو کرتے

ہمیں یقیں ہے اگر تو قریب بھی ہوتا
تو دور جا کے کہیں تیری جستجو کرتے

○

متاعِ درد ملی، سوزِ جاودانہ ملا
بہ فیضِ عشق ہمیں زندگی میں کیا نہ ملا

ہمیں حرم میں نہاں تھے، ہمیں صنم سے عیاں
ہماری ذات سے باہر ہمیں خدا نہ ملا

بھٹکتے پھرتے ہیں دشتِ جنوں میں مثلِ غبار
وہ لوگ جن کو محبت کا آسرا نہ ملا

تمہارے غم میں بھی رکھتے ہیں ہم قرینۂ زیست
تمہارے غم سے شعورِ غمِ زمانہ ملا

اُنہیں کے خوں سے ہے گلزار، خاکِ کنجِ حرم
جنہیں بفضل خدا، سایۂ خدا نہ ملا

بنا نہ دیں کسی دیوار ہی کو در یہ اسیر
اگر قفس سے رہائی کا راستہ نہ ملا

○

میں اپنی بازیافت کہوں یا خدا کہوں
جی چاہتا ہے جو بھی کہوں، برملا کہوں

○

خداوندا، یہ کیسی آگ سی جلتی ہے سینے میں
تمنا جو نہ پوری ہو، وہ کیوں پلتی ہے سینے میں

نہ جانے یہ شبِ غم، صبح تک کیا رنگ لائے گی
نفس کے ساتھ اِک تلوار سی چلتی ہے سینے میں

میں جتنا توڑتا ہوں، حلقۂ زنجیرِ وحشت کو
اُسی سرعت سے اِک زنجیرِ نو ڈھلتی ہے سینے میں

کوئی انجام اے دورِ کشاکش، اب نہیں یارا
کہ اب تو آرزوئے زیست بھی کھلتی ہے سینے میں

کسے معلوم تھا یارب کہ ہو گی دشمنِ جاں بھی
وہ حسرت، خونِ دل پی پی کے جو پلتی ہے سینے میں

O

اہتمامِ شبِ ہجراں ہو گا
پھر ان آنکھوں میں چراغاں ہو گا

یاد بن کر رگِ جاں میں کوئی
درد کی طرح خراماں ہو گا

پھر خلاء میں کوئی نادیدہ جمال
مرکزِ دیدۂ حیراں ہو گا

تیز تر ہو گی ہوا کی یورش
اور چراغِ تہہِ داماں ہو گا

یہ حسیں داغ مبارک شاعؔر
دل حریفِ مہِ تاباں ہو گا

ادھوری غزلیں

خورشید بجھ گیا تو زمیں جگمگا اُٹھی
گردوں پہ خاک ڈالنے یوں گردِ پا اُٹھی

کیا خواب تھا کہ روئے سحر ہے عرق عرق
کیوں اشک اشک بسترِ گل سے صبا اُٹھی

جل بجھ چکے وہ خواب، وہ آنکھیں کھنڈر ہوئیں
اب یہ گھٹا برسنے کو اُٹھی تو کیا، اُٹھی

رہ جائے اِک نگاہ کا پردہ ہی درمیاں
تہذیب کے بدن سے تو رسمِ قبا اُٹھی

O

سائے چمک رہے تھے، سیاست کی بات تھی
آنکھیں کھلیں تو صبح کے پردے میں رات تھی

میں تو سمجھ رہا تھا کہ مجھ پر ہے مہرباں
دیوار کی یہ چھاؤں تو سورج کے ساتھ تھی

تیری جفا تو موردِ الزام تھی، نہ ہے
میری وفا بھی کوششِ تکمیلِ ذات تھی

کس درجہ ہولناک ہے شاعرؔ شعورِ ذات
کتنی حسین پہلے یہی کائنات تھی

O

وہ آدمی ہے تو کیوں مجھ سے دور اتنا ہے
وہ خاک ہے تو اُسے کیوں غرور اتنا ہے

نظر میں کوئی بھی جچتا نہیں ہے اپنے سوا
کہ آگہی کے نشے میں سُرور اتنا ہے

دراز دست نہ کر دے، وفورِ تشنہ لبی
طلب کے باب میں دل، ناصبور اتنا ہے

یقین آئے نہ کیوں، اُس کی پارسائی کا
کہ دل سیاہ سہی، رُخ پہ نور اتنا ہے

O

روتا ہے دل تو روئے، لبوں پر فغاں نہ ہو
یہ حکم ہے کہ آگ جلے اور دھواں نہ ہو

زخموں کو پھول، اشک کو شبنم کہو کہ اب
صاحب یہ چاہتے ہیں کہ غم کا بیاں نہ ہو

دامن کو چاک کیجیے اِس احتیاط سے
اہلِ جہاں کو زخمِ جگر کا گماں نہ ہو

لب بستگی کو دیکھیے، آدابِ دل کا نام
آنکھوں میں بات کیجیے، رسوا زباں نہ ہو

O

دشتِ وفا میں دور تک موج سراب دیکھنا
دیدۂ خواب آشنا، حاصلِ خواب دیکھنا

عرصہ گہہ نمود میں، رزمِ زیان و سود میں
شورشِ موج دیکھنا، رقصِ حباب دیکھنا

خواب و خیال سینہ شق، نقش و نگار چہرہ فق
فکر و نظر ورق ورق، دل کی کتاب دیکھنا

O

ترے خیال کا پرتو ہے یا کہ تو ہے کہیں
یہ کائنات حسیں تھی، پر اس قدر تو نہیں

صبا گزرتی ہے چھو کر تو جاگ اُٹھتا ہے
وہ لمس جو مرے احساس میں نہاں ہے کہیں

نمودِ صبح کے منظر میں کھو گئی ہے نگاہ
اُبھر رہا ہے تصور میں تیرا نقشِ جبیں

O

حلقہ بگوش رہ کے کٹی جن کی زندگی
وہ کیا سمجھ سکیں گے مقامِ خود آگہی

وہ گل کسی بہار کا احسان کیوں اٹھائے
جس کو ملی ہے زخمِ جگر کی شگفتگی

یہ بھی ہے ماہتاب پرستی کی اِک ادا
جب اُس کو چھو نہ پائے تو خاک اُس پہ پھینک دی

تشنگی کا سفر

اب آگہی کی زد پہ ہیں صدیوں کے واہمے
لاکھ آسماں اٹھائے ہوئے اپنی ڈھال ہو
(حمایت علی شاعر)

اپنی شریک حیات

معراج نسیم

کے نام

جو میری دوست بھی تھی، میری ہم خیال بھی تھی

ترتیب

O	تشنگی کا سفر	حمایت علی شاعر	۳۸۹
O	شعلۂ بے دود	(طویل افسانوی نظم)	۴۰۰
O	بنگال سے کوریا تک	(طویل ترین افسانوی نظم)	۴۱۱
O	بدلتے زاویے	(تمثیلی غنائیہ)	۴۶۷
O	شکست کی آواز	(یک کرداری، منظوم تمثیل)	۴۸۸

تشنگی کا سفر

’تشنگی کا سفر‘ میری طویل افسانوی اور تمثیلی نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ نظمیں میں نے ۵۲ء سے ۶۳ء کے دوران لکھی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں ریڈیو پاکستان سے متعلق تھا اور بہ یک وقت کئی شعبوں میں کام کرتا تھا۔ صداکاری (اناؤنسر، کمنٹریٹر، نیوز ریڈر اور ڈرامہ آرٹسٹ) مسودہ نگاری (نغمات، گیت، غنائیے، ڈرامے، فیچر اور دوسروں کیے لیے تقاریر لکھنا) اور پروڈکشن۔ یہ ملازمت سالانہ کانٹریکٹ کی بنیاد پر ہوتی اور جن ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کو اس زُمرے میں شامل کیا جاتا انہیں ریڈیو کی اصطلاح میں ’اسٹاف آرٹسٹ‘ کہا جاتا جن دنوں میں نے یہ ملازمت اختیار کی اُن دنوں کراچی ریڈیو پر احمد فراز، سلیم احمد اور عبدالماجد سے لے کر چراغ حسن حسرت، بہزاد لکھنوی اور رفیع پیرزادہ تک سبھی اسٹاف آرٹسٹ ہوتے تھے میں چونکہ ہندوستان میں بھی نشریات کا تجربہ رکھتا تھا اس لیے مجھے فوری یہ ملازمت مل گئی مگر اسے میری طبیعت کی سیمابیت کہیے کہ نوجوانی کے باغیانہ جذبات۔۔۔ میں افسرانِ بالا کی مستقل خوشنودی حاصل نہ کر پاتا اور کسی نہ کسی بہانے میری ملازمت ختم ہو جاتی۔ پھر عارضی طور پر میں کبھی انجمن ترقی اردو میں کام کرتا یا کسی اخبار میں۔۔۔ اور پھر کسی کرم فرما کی توجہ سے مجھے دوبارہ ریڈیو کا کانٹریکٹ مل جاتا۔ میری زندگی میں یہ واقعات چونکہ نئے نہیں تھے اس لیے مجھے چنداں فکر بھی نہ ہوتی۔ شاید کچھ بزرگوں اور دوستوں کو یاد ہو کہ ۱۹۵۰ء میں آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے یکایک ملازمت ختم ہو جانے اور کوئی ذریعہ معاش نہ ہونے کے سبب میں نے اخبار فروشی بھی کی تھی مگر یہ وہ دور تھا کہ ایک خاص

ذہنی ہم آہنگی کی وجہ سے دور دراز رہنے والے ادیب بھی ایک دوسرے سے بہت قریب ہوتے تھے چنانچہ میری زندگی کے اس معمولی واقعہ پر جب قمر ساحری اور وہاب حیدر نے احتجاج کیا تو نہ صرف دکن کے ادیبوں اور صحافیوں نے آواز اٹھائی بلکہ مرزا ادیب نے 'ادبِ لطیف' (لاہور) میں، فکر تونسوی اور نریش کمار شاد نے 'نقوش' (جالندھر) میں، ساحر لدھیانوی اور پرکاش پنڈت نے 'شاہراہ' (دہلی) میں اور عادل رشید، کیفی اعظمی اور خواجہ احمد عباس نے 'شاہد' 'نئی زندگی' 'بلٹز' اور 'کراس روڈس' (بمبئی) میں متواتر احتجاجی کالم لکھے۔ یہی نہیں بلکہ حیدر آباد دکن کے ایک صحافی اور میرے بچپن کے دوست ممتاز اختر نے تمام احتجاجی تحریروں کو جمع کر کے اپنے ہفتہ وار 'پرواز' کا ایک نمبر بھی شائع کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں نہ صرف اپنے مسائل سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بڑھتا بلکہ دوسروں کے مسائل میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی آرزو بیدار رہتی۔

کراچی میں ہر چند ایسی فضا نہیں تھی مگر چند ہم خیال دوستوں کی رفاقت دل میں ایک امنگ ضرور پیدا کیے رہتی چنانچہ کراچی میں جب کبھی مجھ پر ایسی افتاد پڑی، میں حوصلہ مندی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتا رہا۔ یہاں میں نے زندگی اس عالم میں شروع کی تھی کہ جسم پر تن کے کپڑوں اور رہنے کیلئے ایک جھونپڑی کے سوا کچھ نہ تھا۔ کراچی کی لمبی لمبی سڑکوں پر اکثر پیدل گھومتا اور بھٹیار خانوں میں ایک یا دو وقت کھانا کھاتا۔ کبھی کبھی فاقے بھی کرنا پڑتے۔ اپنے کپڑے خود دھوتا اور اکثر بغیر استری کے پہن لیتا۔ ظاہر ہے کہ ایسے عالم میں شہر کے سفید پوشوں کے درمیان میرا گزر ممکن نہ تھا۔ ریڈیو کے افسران بالا بھی ایک نظر دیکھ کر منہ پھیر لیتے تھے۔ اس کا ردعمل میری اُس دور کی شاعری میں موجود ہے۔ دل میں باغیانہ جذبات سلگتے رہتے اور میں انہیں اپنے اشعار میں منتقل کر کے اپنی دانست میں یہ سمجھ لیتا کہ میں نے انقلاب کے لیے زمین ہموار کر لی۔ دراصل یہ نوجوانی کی رومانوی سوچ تھی جو مجھے خوش فہمی میں مبتلا کر کے مطمئن ہو جایا کرتی تھی۔

اُس دور کی زندگی کا ایک واقعہ سناؤں جس نے میرے اندر ایک نئے احساس کو جنم

دیا۔ میری بیوی شہر کے ایک اسکول میں ادیب فاضل کا امتحان دے رہی تھی اور میں اپنی بیٹی جاوداں اور بیٹے روشن خیال کو لیے صدر کی سڑکوں پر اُن کا دل بہلا رہا تھا۔ فٹ پاتھ پر کسی دوکان میں کوئی چیز دیکھ کر روشن خیال مچل گیا۔ میں دوکان دار سے بات کرنے لگا اور جاوداں میری انگلی چھوڑ کر کچھ آگے نکل گئی۔ جیسے ہی مجھے خیال آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ تھوڑے سے فاصلے پر سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ایک کار کو دیکھنے میں مصروف ہے۔ کار میں کچھ پیارے پیارے بچے بیٹھے ہوئے تھے اور جاوداں ہچکچائی ہوئی نظروں سے اُنہیں دیکھ رہی تھی۔ میں قریب گیا تو وہ مجھے کہنے لگی

'ابو۔۔۔ یہ بڑے لوگ ہیں نا؟'

جاوداں کا یہ فقرہ مجھے تیر کی طرح لگا۔ میں نے اُسے احساس کمتری سے نکالنے کے لیے کہا۔ 'نہیں بیٹی۔۔۔ یہ بچے بھی تمہاری طرح ہیں۔ چلو، اِن سے باتیں کرو'

جیسے ہی میں جاوداں کو لے کر ان بچوں کی طرف بڑھا۔ بچے ڈر گئے اور جلدی سے کار کا شیشہ چڑھا لیا۔ شاید میری ہیئت ایسی ہو مگر مجھے اس کا احساس نہیں تھا۔ میں نے ان بچوں سے اپنی بیٹی کا تعارف کرانا چاہا۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے مجھے دیکھتے رہے اور ابھی میں ان سے مخاطب ہی تھا کہ بچوں کے والدین آ گئے اور صاحب نے تشویش اور حقارت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ 'کون ہے تو۔۔۔ یہاں کیا کر رہا ہے؟'

مجھے غصہ آ گیا، مگر میں نے ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔

'جناب۔۔۔ میری بچی آپ کے بچوں کو دیکھ کر احساس کمتری میں مبتلا ہو رہی تھی۔

میں نے چاہا کہ ان کا آپس میں تعارف کرا دوں۔۔۔ تا کہ۔۔۔'

ابھی میں جملہ مکمل بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ کار میں بیٹھ گئے اور غصے اور نفرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ جاوداں نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور میں دل ہی دل میں تلملا کر رہ گیا۔ وہ سوالیہ نظریں اور کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز عرصے تک

میری آنکھوں میں چمکتی اور میرے کانوں میں گونجتی رہی اور میں نے طئے کرلیا کہ اپنے بچوں کو اس احساس میں مبتلا نہیں ہونے دوں گا جس نے میری رگوں میں زہر بھر دیا ہے۔اب سوچتا ہوں تو مجھے اپنے اس ارادے میں خودغرضی کا جذبہ بھی شامل نظر آتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں صبح وشام ایسے کتنے دل شکن واقعات ہوتے رہتے ہیں ۔ ان کے بارے میں ہمارے سوچنے کا انداز ہمدردانہ سہی مگر قدرے رسمی ہوتا ہے اور ہم عملاً اس کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھاتے ۔شاید ہمارے انفرادی عمل سے معاشرے کے یہ مسائل حل بھی نہ ہوں۔اس کے لیے تو اجتماعی عمل کی ایک مستقل تحریک چاہیے جس کا شعور ابھی ہمارے عوام میں نہیں۔

کراچی ویسے بھی تجارتی شہر ہے اور زیادہ تر ان لوگوں سے آباد ہے جن کا رشتہ زمین سے ٹوٹ چکا ہے ۔ زمین سے رشتہ ٹوٹ جانے سے بہت سی اقدار بھی ٹوٹ جاتی ہیں اور معاشی بنیادوں کی ناہمواری انسان کو خودغرض بنانے لگتی ہیں۔ایسے عالم میں اگر سیاسی حالات بھی متوازن نہ ہوں تو معاشرہ ایک ہمہ گیر بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے اور اٹل حقیقتوں پر اس کا یقین کمزور پڑنے لگتا ہے۔'ایسی صورت میں صرف تہذیب اور تاریخ ہی انسان کا سہارا بنتی ہے اور جب یہ سہارا بھی باقی نہ رہے تو انسان اپنی ذات میں محدود تر ہونے لگتا ہے اور زندگی علاقائی اور خاندانی حدود میں سمٹنے لگتی ہے ۔کراچی کے مختلف محلوں کے نام خود اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ شہر کتنے خانوں میں تقسیم ہے ۔اس کا تشخص اپنی اکائی کھوتا جا رہا ہے اور تہذیبی وحدت نہ ہونے کی وجہ سے مختلف اکائیاں صرف تجارتی رشتوں میں منسلک ہیں ۔ ظاہر ہے کہ یہ رشتے سودوزیاں کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں اور ضروریات کے کچے دھاگوں میں بندھے رہتے ہیں ۔

دنیا کے ہر تجارتی شہر میں رشتوں کی نوعیت یہی ہوتی ہے مگر ایسا شہر جو نو آبادکاروں سے آباد ہو'وادیِ سینا' کی مثال ہو جاتا ہے کہ قوم تو اُمتِ موسیٰ کہلاتی ہے اور پوجا کرتی ہے سامری کے 'گوسالہ' کی ۔ جسے دیکھیے دولت کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔کراچی کا المیہ بھی یہی ہے۔

ایسے شہر میں متوسط طبقہ بڑی الجھن میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ دو پاٹوں کے بیچ دھیرے دھیرے پِستا چلا جاتا ہے اور غیر محسوس طور پر ایک دن اپنا تشخص کھو بیٹھتا ہے ۔حتیٰ کہ وہ اس تہذیب میں بھی ضم ہونے سے رہ جاتا ہے جو اس کا رشتہ نئی سرزمین سے جوڑ سکے۔ مجھ ایسے آدمی کے لیے کراچی میں اک اور بھی مسئلہ تھا۔۔۔اور وہ یہ کہ تجارتی ماحول کی گہما گہمی اور نفسی نفسی سے دل گھبرانے لگے تو کہاں جاؤں؟ بمبئی میں جب کبھی یہ وحشت دل کا بوجھ بنتی تو بھاگ کر اورنگ آباد چلا جاتا تھا اور وہاں کی محدود اور خاموش فضا میں کچھ دن سکون کے سانس لے لیتا مگر یہاں مضافات سے کوئی ایسا تعلق نہ تھا۔ چنانچہ جب حیدرآباد سندھ میں ریڈیو اسٹیشن کھلنے کی نوید ملی تو میں پہلا شخص تھا جس نے ٹرانسفر کی درخواست دے دی اور ۱۹۵۵ء میں حیدرآباد آ گیا۔

حیدرآباد میں مجھے اپنی صلاحیتوں کو فروغ دینے کا اچھا موقع ملا۔ ریڈیو اور شہر کے ادیبوں میں ایسی یگانگت تھی کہ ہمارا ماحول ادبی محفلوں سے جگمگاتا رہتا۔ مجھے بھی گویا ایک نئی زندگی ملی تھی۔ میں بھی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔

وہ دور، لکھنے پڑھنے کے اعتبار سے میری زندگی کا اہم ترین دور تھا۔ میں نے اُس دور میں نہ صرف شعر کہے بلکہ متعدد منظوم اور منثور ڈرامے بھی لکھے ۔'ارژنگ' کے تحت مختلف ثقافتی خدمات بھی سرانجام دیں ۔ دوماہی رسالہ 'شعور' بھی شائع کیا۔ پہلے مجموعۂ کلام 'آگ میں پھول' کی اشاعت پر بھی اِسی دوران توجہ دی اور سب سے اہم کام یہ کیا کہ اپنی ادھوری تعلیم مکمل کر لی۔ کچھ عرصے سچل کالج میں پڑھایا اور استاد مکرم ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کے لیے اپنا تحقیقی مقالہ لکھنا شروع کر دیا مگر اِسے زندگی کی ستم ظریفی کہیے کہ اپنے عہد کا جبر۔۔۔کہ معاشی مسائل نے پھر مجھے اپنے دام میں الجھا لیا اور میں نے فلموں میں نغمہ نگاری شروع کر دی۔

فلم انڈسٹری میں جانے والا ہر سنجیدہ آدمی کچھ تعمیری عزائم بھی ساتھ لیکر جاتا ہے اور اپنی دانست میں یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی تبدیلی کا عنوان بن جائے گا چنانچہ میں نے بھی نغمہ نگاری اور مکالمہ

نویسی سے لے کر فلمسازی اور ہدایت کاری تک ہر شعبۂ فلم کو نہایت سنجیدگی سے اپنایا اور اپنے حدود میں روایت سے کسی حد تک مختلف کام بھی انجام دیئے ان خدمات کا صلہ مجھے کچھ ایوارڈز کی صورت میں بھی ملا مگر رفتہ رفتہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں جو کچھ پا رہا ہوں، اس سے زیادہ کھو بھی رہا ہوں

ٹھہرے ہوئے پانی میں پتھر پھینکنے سے کچھ لہریں ضرور پیدا ہو جاتی ہیں مگر کوئی ایسا تموّج پیدا نہیں ہوتا کہ پانی کا رخ بدل جائے۔۔۔ پاکستان کی فلم انڈسٹری میں ہم چند خوش فہم لوگوں کی شمولیت بھی اسی مثال کے مصداق تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لاحاصل سے زیادہ ’حاصل کا غم‘ میری روح کا المیہ بن گیا۔

روٹی کے لیے طاق پہ رکھ دوں گا کتابیں
جینا مجھے اِس طرح گوارا تو نہیں تھا

لٹا دیا ہے غمِ آب و تاب میں کیا کیا
وگرنہ خواب تھے چشمِ پُر آب میں کیا کیا

روشنی کے زاویوں پر منحصر ہے زندگی
آپ کے بس میں نہیں ہے آپ کا سایہ یہاں

یہ اور اس قسم کے بہت سے شعر اُسی دور کی یادگار ہیں۔ جیسا کہ میں نے ’آگ میں پھول‘ کے دوسرے ایڈیشن کے دیباچے میں لکھا ہے۔

’سچ پوچھئے تو عمر کے یہ سنہری سال میں نے ایک ایسے برزخ میں کاٹے جس کے بعد حقیقی ادبی زندگی کی آس ایک موہوم خوش فہمی اور خود فریبی سے زیادہ نہ تھی اور جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ مجھے اس زیاں کا احساس بھی تھا مگر یہی سوچ کے خاموش

ہو رہتا کہ وقت نے یہ سنگین مذاق صرف میرے ساتھ تو نہیں کیا ہے۔ تاریخ میں میرے جیسے کتنے شاعر و ادیب اپنے حالات سے مجبور ہو کر بازار میں جا بیٹھے، چاہے وہ بازار کسی بادشاہ کے دربار میں لگا ہو یا فلمی دنیا کے مصنوعی محل دو محلوں میں۔

’میں سوچتا کہ اس جال سے نکل بھاگوں مگر جس زمین پر یہ جال بچھا ہوا تھا وہ ایک دلدل سے کم نہ تھی۔ میری ہر کوشش مجھے کچھ اور زمین میں اتار دیتی۔ ایسے عالم میں علم و ادب کے خواب طوفان سے ساحل کا نظارہ کرنے کے مترادف ہوتے اور میں ایک کربناک حسرت کے ساتھ آنکھیں بند کر لیتا‘

’مٹی کا قرض‘ کی ترتیب کے دوران میں اسی کرب میں مبتلا تھا۔ میری آخری فلم ’گڑیا‘ ادھوری تھی اور میرے دل میں فلم انڈسٹری چھوڑ دینے کا ارادہ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ اُن دنوں کی ایک ’غزل‘۔

پندارِ یوسفی سہی، پندار ہی تو ہے
بازار کی یہ شئے سرِ بازار ہی تو ہے

میرے اندرونی خلجان اور میرے غم و غصہ کا آخری اظہار ہے۔

میں بھی اَنا پرست ہوں اقرار کیا کروں
میرے لبوں پہ آج بھی انکار ہی تو ہے
(مٹی کا قرض)

اور میں اپنی فلم ادھوری چھوڑ کے فلم انڈسٹری سے باہر آ گیا اور پھر تلاشِ معاش میں سرگرداں ہو گیا۔ کبھی ٹیلیویژن اور کبھی مختلف کانٹریکٹ۔۔۔ جن میں نیشنل سیونگس کے نغموں سے لے کر طباعت کے ٹھیکے تک شامل تھے۔

زندگی کی اس طویل، متنوع اور مسلسل جدوجہد میں میں نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ اس کا

مختصر تجزیہ یہ ہے کہ میں تو اپنی ذات میں ادھورا رہ گیا مگر اپنے بچوں کو۔۔۔ تکمیل ذات کی خاطر۔۔۔ اعلیٰ تعلیم دلا دی۔ اب دیکھیے اُن کی زندگی انھیں کس منزل تک پہنچاتی ہے۔ میرے چار بیٹے ہیں اور چار بیٹیاں (تازہ ایڈیشن کی اشاعت تک تمام بچے نہ صرف 'اعلیٰ تعلیم' سے آراستہ ہو گئے بلکہ اپنی عملی زندگی میں آکر اپنے بچوں کو بھی اعلیٰ تعلیم سے سرفراز کر چکے ہیں) ظاہر ہے کہ یہ کامیابیاں میری تنہا کوششوں کا حاصل نہیں، میری ہر کامیابی میں حقیقی اعزاز کی مستحق میری شریکِ حیات ہے جس نے زندگی کے کٹھن سے کٹھن مرحلے میں مسکراتے ہوئے میرا ساتھ دیا اور مثالی انداز میں اپنے بچوں کی تربیت کی۔ اس پہلو سے میں جب بھی اپنے بارے میں سوچتا ہوں تو کچھ دیر کے لیے اپنی ذات کے تشنۂ تکمیل رہ جانے کا غم بھی بھول جاتا ہوں اور اپنے بچوں میں اپنی ذات کو بٹا ہوا دیکھ کر یوں خوش ہو لیتا ہوں کہ ؎

میں اِک اکائی کے مانند ہر عدد میں ہوں

(ہارون کی آواز)

یا جیسا کہ میں نے اپنی بیٹی جاوداں میر پر لکھی ہوئی نظم میں کہا ہے ؎

نئے خد و خال سے ہمارے جسد کی تشکیل ہو رہی ہے
ادھورا پن ختم ہو رہا ہے، ہماری تکمیل ہو رہی ہے

(آگ میں پھول)

بادی النظر میں اسے بھی خود فریبی کا اک بہانہ کہیے ورنہ حقیقت بہر حال اپنی جگہ ایک المیہ ہے کہ معاشی وسائل کے بہ آسانی بہم نہ ہونے کی وجہ سے کتنی ہی شخصیتیں ادھوری رہ جاتی ہیں کتنے لوگ اپنے اصلی چہرے کھو بیٹھتے ہیں اور ساری زندگی مصنوعی چہرے لگائے پھرتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں زندگی کے ہاتھوں ایسا کھلونا نہیں بنا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جہاں بینی کے ساتھ میں نے ہمیشہ خود بینی کو بھی مقدم سمجھا ہے اسی عمل نے مجھے نامکمل رہ جانے کا احساس دیا اور اسی عمل

نے میرے اندر تکمیل کی لگن کو ابھی تک تازہ رکھا ہے۔

'تشنگی کا سفر' میری زندگی کا بھی استعارہ ہے اور میری شاعری کا بھی۔ شاعری میں نظم، غزل اور ثلاثی کے علاوہ طویل نظمیں اور منظوم اور نثری ڈرامے بھی میرے تخلیقی اضطراب کے ضامن ہیں یہ اور بات کہ اپنی بیشتر تخلیقات پر میں عرصہ دراز تک نظرِ ثانی کر سکا نہ انھیں طباعت کے لیے دے سکا۔ اب اس طرف توجہ کی تو اپنی 'مجرمانہ غفلت' کا احساس ہوا۔

فی الحال جو کتابیں مرتب کی ہیں ان میں 'آگ میں پھول' اور 'تشنگی کا سفر' ایک ساتھ طبع ہو رہی ہیں۔ دوسری کتابیں بھی انشاء اللہ جلد ہی منظر عام پر آ جائیں گی۔ 'تشنگی کا سفر' (حسب ترتیب) دو افسانوی اور دو تمثیلی نظموں پر مشتمل ہے۔ افسانوی نظمیں 'شعلۂ بے دود' اور 'بنگال سے کوریا تک'۔۔۔ 'آگ میں پھول' کے پہلے ایڈیشن ۱۹۵۶ء میں شامل تھیں۔ دوسرے ایڈیشن سے یہ نظمیں نکال کر میں نے طویل نظموں کے اس مجموعے میں شامل کر دی ہیں۔ 'شعلۂ بے دود' ۵۲ء میں لکھی گئی تھی اور اسی سال 'ادبِ لطیف' (لاہور) جولائی کے شمارے میں شائع ہوئی۔ 'بنگال سے کوریا تک' ۵۲ء اور ۱۹۵۴ء کے دوران لکھی گئی اور اس کے مختلف حصے کراچی کے مختلف رسائل۔۔۔

اردو کالج کے مجلّہ 'برگِ گل' (پہلا شمارہ ۱۹۵۲ء) مرتبہ، ابن انشاء اور اے آر ممتاز
ماہنامہ 'مشرب' (مئی ۱۹۵۳ء) ایڈیٹر، اختر انصاری اکبر آبادی
ڈائجسٹ 'روحِ ادب' (۱۹۵۳ء) مرتبہ، پروفیسر ممتاز حسین
ماہنامہ 'سیارہ' (ستمبر ۱۹۵۳ء) ایڈیٹر، پروفیسر ممتاز حسین اور
'نیا دور' (شمارہ ۳، ۴) ایڈیٹر، ڈاکٹر جمیل جالبی

میں شائع ہوتے رہے۔

بعد ازاں پوری نظم وامق جونپوری کے زیر ادارت ماہنامہ 'شاہراہ' دہلی کے شمارہ نمبر ۳ (بسلسلہ سالنامہ) مارچ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ پھر یہی نظم ۱۹۶۲ء میں ساہتیہ اکیڈمی حیدر آباد

(آندھرا پردیش) کے زیر اہتمام شائع ہونے والی کتاب 'حیدر آباد کے شاعر' کی جلد دوم میں سلیمان اریب نے منتخب کی۔ اس نظم کا موضوع 'جنگ' ہے اور یہ دوسری جنگ عظیم کے پس منظر سے شروع ہو کر کوریا کی لڑائی (تیسری جنگ عظیم کے امکانات) پر ختم ہوتی ہے۔

'آگ میں پھول' کے پہلے ایڈیشن میں 'میں اور میرا فن' کے زیر عنوان اپنے مضمون میں چند باتیں میں نے اس نظم کے بارے میں بھی لکھی تھیں۔

'تکنیک کے اعتبار سے میں نے اس میں ایک تجربہ کرنے کی کوشش کی ہے۔۔۔ اکثر جگہ کیفیات کے اظہار میں میں نے اس میں 'مسلسل غزل' کی تکنیک استعمال کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظم کے اندازِ بیان میں ایک خاص ملائمت پیدا ہوگئی ہے۔ یہ ملائمت ایک ایسی نظم کے لیے بہت ضروری تھی جس میں کہانی یادداشت کے طور پر ابھرتی ہو۔۔۔ یہ نظم ایک اور طریقے سے بھی کہی جا سکتی تھی، یعنی مثنوی کے انداز میں۔۔۔ لیکن چونکہ میرا موضوع ایک تاریخی المیے سے اکتسابِ فکر کرتا ہے اس لیے کہانی کے تسلسل سے زیادہ اُن مخصوص واقعات کو میں نے اہمیت دی جو نظم کے بنیادی خیال کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

ایک اور بات جو آپ اس نظم میں محسوس کریں گے۔ ایک 'تاریخی غلطی' ہے۔ جب اس کہانی کا مرکزی کردار میدانِ جنگ سے اپنے وطن بنگال واپس آتا ہے تو وہاں قحط کی تباہیاں دیکھتا ہے۔ حالانکہ بنگال میں قحط ۱۹۴۲ء میں پڑا تھا اور گزشتہ عالمگیر جنگ ۴۵ء میں ختم ہوئی۔ تین سال کے عرصہ میں ظاہر ہے کہ قحط کے آثار اُس طرح باقی نہیں رہے ہوں گے جس طرح نظم میں پیش کئے گئے ہیں مثلاً

میرے ٹیگور کی زمیں پر آج
لاشوں ڈھانچوں کا بس گیا تھا جہاں
اِس قدر تھا کریہہ ہر منظر
جیسے قئے کر چکا ہو قبرستاں

دراصل بنگال کے قحط کا جنگ سے تعلق میرا بنیادی موضوع ہے اور یہ واقعہ ہے کہ بنگال کا قحط قدرتی نہیں بلکہ 'مصنوعی' تھا اور اس کا عالمگیر جنگ کی تباہ کاریوں سے بھی 'ایک تعلق' ضرور تھا خیر، میری نظم میں بنگال اور کوریا جغرافیائی حدود کے پابند رہ کر بھی ایک سمبل کے طور پر آئے ہیں۔ بنگال۔۔ ایک ایسا مقام جو جنگ سے دور رہ کر بھی اُتنا ہی تباہ ہوگیا جتنا کوریا۔۔ یعنی تازہ ہیروشیما اِس بنیادی خیال کے پیشِ نظر میں نے چند برسوں کے فرق کو نظر انداز کر دیا جو بہت ضروری تھا'۔

تمثیلی نظموں میں 'بدلتے زاویئے' (تمثیلی غنائیہ) ۱۹۵۷ء یا ۱۹۵۸ء میں لکھا گیا تھا اور اُنہیں دنوں ریڈیو پاکستان حیدر آباد سے (قدرے ترمیم کے ساتھ) نشر بھی ہوا لیکن ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔

'شکست کی آواز' (یک کرداری، تمثیلی نظم) ۱۹۶۲ء میں لکھی گئی تھی اور 'فریبِ آگہی' کے نام سے دو تین بار نشر ہو چکی ہے۔ اشاعت کے لیے دیتے وقت جب میں نے اس پر نظرِ ثانی کی تو اس کا عنوان بدل دیا چنانچہ ۱۹۶۵ء میں یہ نظم 'شکست کی آواز' کے عنوان سے 'فنون' لاہور میں شائع ہوئی۔ اس تمثیلی نظم کا بنیادی خیال ایک فرانسیسی ادیب 'مارسل بائنل' کی کہانی سے ماخوذ ہے۔

'تشنگی کا سفر' میں ان نظموں کو شامل کرتے وقت میں نے 'خوب سے خوب تر کی جستجو میں' کہیں کہیں کچھ تبدیلیاں بھی کر دی ہیں جسے 'خود تنقیدی' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

حمایت علی شاعر

(شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی، جام شورو)

(۱۹۸۰ء)

شعلۂ بے دُود

(صیغۂ واحد متکلم میں ایک طویل افسانوی نظم)

(متوسط طبقے کے ایک نوجوان کی کہانی جو ممکن ہے میری اور آپ کی داستان نہ ہو مگر وہ 'تیسرا شخص'
جو ہمارے اندر چھپا بیٹھا ہے شاید اِس کہانی میں اُسے اپنا کردار نظر آجائے)

(مطبوعہ۔ ماہنامہ ادبِ لطیف، لاہور۔ جولائی ۱۹۵۲ء)

اُس کی نظروں کی خواب گاہوں میں
بجلیاں سو رہی تھیں، کیا معلوم
میں نے یوں ہی ذرا جگایا کیا
زندگی کا بدل گیا مفہوم

کیا خبر تھی جبیں کی شکنوں میں
اب بھی کوئی کرن ہے سوئی ہوئی
عارضوں کی اترتی دھوپ میں بھی
چاندنی کی چبھن ہے سوئی ہوئی

زلف، جس طرح مقبروں کی شام
ہونٹ، جس طرح کاغذی کلیاں
روپ، جس طرح پچھلی شب کا چاند
سر سے پا تک سکوت کا عنواں

کیا خبر تھی کہ اس خموشی میں
موج در موج ہے کوئی طوفاں
اس مجسم خزاں کے خوابوں میں
جاگتے ہیں بہار کے ارماں

لرزشِ لب میں گفتگو کی امنگ
کروٹیں لے رہی ہے میرے لیے
بجھتی نظروں کے طاق میں، دل کی
شمع، لو دے رہی ہے میرے لیے

میری نظروں کی شوخیِ گفتار
خامشی کا طلسم توڑ گئی
دل کی دھڑکن لجائی شرمائی
اک تبسم لبوں پہ چھوڑ گئی

اس نے مجھ سے کہا تو کچھ بھی نہیں
اک تبسم تو اس کی بات ہی کیا
میں نے ہنس کر جواب دے بھی دیا
اور عورت کی کائنات ہی کیا

میں کہ میری نظر، مرا ادراک
زیست کے کہنہ فلسفوں کا شکار
میرے نزدیک ارتقاء کا کمال
زندگانی کا تاجرانہ وقار

وہ کہ بے آب و رنگ اک تصویر
اپنے سینے میں جان رکھتی تھی
خاکِ پا بھی نہ ہو کے، پاؤں تلے
سیکڑوں آسمان رکھتی تھی

میری اِک چھیڑ، ایک کھیل ہی تھا
ٹوٹے تاروں سے راگ پھوٹ پڑے
میری نظروں سے چھپ کے دور کہیں
چند تارے فلک سے ٹوٹ پڑے

مسکراہٹ نے اشک پی پی کر
راز کتنے چھپائے کیا معلوم
آنکھوں آنکھوں میں دل کی دھڑکن نے
گیت کتنے سنائے کیا معلوم

میری ویران خلوتوں کا سکوں
اپنی غربت سے برسرِ پیکار
اس کی تنہائیوں کے سہمے خواب
کھلتی مرجھاتی غنچگی کے دیار

اور آخر کھنکتے سکوں کی
خواب گوں لے سلا گئی مجھ کو
میرے ماحول کی بکھرتی گرد
اپنی چادر اڑھا گئی مجھ کو

دور نظروں میں جنتِ زر کا
اِک دریچہ کہیں سے کھل ہی گیا
میرے احساس کے تقدس میں
نظمِ دوراں کا زہر گھل ہی گیا

پیش و پس کے اداس ویرانے
رنگ و نکہت کے شہر تھے جیسے
کاسۂ نیلگوں میں رقص کناں
چاند تاروں کے روپے پیسے

میری مسجود، اِک بُتِ طناز
زرگرِ وقت کا نیا شہکار
جس کے قدموں میں مہر و ماہ و نجوم
جس کے پیکر میں بس گئی تھی بہار

زلف، جس طرح میکدے کی شام
ہونٹ، لالے کی ادھ کھلی کلیاں
روپ، جس طرح چودھویں کا چاند
سر سے پا تک حیات کا عنواں

جب کبھی وہ قدم اٹھاتی تھی
کہکشاں راستہ بنا دیتی
جس طرف بھی نگاہ کر لیتی
برق شرما کے منہ چھپا لیتی

بات کرتی تو پھول ہنس پڑتے
مسکراتی تو صبح ہو جاتی
گنگناتی تو ساز بج اٹھتے
زندگی میٹھی نیند سو جاتی

خلوتوں کی خموش گفتاری
جلوہ گاہوں کے راز کی غماز
حرمِ خاص میں کھنکتے جام
ناچتے گاتے میکدوں میں نماز

میری نظروں کے عکس زاروں میں
ایک جنت خرام فرما تھی
کعبۂ دل میں خم بدوش کوئی
دخترِ زر قیام فرما تھی

دختر زر کہ جس کے ہونٹوں پر
روپیوں کی کھنک بکھرتی ہوئی
دختر زر کہ جس کی آنکھوں میں
روپیوں کی چمک نکھرتی ہوئی

دختر زر کہ جس کی زلفوں پر
روپیے، کہکشاں لٹاتے ہوئے
دختر زر کہ جس کے نقش قدم
روپیے، ڈھالتے بناتے ہوئے

میں کہ میری نظر، مرا ادراک
ڈھلتے سکوں کے شور میں بے خواب
مجھ کو معلوم کیا کہ کس دل کی
خلوتیں ہیں مرے لیے بے تاب

میرے خوابوں میں کب سے رقص کناں
میرے مسجود کی جوانی تھی
بھاؤ چڑھتے اترتے جاتے تھے
جرأت اک اور آزمانی تھی

مجھ کو معلوم کیا کہ میرے لیے
کس کے عارض پہ کھل رہے ہیں گلاب
میری خاطر سنورتا جاتا ہے
کوئی غربت گزیدہ مست شباب

مجھ کو معلوم کیا کہ میری نظر
کس کے ہونٹوں پہ بن گئی ہے کرن
کس کی تنہائیوں کی ویرانی
میری خاطر بنی ہوئی ہے دلہن

میری ہلکی سے مسکراہٹ نے
کس کی راتوں کو بخش دی ہے سحر
مجھ کو معلوم کیا کہ میرے لیے
ٹوٹتے ہیں پلک پلک سے گہر

کس کے خوابوں میں کوئی تاج محل
سہما سہما ابھرتا آتا ہے
اور پھر یک بہ یک نہ جانے کیوں
دل دھڑکتے ہی ٹوٹ جاتا ہے

میں کہ میرے شعور کا خورشید
زر پرستی کی ظلمتوں کا شکار
میرے آفاق پر محیط ۔۔۔ فقط
دخترِ زر کا سیمگوں پندار

باتوں باتوں میں ایک دن یونہی
میرے خوابوں سے وہ اتر آئی
ذکر چھڑنا ہی تھا کہ ہونٹوں پر
روپیوں کی کھنک ابھر آئی

مجھ کو معلوم کیا کہ تاج محل
کس کے اشکوں میں ڈوب کر ابھرا
کس امارت نے، کس غریبی کے
دل سے سارا لہو نچوڑ لیا

ایک غربت گزیدہ مست شباب
خامشی سے نگاہ موڑ گئی
اس نے مجھ سے کہا تو کچھ بھی نہیں
اک تبسم لبوں پہ چھوڑ گئی

وہ تبسم کہ مستقل اک طنز
بادشاہی کی روتی آنکھوں پر
وہ تبسم کہ جس کی تابانی
صَرف ہوتی رہی ہے تاجوں پر

وہ تبسم کہ جس کی زندہ لاش
دفن کر دی تھی میں نے ہونٹوں میں
وہ تبسم کہ ہو گیا تحلیل
زرگری کے طفیل اشکوں میں

اشک، دل کے مزار کی شمعیں
اشک، طغیانیوں کا ساکت جوش
اشک، تابوت مسکراہٹ کے
دوشِ مژگاں پہ منجمد، خاموش

روپے، چاند سی، ہتھیلی میں
مجھ کو جنت نئی دکھاتے رہے
میرے برخود غلط تفکر کو
زرگری کا سبق پڑھاتے رہے

بھاؤ چڑھتے رہے اترتے رہے
بات بن بن کے ٹوٹ جاتی رہی
میری جنت مری نگاہوں سے
دور جاتی قریب آتی رہی

اک خدائے زمیں نے آخرِ کار
اپنی بانہوں میں اس کو بھینچ لیا
میں خلاؤں میں جھولتا ہی رہا
اور روپے نے روپے کو کھینچ لیا

میں نے اس سے کہا تو کچھ بھی نہیں
خامشی سے نظر کو پھیر لیا
اور پھر یک بہ یک مرے دل کو
سیکڑوں آنسوؤں نے گھیر لیا

اشک، دل کے مزار کی شمعیں
اشک، طغیانیوں کا ساکت جوش
اشک، تابوت مسکراہٹ کے
اشک، غربت کی آتشِ خاموش

اشک جن کی چمک پہ سکّوں کی
تابناکی نے دھند برسا دی
اشک جن کے خنک شراروں نے
میری رگ رگ میں آگ دوڑا دی

آگ، لاشوں کے قلب کی دھڑکن
آگ، پیہم سکوت کا طوفاں
آگ، محرومیوں کی تشنہ لبی
آگ، غربت کا آخری ارماں

اور یہ آگ کر گئی روشن
مجھ پہ تاریخ کے مقدس راز
ہر گناہِ عظیم کے پیچھے
کس خدا کا ہے دستِ کار دراز

کس نے فکر و شعور کی پرواز
آتشیں منزلوں میں برفا دی
آفتابی نگاہ کی تقدیر
چند تاروں کی ضو میں الجھا دی

ایک غربت گزیدہ مست شباب
خامشی سے نگاہ موڑ گئی
کچھ نہ کہہ کر بہت سی باتوں کو
تھر تھراتے لبوں پہ چھوڑ گئی

وہ چلی تو گئی مگر اب تک
آہٹ آہٹ پہ دل دھڑکتا ہے
بجھ گئی انتظار کی ہر شمع
دل میں اک شعلہ سا بھڑکتا ہے

بنگال سے کوریا تک

(صیغۂ واحد متکلم میں ایک طویل ترین افسانوی نظم)

(مطبوعہ 'شاہراہ' دہلی۔ سالنامہ مارچ ۱۹۵۴ء)

یہ کہانی آپ بیتی نہیں، لیکن آپ بیتی ہوسکتی ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار 'میں' میں بھی ہوسکتا ہوں اور آپ بھی۔۔۔ کیونکہ گزشتہ عالمگیر جنگ میں بنگال، جنگ سے دور رہ کر بھی لاکھوں انسانوں کا مدفن بن گیا اور کوریا۔۔۔ تازہ ہیروشیما ہے اور یہ ہیروشیما جتنی تیزی سے پھیلتا جائے گا، بنگال کی وسعتوں میں بھی اسی سرعت سے اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس پس منظر کی روشنی میں اس کہانی کا مرکزی کردار 'انفرادی' ہونے کے ساتھ ساتھ ایک 'اجتماعی کردار' بھی ہے۔

اور آج نئی عالمگیر جنگ کا ہولناک اندیشہ
دنیا کے ہر انسان کے دل میں
ایک سوالیہ علامت بن گیا ہے

کیا ہماری نئی نسل بھی جنگ کا ایندھن بن جائے گی؟

یادوں کے غبار میں

آئینہ خانۂ تصور میں
ایک اِک نقش اُبھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھر تھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

وہ مرا گاؤں ---۔ میرا اپنا وطن
میری جنت ---۔ مرا جہنم زار
چند اونچی حویلیوں کے گرد
زندہ لاشوں کی تربتوں کا دیار
سبز شاداب کھیتیوں کے بیچ
بھوکی ننگی حیات کا بازار
ارتقائے جہاں کی پستی کے
ہر فریب حسیں کا آئینہ دار
حسن فطرت کا سادہ لوح امیں
زرگزیدہ سماج کا شہکار

اسی جنت ---۔ اسی جہنم میں
غنچے چٹکے، کھلے، گلاب ہوئے
اسی چھاؤں کی نرم حدت میں
ذرے تپ تپ کے آفتاب ہوئے

نوجوانی کہ موجِ طوفاں جوش
نوجوانی کہ آندھیوں کا خروش
پتھروں کی رگوں میں کھولتی آگ
زندگی کے لہو کا نقطۂ جوش
ایک فرزانگی ---۔ جنوں کی سی
ایک دیوانگی ---۔ بقیدِ ہوش
ایک بے چینی، پُرسکوں، شیریں
اک سکوں اضطراب در آغوش
ایک خاموشی ---۔ اپنے شور میں گم
ایک غوغا مگر بہت خاموش

کس قدر تھے حسین وہ دن رات
کتنا دلکش تھا زندگی کا روپ
ایک ہی بات تھی مرے نزدیک
چاندنی ہو کہ چلچلاتی دھوپ

جہل زائیدہ فکر و احساسات
پتھروں کو نگیں سمجھتے رہے
اک مقدس فریب میں آ کر
آسماں کو زمیں سمجھتے رہے
ہر توّہم کے آستانے پر
سجدہ ریزی کو دیں سمجھتے رہے
چیتھڑوں کے کفن میں دفنا کر
زندگی کو حسیں سمجھتے رہے
اشک پی پی کے مسکراتے رہے
زہر کو انگبیں سمجھتے رہے

کس کو معلوم ---کوئی کیا جانے
کس نے لوٹی حیات کی تقدیر
کن خداؤں کے جال میں ہے اسیر
لیلیِ کائنات کی تقدیر

ایک مسرت ایک موت

آئینہ خانہ تصور میں
ایک اِک نقش اُبھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

وہ مری سانولی سلونی شام
میری آباد شامِ تنہائی
اپنے ہی دل کی دھڑکنوں پر جب
زندگی پہلی بار شرمائی
مچلی مچلی سی آرزوؤں کو
لوریاں دے رہی تھی شہنائی
میرے خوابوں کے اجڑے کھیتوں میں
ہنستے گیتوں کی فصل لہرائی
ٹوٹی پھوٹی سی ایک کٹیا میں
کہکشاں کی برات اُتر آئی

کس قدر تھے عجیب وہ لمحات
کتنے یک رنگ، کس قدر متضاد
کتنے خاموش، کتنے طوفانی
کتنے پابند، کس قدر آزاد

سوئی سوئی سی ایک بیداری
صبح سے تابہ شام رہتی تھی
نوجوانی کے خواب زاروں میں
عمر محوِ خرام رہتی تھی
اپنا ساقی تھا، اپنا مے خانہ
زندگی غرقِ جام رہتی تھی
شام ہوتی تھی صبح میرے لیے
اور سویرے سے شام رہتی تھی
دوش و فردا سے بے خبر یوں ہی
زندگانی مدام رہتی تھی

کیا خبر تھی کہ ہر بہار کے ساتھ
خار و گل ساتھ ساتھ ہوتے ہیں
عیش و غم زندگی کے بستر پر
ساتھ اٹھتے ہیں، ساتھ سوتے ہیں

ایک جھٹکے میں ٹوٹ ٹوٹ گئے
خود فریبی کے کیف آگیں خواب
بادِ صرصر نے نوچ کر رکھ دی
شبنمی شبنمی قبائے گلاب
ہو گئے چور اک تھپیڑے میں
موج ساحل پہ رقص کرتے حباب
شب نے انگڑائی بھی نہ لی تھی ابھی
زرد پڑنے لگا رخ مہتاب
بھوک کی آگ اتنی تیز ہوئی
رہ گیا گل کی پتھروں کا شباب

زندگی اپنا ہر بناؤ سنگھار
ایک دوکان پر اتار آئی
جھڑ گیا شاخ گل سے ایک اک پھول
میرے گلشن میں جب بہار آئی

غمِ حاصل

آئینہ خانۂ تصور میں
ایک اِک نقش اُبھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

وہ پسینے میں غرق صبح و شام
نوجوانی کے جرم کی پاداش
ہر نفس اپنے سوز میں غلطاں
ہر نظر رہگزارِ فکر معاش
رات کو فکر صبح کھائے ہوئے
صبح کو ایک نان شب کی تلاش
دل میں بے تاب حسرتوں کا ہجوم
روح میں خار مفلسی کی خراش
نوجوانی ۔۔۔ کہ موج طوفاں جوش
نوجوانی ۔۔۔ کہ ایک زندہ لاش

میرے ادراک کے اندھیرے میں
کتنے دیپک سلگ سلگ کے بجھے
راہ میں کتنے سنگ میل آئے
کوئی رستہ سجھا سکا نہ مجھے

میں کہ میرا ضمیر بھی محکوم
میرا احساس، میری فکر غلام
مجھ کو کیا علم ۔۔۔ کتنا اونچا ہے
بزمِ فطرت میں آدمی کا مقام
میری ہر صبح ۔۔۔ ایک صبح حیات
میری ہر شام ۔۔۔ زندگی کی شام
ہو رہے زندگی ہی جب اک موت
کیوں نہ کرتا میں موت ہی کو سلام
پائلی ۰ چاولوں کے بدلے میں
بیچ دی میں نے اپنی عمر تمام

اِک بگل کی صدا پہ رقصاں تھی
میری فکر و نگاہ ۔۔۔ میری جبیں
دل تو ویسے بہت تھا خوش لیکن
میں کہیں تھا ۔۔۔ میری حیات کہیں

۰ بنگال میں اناج کا ایک ناپ

جنگ، تہذیب کا نشاں تھامے
سارے عالم پہ چھائے جاتی تھی
دل میں کانٹے، لبوں پہ پھول کھلائے
خوں مسلسل بہائے جاتی تھی
صبح فردا کا واسطہ دے کر
شب کی ظلمت بڑھائے جاتی تھی
جھونپڑوں کے چراغ گل کر کے
شہر کے شہر کھائے جاتی تھی
مستقل امن کی قسم کھا کر
زندگی کو مٹائے جاتی تھی

میں کہ جاہل غریب اک دہقاں
مجھ کو اسرار دہر کیا معلوم
ہاں بس اتنا یقین تھا مجھ کو
وہی ہو گا جو ہے مرا مقسوم

وداع

آئینہ خانۂ تصور میں
ایک اِک نقش اُبھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

وہ اُداسی، وہ خامشی، وہ سکوت
کتنی چیخوں کو زیرِ حلق دبائے
لب تک آ آ کے لوٹتا ہر لفظ
ایک انجانے خوف سے تھرائے
ذرے ذرے پہ اپنے خونی دانت
کچکچاتے ہوئے بھیانک سائے
درد چیخوں کا شور لے کے اٹھے
اور ہونٹوں پہ آہ میں ڈھل جائے
دل کی دھڑکن تڑپ کے سر پیٹے
آنکھ چپ چاپ اشک پیتی جائے

کس قدر تھا مہیب وہ منظر
کیسے کیسے خیال دل میں آئے
گھر کے پُر ہول، اداس کونوں میں
زندگی جھانکتے ہوئے گھبرائے

اور پھر جب مرے لرزتے ہونٹ
ماں کے قدموں کو چومنے کو جھکے
کتنے نالوں کا جاگ اٹھا شور
کتنے لاوے تڑپ کے پھوٹ پڑے
چیخیں ٹکرائیں آ کے چیخوں سے
بہنیں، بھائی لپٹ گئے مجھ سے
آسمانوں پہ وار کرتی رہی
ماں کلیجے سے مجھ کو چمٹا کے
اور اک نوجوانی روتی رہی
لگ کے چپ چاپ ایک کھمبے سے

میں کہ ہر چوٹ سہہ گیا چپ چاپ
اپنے سینے پہ رکھ لیے پتھر
سارے گھر کی مسرتوں کے لیے
اپنے دل میں چبھو لیے نشتر

میں چلا تو گیا، مگر یہ اشک
ہر قدم میرے ساتھ آئے
چیخیں کانوں میں گونجتی ہی رہیں
دل نہ بہلا کسی کے بہلائے
ایک لمحہ بھی گر ملے خاموش
گھر کا گھر آنکھ میں سمٹ آئے
بوڑھی عورت کو دیکھ کر سرِ راہ
روح کچھ پیچ و تاب سی کھائے
سوچتے سوچتے نہ جانے کیوں
آنکھ بھر آئے، دل لرز جائے

اور میں اپنے دل کو تھامے ہوئے
زہر پیتا رواں رہا چپ چاپ
دودھ میں دھوئی مامتا کا پیار
رہ گیا چیختا ہوا چپ چاپ

جنگ کے میدان میں

آئینہ خانۂ تصور میں
ایک اِک نقش اُبھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

وہ برستے لپکتے شعلوں میں
دوڑتے، چیختے، چٹختے سر
دیوہیکل گرجتے طیارے
خاک برسر دھواں دھواں منظر
سڑتی گلتی کریہہ لاشوں کے
خون میں تر ہر ایک راہگزر
دل کو اپنی خبر نہ اوروں کی
بہکی بہکی ہوئی ہر ایک نظر
شام زخموں سے چور چور نڈھال
صبح کے لب خموش آنکھیں تر

جس طرف بھی نگاہ پڑ جاتی
موت منہ پھاڑے بڑھتی آتی تھی
زندگی کے حسیں گلابوں کو
اپنے پیروں سے روند جاتی تھی

ہر طرف تھے ہزارہا انساں
اور ہر سو --- مہیب تنہائی
ناگ کی طرح خوف پھن پھیلائے
ذہن مبہوت، آنکھ پتھرائی
آہٹ آہٹ پہ وہ دہلتے دل
کس پہ کیا جانے کیا گھڑی آئی
گونج اٹھی فضا میں کوئی چیخ
اور نظروں میں موت ابھر آئی
چھپتی پھرتی تھی کونے کونے میں
زندگی سہمی سہمی گھبرائی

موت کی زد میں آرزوئے حیات
دل میں کتنی شدید ہوتی ہے
کیا خبر ان کو جن کی ہر ساعت
زندگی کی نوید ہوتی ہے

میں بہ ہر گام سوچتا رہتا
میں کہاں ہوں؟ میری حیات کہاں؟
میری دلہن کہ جس کے سینے میں
'ماںمتا کا غرور' ہے پنہاں
اور میری بہن کہ جس کے خواب
جانے کن جنتوں میں ہیں رقصاں
جس کی خاطر اٹھا کے رکھا ہے
ماں نے اپنے جہیز کا ساماں
زہر کس طرح پی رہے ہوں گے
ان کے دل کے نئے نئے ارماں

اور یکلخت اک دھماکے سے
دل کی دنیا دہل دہل جاتی
ٹوٹ جاتا ہر اک یقینِ حیات
زندگی موت سے بدل جاتی

آگ میں پھول

آئینہ خانۂ تصور میں
ایک اِک نقش اُبھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

وہ مری صبح، میری شامِ حیات
وہ سرِ شب سے صبح کی تگ و تاز
وارڈ کے مرگ اثر سکوت کا شور
زندگانی سے پیار کا غماز
دم بہ دم ڈوبتی ہوئی نبضیں
دم بہ دم تیز، سوچ کی پرواز
کوئی اپنا نہ کوئی بیگانہ
زندگی پھر بھی گوش بر آواز
خشک ہونٹوں کے چیختے کشکول
کوئی یزداں نہ اہرمن دم ساز

کیا خبر تھی کہ ایسے عالم میں
زندگی مسکرا بھی سکتی ہے
موت کے جھکّڑوں کی یورش میں
شمع کوئی جلا بھی سکتی ہے

میری ویران خلوتوں سے دور
میرے گھر میں بہار آئی تھی
زندگی اپنی رفعتوں کا جمال
ایک عورت پہ وار آئی تھی
موت کی زد میں دیکھ کر مجھ کو
نقش اک اور ابھار آئی تھی
اپنے شعلوں میں آپ تپ تپ کر
حسن اپنا نکھار آئی تھی
ایک دنیا کو مٹتا پا کے یہاں
ایک دنیا سنوار آئی تھی

کیا بتاؤں کہ اس گھڑی دل میں
کتنے نشتر نہ گڑ گئے یک لخت
کتنی کلیاں چٹک کے پھول ہوئیں
کتنے گلشن اجڑ گئے یک لخت

میں بصد ضبط و اختیارِ تمام
کچھ عجب کشمکش میں تھا غلطاں
اک طرف موت کا بھیانک خوف
اک طرف دل کے نت نئے ارماں
سوچتا تھا کہ کس لیے آخر
ہم ہیں آپس میں یوں حریفِ جاں
ہم میں کیا دشمنی ہے جس کے لیے
خون اگلتا ہے جنگ کا میداں
زندگی کے سبھی ہیں شیدائی
میں بھی انساں ہوں، وہ بھی ہیں انساں

کتنی مجبور بربریت پر
آج انسانیت اتر آئی
چند سکّوں میں بیچ کر خود کو
زندگی آج تو کدھر آئی!

جب شعلے بجھ گئے

آئینہ خانۂ تصور میں
ایک اِک نقش اُبھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

وہ صبا کے لطیف جھونکوں میں
چہچہاتی ہوئی سحر کی نمود
تیرگی دم بہ دم سمٹتی ہوئی
دم بہ دم پھیلتے شفق کے حدود
روشنی کا نشاں اٹھائے ہوئے
ہر کرن کا وہ فاتحانہ ورود
رات کے مورچے پہ لہراتا
صبح کے دل کا شعلۂ بے دود
ظلمتوں میں بھٹکتے نقشِ قدم
پا گئے اپنی منزلِ مقصود

وقت کی گود سے عروسِ حیات
صحنِ گیتی میں پھر اُتر آئی
ارتقاء کے سسکتے ڈھانچے کی
ڈوبی ڈوبی سی نبض اُبھر آئی

نوجوانی کے بکھرے بکھرے خواب
پھر سنورنے لگے نگاہوں میں
زندگی کی امنگ پھر اک بار
سانس لینے لگی کراہوں میں
جگمگائے تبسموں کے چراغ
بجھتی نظروں کی خانقاہوں میں
دل کی دھڑکن مچل کے ناچ اٹھی
آرزوؤں کی جلوہ گاہوں میں
یوں خراماں تھے نوجواں جیسے
صف بہ صف گلستاں ہوں راہوں میں

میں کہ میرے دھڑکتے سینے میں
جیسے کلیاں چٹک رہی تھیں کہیں
دور حدِ نگاہ سے بھی دور
میری نظریں بھٹک رہی تھیں کہیں

چند سکّوں کی اُجلی چاندی میں
کتنے خوابوں کی صبح تھی خنداں
کتنے چڑھتے دنوں کی شانِ جمال
کتنی راتوں کی مانگ کی افشاں
کتنی مجوب پائلوں کی چھنک
کتنے گیتوں کی نغمگی تھی نہاں
ہنستے کھیتوں کا لہلہاتا شباب
کٹتی فصلوں کا گنگناتا سماں
دل کی دھڑکن میں جھولتے رہتے
کیسے کیسے اچھوتے سے ارماں

میرے ہاتھوں میں آ گئی تھی آج
میرے ایک ایک خواب کی تعبیر
ٹوٹی پھوٹی سی ایک کٹیا پر
رشک کرتی تھی خلد کی تقدیر

اپنا وطن

آئینہ خانۂ تصور میں
ایک اِک نقش اُبھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

وہ مرا دیس --- وہ مرا بنگال
وہ مسلسل بغاوتوں کا وطن
دھان کے کھیت میں سلگتے ہوئے
لوک گیتوں، کہاوتوں کا وطن
بپھری موجوں کی زد میں خیمہ زن
ہنستی گاتی مشقتوں کا وطن
کچی مٹی کے تاج محلوں میں
سانس لیتی محبتوں کا وطن
ہر فریبِ حسیں میں آئی ہوئی
بھولی بھالی عبادتوں کا وطن

جس قدر میں قریب آتا تھا
فاصلہ اور بڑھتا جاتا تھا
دل میں بیتاب آرزوؤں کا
سیلِ موّاج چڑھتا جاتا تھا

سوچتا تھا --- مرے قدم لینے
مہکی مہکی، ہوائیں آئیں گی
بھیگی پلکوں، لرزتے ہونٹوں کی
تھرتھراتی دعائیں آئیں گی
چاند تاروں کی آرتی لے کر
ناچتی اپسرائیں آئیں گی
میرے زخموں کی پیپ دھونے کو
بھیگی بھیگی گھٹائیں آئیں گی
نت نئے گیت گنگناتی ہوئی
بانسری کی صدائیں آئیں گی

کس کو معلوم جنگ کا میداں
کس کی دنیا کو خون دیتا ہے
اور کس کے جہان کو یکسر
اپنے شعلوں میں بھون دیتا ہے

میں تھا اپنے وطن میں اور وطن
سڑتی لاشوں کی ہڈیوں کا دیار
دل کو اپنے گلے لگائی ہوئی
سوکھی بے جان پسلیوں کا دیار
پائلی دھان کے عوض سرِ عام
بکتی ماؤں کا بیٹیوں کا دیار
گھر کی ویرانیوں پہ مہر بہ لب
گرد آلود ڈھیکیوں ٭ کا دیار
جن کی فصلوں سے قحط پھوٹ پڑا
ایسی شاداب کھیتیوں کا دیار

میرے ٹیگور کی زمیں پر آج
لاشوں ڈھانچوں کا بس گیا تھا جہاں
اس قدر تھا کریہہ ہر منظر
جیسے قئے کر چکا ہو قبرستاں

٭بنگال میں 'چکی' کو کہتے ہیں

اپنا گھر

آئینہ خانۂ تصور میں
ایک اِک نقش اُبھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

وہ مرے گھر میں میرا پہلا قدم
وہ یکایک شکستِ دل کا سماں
جیسے یک لخت اک دھماکے سے
ریزہ ریزہ سا ہو گیا ہو جہاں
بام و دیوار و در کی خاموشی
ایک معلوم خوف سے لرزاں
کونے کونے سے کوئی شکلِ مہیب
آنکھیں پھاڑے مری طرف نگراں
ذرے ذرے سے جھانکتی ہوئی موت
اپنے تازہ شکار پر خنداں

چند سکّے تھما کے ہاتھوں میں
داؤ غربت پہ چل چکی تھی بھوک
جھونک کر مجھ کو جنگ کے منہ میں
سارے گھر کو نگل چکی تھی بھوک

ایک میری بہن ہی باقی تھی
اپنے سینے سے اپنی لاش لگائے
میری بچّی کے دودھ کی خاطر
اپنی تقدیس کی دکان سجائے
اپنے احساس کے سنپولوں کو
میری آمد کی آس سے بہلائے
اپنی غیرت کے ہر تقاضے کو
اپنے سینے کی قبر میں دفنائے
ایک ناکردہ جرم کا حاصل
اک گنہ کا عظیم بار اُٹھائے

میرے آتے ہی جانے کس لمحے
وہ بھی مجھ سے بچھڑ گئی چپ چاپ
جیب میں روپے کھنکتے رہے
میری دنیا اجڑ گئی چپ چاپ

میری آنکھیں تو خشک تھیں لیکن
تہہ نہ پاتے تھے کھولتے جذبات
تھرتھراتے ہوئے لبوں کا سکوت
چیخ کر کہہ رہا تھا دل کی بات
کون یزداں ہے اہرمن اوصاف
کس نے دی زندگی کو یہ سوغات
کیسی دنیا ہے آدمی کو قبول
جس میں انساں ہیں بدتر از حشرات
ہے یہ کیسا نظامِ زیست کہ جو
چوس لیتا ہے آپ خونِ حیات

جی میں آتا تھا ۔۔۔ توڑ کر ہر بند
ایک اک قید سے نکل جاؤں
ایک شمشیرِ آبدار کی طرح
ہر خدا، ناخدا پہ چل جاؤں

حاصلِ غم

آئینہ خانۂ تصور میں
ایک اِک نقش اُبھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

روز و شب کا وہ کاروانِ خموش
اپنے سینے کی آگ میں سوزاں
زیرِ مژگاں دہکتے انگارے
روح، ایک ایک رگ میں شعلہ فشاں
دل میں یادوں کے ٹوٹتے ہوئے خار
ضبط ۔۔۔ بے اختیار نعرہ زناں
اشک ۔۔۔ خاموش آتشِ سیال
فکر، فردا و دوش میں پیچاں
دور و نزدیک اجاڑ تنہائی
دوش پر بے بسی کا بارِ گراں

سوچتا تھا کہ میری غربت نے
اپنا سب کچھ لٹا کے کیا پایا
ایک خوش حال زندگی کے لیے
جنگ کے کام آ کے کیا پایا

یہ مرا گاؤں ۔۔۔ میری خلدِ زمیں
قبر کی طرح چپ، اداس اداس
زندگی جیسے عرصۂ سکرات
کوئی آہنگ دور دور نہ پاس
کوچے کوچے میں وحشتیں رقصاں
ذرے ذرے پہ ثبت، خوف و ہراس
دل کو چپ چاپ کھائے جاتا ہے
دم بہ دم قربِ مرگ کا احساس
عمر کے ہر گزرتے لمحے پر
ٹوٹتی جا رہی ہے ایک اک آس

سوچتا تھا ۔ یہ سوچ سے حاصل
میرا کعبہ تھا، میری ہی چھاؤں
کس سے پوچھوں کہ کیوں تباہ ہوا
جنگ سے دور رہ کے یہ گاؤں

سارے بنگال کی زمیں تھی آج
موت اور زندگی کی بازی گاہ
ایک میرا ہی گھر نہ تھا برباد
سارا بنگال ہو چکا تھا تباہ
ہر تقدس کی کوکھ تھی ناپاک
ہر تعلق کا اندروں تھا سیاہ
مائیں، بیٹوں کے پہلوؤں میں دفن
بہنیں تھیں بھائیوں کی عشرت گاہ
پارہ پارہ تھا شیشۂ تہذیب
گودیوں میں ہمک رہے تھے گناہ

اسی قبروں کی زندہ بستی میں
دفن تھی میری کائنات تمام
اسی جنت کے نرم شعلوں میں
زندگی جل رہی تھی صبح و شام

دوسری زندگی

آئینہ خانۂ تصور میں
ایک اِک نقش اُبھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

وہ پسینے میں غرق شام و سحر
زندہ رہنے کے جرم کی پاداش
ہر نفس اک کراہ در آغوش
ہر قدم وقف جستجوئے معاش
روح میں تشنہ حسرتوں کی تڑپ
دل میں خارِ شکستگی کی خراش
کل تلک تھی جو زندگی کی روش
آج بھی کچھ وہی تھی اس کی تراش
کل بھی تھا روح پر یہ تن بھاری
آج بھی روح پر گراں تھی یہ لاش

سوچتا تھا کہ اس تباہی سے
جنگ بازوں کو کیا ملا آخر
کوئی محمود تو رہا محمود
ہم ایازوں کو کیا ملا آخر

زندگی کے ہر ایک گوشے میں
ایک اک چیز کاروباری تھی
کھیت کے کھیت تھے گھروں میں دفن
اور بھوکی خدائی ساری تھی
ہر تجوری میں قبر کی مانند
موت کی جوئے فیض جاری تھی
دیر تا کعبہ کوئی دوکاں ہو
ہر طرف زر کی شہریاری تھی
جنگ تو ختم ہو چکی تھی مگر
جنگ ایک ایک گھر میں جاری تھی

تنگ آ کر نہ جانے کتنی بار
دل نے سانسوں کا ساتھ چھوڑ دیا
لیکن اکثر مرے عزائم کو
ایک بچّی نے ہنس کے توڑ دیا

میرا سب کچھ تو لٹ چکا تھا مگر
زندگی دے گئی تھی اک سوغات
ایک ذرہ کہ جس کے گردو پیش
گھومتے رہتے تھے مرے دن رات
سخت سے سخت ہو گئے آلام
تنگ سے تنگ تر رہے اوقات
ہر کٹھن راہ سے گزرتے رہے
میری واماندہ عمر کے لمحات
ایک کچی کلی سے ملتا رہا
اک خزاں دیدہ گلستاں کو ثبات

کیسے کیسے نہ خوں کے طوفاں میں
زندگی ڈوب کر ابھر آئی
ایک بچی کے واسطے یہ لاش
ہر کڑے دور سے گزر آئی

دوسری مسرت

آئینہ خانۂ تصور میں
ایک اِک نقش اُبھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

پھر وہی سانولی سلونی شام
وہی آباد شامِ تنہائی
وہی اک پرسکون ساعتِ غم
حاصلِ عمرِ ناشکیبائی
اک طرب زار، کرب آلودہ
اک الم کیش، بزم آرائی
ایک ویرانی، جس کے سامنے ہیچ
سیکڑوں جنتوں کی رعنائی
خوابِ حسنِ حیات کی تعبیر
اِک نئے دور کی پذیرائی

کتنے برسوں کے بعد آج آخر
وہی ساعت پلٹ کے آئی ہے
ایک واماندۂ سفر کے لیے
ایک منزل کا خواب لائی ہے

میری بیٹی بنی ہے دلہن آج
یہ خوشی بھی عجیب ہوتی ہے
گل کھلاتی ہوئی ہر اک ساعت
دل میں اِک خار سا چبھوتی ہے
کانپ جاتا ہوں جب کوئی عورت
سوئی میں کوئی گل پروتی ہے
رشک جنت ہوا ہے گھر لیکن
زندگی منہ چھپا کے روتی ہے
مجھ کو شہنائیوں میں بھی محسوس
اک صدائے بِگل سی ہوتی ہے

آج پھر کچھ خدائے دولتِ ارض
نقشِ ہستی مٹائے جاتے ہیں
نت نئے کوریا --- نئے بنگال
سولیوں پہ چڑھائے جاتے ہیں

جنگ نے کتنے کھلتے غنچوں کو
پھول بننے سے پہلے توڑ دیا
کتنی راتوں کی مانگ سنولا دی
کتنی صبحوں کا خوں نچوڑ دیا
کتنے کڑیل جوان جسموں کو
سوکھی شاخوں کی طرح توڑ دیا
صبحِ فردا کے کتنے خوابوں کو
ظلمتوں میں بھٹکتا چھوڑ دیا
ارتقاء کے لپکتے قدموں کا
رخ کسی اور سمت موڑ دیا

کوئی سوچے، عروسِ فطرت کیوں
شام سے تا بہ صبح روتی ہے
ایک سورج کی موت میں مضمر
کتنی کرنوں کی موت ہوتی ہے

بدلتے زاویئے

(ایک تمثیلی غنائیہ)

(غیر مطبوعہ)

آواز کورَس گیت

پرانا آدمی

نیا آدمی

(ایسی موسیقی جس سے وقت کے گزرنے کا احساس ہو)

آواز:

زندگی۔۔۔ایک سفر
وقت۔۔۔اِک راہگزر
آدمی۔۔۔بت کدۂ دہر کا رنگیں پیکر
اپنے آزر کا تراشا ہوا اک نقش۔۔۔مگر
خودنگر۔۔۔خودشکن وخودگر
جس کی تقدیر سفر اور سفر

(ساز چھڑ جاتے ہیں، مختلف آوازوں میں ایک نغمہ ابھرآتا ہے)

کورَس

جہانِ کُن کے راز داں ہیں کون۔۔۔ہم
قدم قدم پہ کامراں ہیں کون۔۔۔ہم
نقیبِ زندگی ہیں ہم
رفیقِ روشنی ہیں ہم

حریفِ تیرگی ہیں ہم
نوید صبح کی ہیں ہم
نئے جہاں کے پاسباں ہیں کون ۔۔۔ہم
قدم قدم پہ کامراں ہیں کون۔۔۔ ہم
جہانِ کُن کے راز داں ہیں کون۔۔۔ہم
(نغمے کی آوازیں پس منظر میں چلی جاتی ہیں)

آواز:

اور یہ پابندِ سفر
غمِ ہستی کا شکار
اپنے اطراف سے محوِ پیکار
منزلِ زیست کی جانب نگراں
افتاں خیزاں
آفرینش سے بہ ایں عزمِ جواں
وقت کی راہگزر پر ہے رواں
(نغمے کی آوازیں دوبارہ ابھر آتی ہیں)

کورَس

جہانِ کن کے راز داں ہیں کون ۔۔۔ہم
قدم قدم پہ کامراں ہیں کون ۔۔۔ ہم
یہ مہر و ماہ و کہکشاں
ہماری گردِ کارواں
ہمارا پرچمِ بلند
زمیں سے تا بہ آسماں
چہار سمت حکمراں ہیں کون۔۔۔ ہم
قدم قدم پہ کامراں ہیں کون ۔۔۔ہم
جہانِ کن کے راز داں ہیں کون۔۔۔ہم
(نغمے کی آوازیں آہستہ آہستہ ڈوب جاتی ہیں اور کسی ایک ساز پر ایسا تاثر ابھرتا آتا ہے جس سے تھکن اور مایوسی کا احساس ہو)

آواز:

رہ نوردی میں مگر پاؤں بھی تھک جاتے ہیں
راستے گردِ سرِ رہ سے بھی ڈھک جاتے ہیں
تیرہ و تار فضا ہو تو کبھی دل کا تیقن بھی کھٹک جاتا ہے
راہ پر چلتا مسافر بھی کبھی راہ بھٹک جاتا ہے

(غمگیں سروں میں ایک گیت شروع ہوتا ہے)

گیت

دنیا سے کیا پریت۔۔۔دوانے
دنیا سے کیا پریت
ہنسنا بھی ہے موت یہاں پر، پوچھ کلی کے من سے
اُجیارے کی چاہ میں شمعیں جل جاتی ہیں تن سے
جھوٹے پریت کے سب افسانے
جھوٹے پریم کے گیت
دنیا سے کیا پریت۔۔۔دِوانے
دنیا سے کیا پریت

چاند اور سورج ساتھی ہو کر ساتھ نہیں ہیں دونوں
ایک ہی دیس کے باسی ہو کر ساتھ نہیں ہیں دونوں
اپنے بھی ہیں یاں بیگانے
کوئی نہیں ہے میت
دنیا سے کیا پریت۔۔۔دِوانے
دنیا سے کیا پریت

(گیت کی آواز آہستہ آہستہ ڈوب جاتی ہے اور سازوں پر مدہم سروں میں دھیرے دھیرے ایسا تاثر ابھرتا ہے جس میں امید کا احساس نمایاں ہو)

آواز:

ایسے عالم میں کسی شمع کی مانوس جھلک
کسی بجلی کی چمک
دل میں جاگ اٹھتی ہے اک عزم کی مشعل لے کر
اور مسافر بہ صد آلامِ سفر
باندھ کر جسم پہ احرامِ دگر
وقت کی راہ پہ چل پڑتا ہے
زیست کی سمت نکل پڑتا ہے

(یکا یک سازوں کا امید افزا تاثر کورَس کی آوازوں میں بدل جاتا ہے)

کورَس

دو چار قدم بس اور کہ ساتھی منزل دور نہیں
دو چار قدم
یہ راہ گزارِ ہستی ہے، پُر خار سہی
ہم راہ نوردوں کے حق میں تلوار سہی
اس راہ کے ہر ہر گام پہ سو آزار سہی

لہراؤعلم
دوچارقدم
دوچارقدم بس اور کہ ساتھی منزل دور نہیں
دوچارقدم

چلنا ہے مقدر ہم سب کا، ہاں چلتے رہو
جلنے میں ہے جیون جوت نہاں بس جلتے رہو
سورج کی طرح ہر روز ابھرتے ڈھلتے رہو
سب ہو کے بہم
دوچارقدم
دوچارقدم بس اور کہ ساتھی منزل دور نہیں
دوچارقدم

(کورس کی آوازیں پس منظر میں چلی جاتی ہیں اور سازوں پر ایک اضطراری کیفیت جاری رہتی ہے)

پرانا آدمی:

کیسی آوازیں مرے کانوں سے ٹکراتی ہیں
کیسا نغمہ یہ فضاؤں میں ابھر آیا ہے

یک بہ یک توڑ دیا کس نے خموشی کا طلسم
کون غم خانۂ تاریک میں در آیا ہے
دل کی دھڑکن ہے کہ ہر لمحہ ہوئی جاتی ہے تیز
کوئی افسوں ہے کہ رگ رگ میں اتر آیا ہے
اک جہنم سا دہک اٹھا ہے سینے میں کہیں
سیلِ آتش ہے کہ دل تا بہ جگر آیا ہے
خوں میں حل ہو گئے بجلی کے شرارے جیسے
دوڑتے جاتے ہیں طوفان کے دھارے جیسے

(سازوں کی اضطراری کیفیت ختم ہو جاتی ہے اور کچھ لمحوں کے لیے سناٹا چھا جاتا ہے)

پرانا آدمی:

کچھ نہیں ، وہم ، فقط وہم کی شوریدہ سری
غالبًا خوابِ پریشاں تھا کوئی۔۔۔ ٹوٹ گیا
ذہن میں شعلہ بکف تھا کوئی آوارہ خیال
جس کے ہاتھوں سے سرِ دامنِ دل چھوٹ گیا
دل کی بستی پہ کسی درد نے شب خوں مارا
اور شاید وہی بیدرد اُسے لوٹ گیا

کتنی ویران فضا ہے، کوئی نزدیک نہ دور
ایک گھمبیر اندھیرے میں ہے دنیا محصور

(جماہی لیتا ہے)

خیر۔۔یوں بھی کبھی ہوتا ہے۔۔خیالو۔آؤ
نیند کی گود میں سر رکھ کے ذرا سو جاؤ

(سازوں کی خواب گوں کیفیت یکا یک رجزیہ کورس میں بدل جاتی ہے)

کورس

بیدار رہو
اے دنیا کے رکھوالو
ہشیار رہو

تاروں کے اشارے کہتے ہیں
بجلی کے شرارے کہتے ہیں
ساحل کی موجیں چیختی ہیں
طوفان کے دھارے کہتے ہیں
آنکھوں میں جنھوں نے شب کاٹی
وہ چاند ستارے کہتے ہیں

صدیوں سے ہیں جو دل مہر بہ لب
وہ ظلم کے مارے کہتے ہیں

بیدار رہو
اے دنیا کے رکھوالو
ہشیار رہو

اس دنیا کے معمار ہو تم
ہستی کے علم بردار ہو تم
تخریب پرستوں کے حق میں
اک سونتی ہوئی تلوار ہو تم
باطل کے مقابل جو گونجے
سچائی کی وہ للکار ہو تم
ہیں کوہ بھی جن کے آگے نگوں
وہ سر بہ فلک دیوار ہو تم

بیدار رہو
اے دنیا کے رکھوالو
ہشیار رہو
(کورس کی آواز پس منظر میں چلی جاتی ہے)

پرانا آدمی: (جھلاہٹ کے لہجے میں)

پھر وہی شور، وہی نالۂ شب جاگ اٹھا
پھر اُسی نغمۂ جاں سوز کے شعلے لپکے
پھر وہی آگ بھڑک اٹھی جو شب بھر بھڑکی
ایک لمحہ بھی تو بیتا نہ تھا پلکیں جھپکے
(قدموں کی آواز)

نیا آدمی: (مسکراتے ہوئے)

تم کو ان گیتوں پہ شعلوں کا گماں ہوتا ہے
تم کو یہ نغمۂ بے باک بہت کھلتا ہے
یہ ہے اس دور کا وہ زخمِ جگر سوز کہ جو
سینۂ وقت میں مدت سے یونہی پلتا ہے
آج وہ زخمِ جگر پھوٹ بہا ہے اے دوست
اک شرر، شعلۂ جوّالہ ہوا ہے اے دوست

یہی شعلہ ہے چراغِ تہہ دامانِ حیات
اسی شعلے سے منور ہیں تمہارے دن رات

پرانا آدمی: (نظر انداز کرتے ہوئے) ہونہہ

وقت تو ایک بگولا ہے کہ اُڑتا ہی چلا جاتا ہے
زندگانی میں کوئی لمحۂ شاداب نہیں
روح حیران ہے، آنکھوں کے جزیرے ویراں
دل کے صحرا میں کہیں چشمۂ مہتاب نہیں
دور تک ایک سلگتا ہوا سناٹا ہے
کٹ گئی شب مگر آنکھوں میں کوئی خواب نہیں
اور اب صبح بھی آئی ہے تو کیا آئی ہے
ساغرِ گل میں بھی شبنم کی مئے ناب نہیں
ایسے عالم میں بھلا کوئی جیئے تو کیسے
جان کر جرعۂ زہراب پیے تو کیسے

نیا آدمی: (سمجھاتے ہوئے)

زندگی جرعۂ زہراب نہیں جانِ عزیز
بات کچھ اور ہے جس کی نہیں تم کو تمیز
سالہا سال سے انسان ہے جس غم کا اسیر

اس کو انساں ہی نے پالا ہے بنام تقدیر
آدمی جس بتِ سفاک کا ہے سجدہ گزار
اس کا خالق بھی ہے انساں ہی کا ذہنِ بیدار
خیر وشر۔۔۔خاک کے پیکر کی ہیں اقدارِ نہاں
اہرمن بھی ہے وہی اور وہی ہے یزداں
یہ دوئی۔۔۔ایک اکائی کی ہیں تصویر کے رخ
کہیں تخریب کے رخ ہیں کہیں تعمیر کے رخ
آدمی ہی نے سدا اپنے لیے دام بُنے
اس چمن زار سے کچھ پھول تو کچھ خار چنے
خار و گل ایک ہی موسم کی ہے سوغات مگر
ان کو بانٹا گیا دنیا میں بہ عنوانِ دگر
یہی اک راز ہے جو پردۂ افلاک میں ہے
جس کی پُرکاریِ فن، فطرتِ چالاک میں ہے
یہ صدی کھول رہی ہے اُنہیں اسرار کا بھید
دستِ اوہام کے ڈھالے ہوئے افکار کا بھید
جب بھی اس جال سے انسان نکل جائے گا
اپنی دنیا کا یہ ماحول بدل جائے گا

پرانا آدمی: (بات کاٹتے ہوئے)

محض دھوکہ ہے، یہ دنیا نہیں بدلے گی کبھی
اس شبِ تار کی قسمت میں کوئی صبح نہیں
صبح آئے بھی تو ہو گی وہ کسی شب کا فریب
گردشِ وقت سے بھی زیست بدلتی ہے کہیں
مجھ کو معلوم ہے، دنیا کی حقیقت کیا ہے
محض اعجازِ نظر ہے یہ مہ و مہر و زمیں
ہم سب آئینہ در آئینہ ہیں اک عکسِ خیال
زندگی اس کے سوا کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں

نیا آدمی:

کتنے ناداں ہو، مگر جو ہے، وہ ہے توائے دوست
'ہے' کو ہم کیسے 'نہیں' کہہ کے گزر سکتے ہیں
عکس و آئینہ کے جس ربط کا حاصل ہے حیات
اس تعلق کو 'زمیں' کہہ کے گزر سکتے ہیں

جس عقیدے سے عبارت رہا انساں کا وجود
اس عقیدے کا جگر چاک بھی کرنا ہو گا

آ گہی نے جو چراغاں سا کئے رکھا ہے
اس سے ’امکان‘ کا ادراک بھی کرنا ہو گا

وہی امکان جو ہر عہد کے باطن کا ہے عکس
غیر ممکن میں ہمیشہ سے جو ممکن کا ہے عکس
اسی ممکن سے عبارت ہے سفر کی تاریخ
فکر، احساس، خبر اور نظر کی تاریخ
اسی تاریخ میں پوشیدہ ہے انساں کا خمیر
صرف انسان سے ہے ارض و سما کی توقیر
یہ زمیں روزِ ازل کیا تھی بجز تودۂ خاک
کس نے اس خاک کے تودے کی جگائی تقدیر
ذرۂ خاک میں انساں نے کی وسعت کی تلاش
ورنہ آفاق تھے خود اپنی نگاہوں میں حقیر
یہ مہ و مہر، یہ افلاک، یہ دنیا وہ جہاں
ان کے اسرار کی دریافت ہے کس کی تسخیر
کس کے افکار و عمل کی ہے یہ دنیا غماز
کس کے خوابوں سے ہوئی دونوں جہاں کی تعمیر

لوحِ محفوظ سے کاغذ کے اِن اوراق تلک
ذہن سے تا بہ قلم کس کا ہے نقشِ تحریر
کس نے خاموش تصاویر کو حرکت بخشی
گُنگ ہونٹوں کو دیا کس نے یہ اِذنِ تقریر
کس نے رفتار کو یہ برق روی سکھلائی
کس کے زیرِ کفِ پا، وقت ہوا ہے زنجیر
آج کتنے ہی تصور ہیں حقیقت بہ کنار
آج کتنے ہی تخیل ہیں یقیں کی تصویر
کتنے اوہام کا مامن تھا جہانِ گزراں
کتنے افسوں کے حصاروں میں تھا ہر عہد اسیر
کس نے پتھر سے تراشا ہے وہ آئینۂ فکر
جس میں ہر خواب نے دیکھی ہے خود اپنی تعبیر
کائنات ایک پراسرار حقیقت ہے ضرور
اس پراسرار حقیقت کا ہے انساں ہی سفیر
تم بھی انسان ہو، دیکھو کہ یہ دنیا کیا ہے
زندگی کیا ہے، خدائی کا تماشا کیا ہے
(نیا آدمی، پرانے آدمی کو کائنات کی سیر کراتا ہے۔صوتی اثرات سے یہ مناظر نمایاں

ہوں اور انہیں کے امتزاج سے آرکسٹرا ہم آہنگ ہو کر یہ نغمہ چھیڑ دے جو مختلف اکاروں سے مزین ہو)

نغمہ

ہر ایک ذرہ اپنی حد میں ایک کائنات ہے
زمیں سے تا بہ آسماں حیات ہی حیات ہے
گلوں میں گلستاں نہاں
زمیں میں آسماں نہاں
جہاں میں دو جہاں نہاں
فنا میں بھی حیات ہے، ثبات ہی ثبات ہے
ہر ایک ذرہ اپنی حد میں ایک کائنات ہے
یہ صبح اور شام کیا
خرام اور قیام کیا
یہ فکر گام گام کیا
یہ وسعتیں یہ فاصلے، بس اک قدم کی بات ہے
ہر ایک ذرہ اپنی حد میں ایک کائنات ہے
چراغِ زندگی ہیں ہم
ایاغِ سرخوشی ہیں ہم

سراغِ روشنی ہیں ہم
ہمارے دم قدم سے اس جہان کو ثبات ہے
ہر ایک ذرہ اپنی حد میں ایک کائنات ہے
چلو بہ عزمِ مستقل
قدم قدم ہو متصل
کہ مہر و ماہ ہوں خجل
چلو کہ اپنے زیرِ پا، تمام شش جہات ہے
ہر ایک ذرہ اپنی حد میں ایک کائنات ہے

(نغمہ اپنی اکاروں کے ساتھ پس منظر میں چلا جاتا ہے اور سازوں پر ایک فکر انگیز غنائی تاثر نمایاں ہونے لگتا ہے جس کے سُر ابتدائی کورس سے ہم آہنگ ہوتے ہیں)

پرانا آدمی:

آدمی اتنا ہمہ گیر ہے! معلوم نہ تھا
اپنے ہی خواب کی تعبیر ہے! معلوم نہ تھا
اور مری فکر کے بے جان ہیولوں میں فقط
میرا خاکہ، میری تصویر ہے! معلوم نہ تھا
میں جسے نقطۂ موہوم سمجھ بیٹھا تھا
وہ مرا نقطۂ تعمیر ہے! معلوم نہ تھا

میری پیشانی پہ لکھا ہے جو اک حرفِ غلط
خود مرے ہاتھ کی تحریر ہے! معلوم نہ تھا
اپنی دانست میں جس دام سے آزاد تھا میں
وہی اس پاؤں کی زنجیر ہے! معلوم نہ تھا
میری نظروں سے نہاں تھی جو حقیقت اب تک
اُس حقیقت کی یہ تنویر ہے! معلوم نہ تھا
موت بھی زیست کا اک روپ ہے! یہ نکتۂ راز
ذہنِ فطرت ہی کی تدبیر ہے! معلوم نہ تھا
میرے ہر ایک عمل، ردِ عمل میں پنہاں
میرے ادراک کی تطہیر ہے! معلوم نہ تھا
دستِ فطرت میں مری ذات کھلونا ہی سہی
میرے بس میں مری تقدیر ہے! معلوم نہ تھا
زندگی مجھ کو بھی آواز دے ۔۔۔ میں آتا ہوں
مجھ کو بھی اذنِ تگ و تاز دے ۔۔۔ میں آتا ہوں

(ابتدائی کورس ابھر آتا ہے)

کورس

جہانِ کن کے راز داں ہیں کون ۔۔۔ ہم

قدم قدم پہ کامراں ہیں کون ۔۔۔ ہم
نقیبِ زندگی ہیں ہم
رفیقِ روشنی ہیں ہم
حریفِ تیرگی ہیں ہم
نوید صبح کی ہیں ہم
نئے جہاں کے پاسباں ہیں کون ۔۔۔ ہم
قدم قدم پہ کامراں ہیں کون ۔۔۔ ہم
جہانِ کن کے راز داں ہیں کون ۔۔۔ ہم

(پس منظر میں کورس کا آرکسٹرا بجتا رہتا ہے)

آواز:

زندگی ۔۔۔ ایک سفر
وقت ۔۔۔ اک راہگزر
آدمی ۔۔۔ بت کدۂ دہر کا رنگیں پیکر
اپنے آزر کا تراشا ہوا اِک نقش ۔۔۔ مگر
خودنگر ۔۔۔ خودشکن و خودگر
جس کی تقدیر سفر اور سفر

(کورس کی آواز ابھر کر کچھ لمحے نمایاں رہتی ہے پھر دھیرے دھیرے دور ہو جاتی ہے گویا سفر جاری ہے)

شکست کی آواز

(’یک کرداری‘ منظوم تمثیل)

(مطبوعہ ’فنون‘ لاہور ۔ ۱۹۶۵ء)

پروفیسر

آواز

اور

کچھ صوتی اثرات

(مختلف لوگوں کی آوازیں۔ طنزیہ فقرے اور قہقہے جو پروفیسر کے ذہنی انتشار کی علامت ہیں، آخر پروفیسر چیخ پڑتا ہے)

پروفیسر: چپ رہو۔۔۔
جاؤ، مجھے اور پریشاں نہ کرو
اپنے الفاظ کو میرے لیے ارزاں نہ کرو
میں اسی غم کا سزاوار تھا
جو کچھ بھی ہوا۔۔۔ ٹھیک ہوا
میں پشیمان ہوں، نادم ہوں
مجھے اور پشیماں نہ کرو

(آوازیں آہستہ آہستہ ابھر کر پس منظر میں چلی جاتی ہیں، پروفیسر زور سے دروازہ بند کر دیتا ہے گویا اس نے اپنے ذہن کا دنیا کی طرف کھلنے والا دروازہ بند کر دیا ہو۔ کچھ لمحے مکمل خاموشی)

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دنیا کیا ہے
آگہی بھی ہے بری چیز تو اچھا کیا ہے

(گہری سانس لیتا ہے۔ قدرے توقف کے بعد اونچی آواز میں)

اے خدا، اے مرے معبود
کوئی راہِ فراغ
جس قدر سوچتا جاتا ہوں
الجھتا ہے دماغ
بجھتا جاتا ہے ہر اک منزلِ عرفاں کا چراغ

(ادھر ادھر دیکھتے ہوئے)

دور تک قبر کے مانند۔۔۔ اندھیرا ہے محیط
دفن ہو جائے نہ اس میں مرے افکار کی دنیائے بسیط

(زیرِ لب)

میں نے چاہا تھا۔۔۔
مرے دل میں تھے کیا کیا ارماں
کیسے کیسے نہ خیالات کا محور تھا دماغ
کتنے سورج تھے مرے ذہن کے نادیدہ افق پر تاباں
کتنے مہتاب فروزاں تھے مری روح کی پہنائی میں
کتنے انجم کی ضیا تھی مری تنہائی میں
کتنی شمعیں تھیں فروزاں۔۔۔
کہ مرے کلبۂ ویراں میں چراغاں کا گماں ہوتا تھا

(اپنے آپ سے)

میں نے دیکھا تھا کہ یہ دہر ہے اک شیش محل
اور اس شیش محل میں ہے ہر اک شے بیکل
آدمی اپنے ہی پرتو سے ہراساں ہے یہاں
زندگی آپ بنی جاتی ہے، اپنا مقتل
میں نے سوچا تھا کہ اس وہم کا افسوں ٹوٹے
دستِ اوہام سے ایقان کا دامن چھوٹے
افقِ ذہن سے ابھرے کوئی صبحِ ادراک
اور اس صبح سے اک نور کا چشمہ پھوٹے
میں نے چاہا تھا کہ اس نور سے دنیا کے اندھیروں کا مداوا کر دوں
وسعتِ دہر میں پھیلا کے اجالا ہر سمت
لمحے لمحے کو حریفِ دمِ عیسیٰ کر دوں
لیکن اس چاہ کا، اس فکر و عمل کا انجام؟

(یکا یک ایک زہریلا قہقہہ گونج اٹھتا ہے)

آواز: آج معلوم ہوا اپنی حقیقت کیا ہے؟
دل کے بازار میں اک ذہن کی قیمت کیا ہے؟

پروفیسر: (چونک کر)

کون ہو تم؟

آواز: مجھے تم بھول گئے شاید
میں وہی کشتۂ افکارِ گراں مایہ ہوں

(غور سے دیکھتے ہوئے)

پروفیسر: میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے تم کو شاید

آواز: میں اسی پیکرِ ادراک کا ہمسایہ ہوں

(زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ)

ہم ہیں وہ دوست کہ ہر بُعد کے باوصف ہمیں
ایک ہی نام سے دنیا نے پکارا برسوں
ہم ہیں وہ ثابت و سیار، خلاؤں میں جنہیں
وقت کی گردشِ پیہم نے سہارا برسوں
ہم ہیں اِک شاخ کے دو پھول، وہ گلہائے دو رنگ
اپنے ہی ذوقِ تماشہ نے نکھارا ہے جنہیں
ہم ہیں اک بحر کی موجیں وہ سبک رو موجیں
عیشِ ساحل نے تلاطم پہ ابھارا ہے جنہیں

پروفیسر: (الجھ کر)
میں نہیں سمجھا کہ تم کون ہو؟

کیا کہتے ہو؟

آواز: تم تو اپنے ہی خیالوں میں نہاں رہتے ہو
اک نظر مجھ کو ذرا غور سے دیکھو تو سہی
کیا میں آئینہ تمہارا نہیں؟
(مانتے ہوئے)

پروفیسر: ہاں۔۔۔ہو تو سہی

آواز: میں وہی ہوں، جسے تم مار چکے ہو اے دوست
آج یہ بازی بھی تم ہار چکے ہو اے دوست

پروفیسر: (حیرت سے)
کیا کہے جاتے ہو

آواز: جی۔۔۔میں ہوں وہی خانہ خراب
مُشتِ خوں جان کے

پروفیسر: (پہچان کر)
تم۔۔۔تم ہو!

آواز: جناب
میں تمہارا دلِ مرحوم ہوں
اور زندہ ہوں

آج تک زیست سے محروم ہوں
اور زندہ ہوں
(تصور کرتے ہوئے)
میری آنکھوں میں ابھی تک ہے وہ دنیا بے خواب
جس کے آفاق پہ ابھرا نہیں کوئی مہتاب
میرے ہونٹوں پہ تڑپتی ہے ابھی تک وہی پیاس
جس کو ساغر کی کھنک تک کبھی آئی نہیں راس
میری رگ رگ میں وہی خون ہے اب تک رقصاں
جس کے ہر قطرے میں دوزخ کی تپش ہے پنہاں

پروفیسر: (حیرت سے)
تم ابھی زندہ ہو؟

آواز: جی۔۔۔اور اُسی طرح جواں
میری دنیا میں نہیں کوئی غمِ عمرِ رواں
مجھ میں آباد ہے اب تک وہ جہانِ بے نام
جس کا ہر ذرہ ہے خود اپنی جگہ حسنِ تمام
جس کا ہر رنگ اچھوتا ہے، دھنک کے مانند
جس کا ہر روپ انوکھا ہے، فلک کے مانند

جس کی خوشبو نہیں منت کشِ دامانِ صبا
جس کے پھولوں نے اٹھایا نہیں احسانِ صبا
جس میں تم نے بھی گزارے ہیں مہ و سال کئی
جس میں روشن ہیں ابھی تک وہ خدوخال کئی
جن کی ہم دونوں نے اِک عمر پرستش کی ہے
جن کو اپنانے کی ہم دونوں نے خواہش کی ہے

پروفیسر: میں نے؟
آواز: ہاں تم نے
پروفیسر: مجھے یاد نہیں
آواز: یاد کرو
وہ حسیں ماہ جبیں
پروفیسر: ماہ جبیں
آواز: یاد کرو

وہ ۔۔۔ جسے تم نے تصور میں بسا رکھا تھا
خواب کی طرح نگاہوں میں چھپا رکھا تھا
غنچۂ دل میں تھی سوئی ہوئی خوشبو کی طرح
دشتِ تخیّل میں جولاں، رَمِ آہو کی طرح

جب بھی وہ سامنے آتی تو نظر جھک جاتی
موجِ انفاس بھی چلتے ہوئے رک رک جاتی
پَرتَوِ حسن سے ہر سمت اُجالا ہوتا
کاش اُس لمحہ کوئی دیکھنے والا ہوتا

(پروفیسر کو کھویا ہوا پا کر)

یاد ہے تم کو وہ اک دُھند میں کھوئی ہوئی رات
وہی گہوارۂ مہتاب میں سوئی ہوئی رات
جاگتی آنکھوں سے ہم دیکھ رہے تھے اک خواب
ذہن اور دل پہ تھا چھایا ہوا کیفِ مئے ناب
صحنِ گل میں تھی وہ شہزادیِ نکہت رقصاں
لمسِ آہنگ سے تارِ رگِ جاں تھے لرزاں
نم فضاؤں میں سلگتے ہوئے جذبات کی تان
نغمگی کے پسِ پردہ وہ دِلوں کے پیمان

پروفیسر: (اضطراب کے عالم میں)
میرا ماضی نہ مجھے یاد دلاؤ ۔۔۔ جاؤ
یہ بجھی آگ خدارا نہ جلاؤ ۔۔۔ جاؤ
آواز: یہ بجھی آگ ہے۔۔۔ خوب!

آگ بجھی بھی ہے کہیں؟
آگ بجھ جائے تو زندہ بھی رہے گی یہ زمیں؟
یہ مہ و مہر ہیں کیا چیز اگر آگ نہیں
زندگی کے ہر اک ایوان میں پوشیدہ ہے آگ
زندگی کے ہر اک امکان میں پوشیدہ ہے آگ

پروفیسر: وہ خطائے دلِ ناداں تھی۔۔۔گناہِ معصوم

آواز: (بات کاٹتے ہوئے)
شکر ہے، تم نے کہا تو اسے معصوم گنہہ
میرا ہر ایک عمل
کوئی نہ مانے لیکن
پاک و معصوم ہوا کرتا ہے
کاش تم نے مجھے سمجھا ہوتا

پروفیسر: (چڑ کر) میں تمھیں خوب سمجھتا ہوں
تم انسان کا وہ روپ ہو جو قیدِ تعین میں نہیں آ سکتا
جو خط و خال کا پابند نہیں
آج اِس روپ میں عریاں ہو
تو کل روپ نیا دھار کے آجاؤ گے

آواز: (زور کا قہقہہ لگاتا ہے)
کتنے نادان ہو تم
وقت نے کچھ نہ سکھایا تم کو
میں تو سمجھا تھا کہ یہ منزلِ عمرِ گزراں
تھک کے بیٹھے ہو جہاں
کر چکی ہوگی ہر اک رازِ نہاں، تم پہ عیاں
آج معلوم ہوا
زیست بیکار سفر ہے۔۔۔جس میں
کوئی منزل ہے نہ منزل کا نشاں
(ٹھنڈی سانس لے کر)
کاش تم میری رفاقت میں بھی کچھ عمر بسر کر لیتے
میرے ہمراہ بھی دو گام سفر کر لیتے

پروفیسر: (اسی لہجے میں) وہ حسیں لمحۂ رفتہ
جو تمھاری ہی رفاقت میں ملا تھا مجھ کو
جو مری عمر کی پیشانی پہ اک داغ سیہ بن کے دمکتا ہے ابھی

آواز: داغِ سیہ!
تم اُسے داغِ سیہ کہتے ہو

وہ حسیں لمحہ جو چھو کر بھی نہ گزرا تم کو
وہ جو آیا تھا کسی سایۂ ابرِ گزراں کے مانند
وہ جو اِک خواب کے مانند نگاہوں میں رہا۔۔۔کھو بھی گیا
وہ جسے ایک نظر تم نہ کبھی دیکھ سکے
جس کو پانے کی تمنا بھی کی۔۔۔اور پا نہ سکے
تم اُسے داغِ سیہ کہتے ہو؟
اپنی ناکامی کا کیا خوب مداوا ہے

پروفیسر: (بات کاٹتے ہوئے)
غلط
میرے کردار کی توہین ہے یہ
وہ میری راہ میں آیا تھا تمہاری شہ پر
تم نے چاہا تھا کہ میں اُس کی خنک چھاؤں میں
اس کے آغوش میں چپ چاپ پگھل کر رہ جاؤں
اور کچھ دن غمِ دوراں سے کنارا کر لوں

آواز: (لہجہ بدل کر)
اور تم نے غمِ دوراں سے کنارا بھی کیا

پروفیسر: صرف تمہاری خاطر

آواز: خیر۔۔۔یوں ہی سہی
میں تم سے جدا بھی تو نہیں
میں تو نزدیکِ رگِ جاں ہوں
لہو بن کے رواں ہوں تم میں
تم ہو 'میں'۔۔۔
اور مری ذات سے منسوب ہو تم
ہم ازل سے ہیں بہم
ظاہر و باطن کی طرح
کاش ان ظاہر و باطن میں کوئی خطِ تفاوت ہی نہ کھینچا جاتا
کوئی دیوار نہ حائل ہوتی

پروفیسر: (اُسی لہجے میں)
میں نے بالقصد یہ دیوار اٹھائی ہے
کہ تم حد سے تجاوز نہ کرو
تم ہو جس رہ پہ رواں، وہ مری منزل ہی نہیں
تم میں اور مجھ میں بڑا فرق ہے
تم شب ہو میں دن
تم اندھیروں میں اجالوں کے تمنائی ہو

ایسے موہوم اجالوں کے جنہیں رات جنم دیتی ہے

آواز: (کھوئے ہوئے انداز میں)

رات ۔۔۔خاموش ۔۔۔حسیں

کیف و مسرت کی امیں

ایک دلہن کی طرح حجلۂ زرپوش میں بیٹھی

کسی آہٹ کا بڑے پیار سے رستہ تکتی

جیسے اب کوئی قریب آئے گا

اور آہستہ سے گھونگھٹ کو اُلٹ کر۔۔۔اس کو

زندگانی کے حسیں راز بتا جائے گا

پروفیسر: تم خدا جانے کہاں جا پہنچے

میرے نزدیک یہ سب خواب کی باتیں ہیں کہ جو

خود فریبی کے سوا کچھ بھی نہیں

تم جسے حسن سمجھتے ہو، وہ اندازِ نظر ہے اپنا

تم جسے عشق سمجھتے ہو، وہ ہے حسن ہوس

محض تسکیں کا بہانہ ہے

حقیقت میں فسانہ ہے تمہارا ہر خواب

میرے دن رات کا محور ہے ہمیشہ سے کتاب

کہیں خورشید بھی کرتا ہے طوافِ مہتاب؟

آواز: دل کی دنیا نہیں پابندِ نظامِ شمسی

لیکن اس بات کو تم کیا سمجھو

تم نے دل کو کبھی سمجھا ہی نہیں

حسن کو آنکھ سے دیکھا ہی نہیں

آنکھ تو صرف بصارت سے عبارت ہے تمہارے نزدیک

اور جس آنکھ کو ہے حسن کا نظارہ نصیب

اس کو تم بند کیے بیٹھے ہو

تم کو معلوم نہیں لمسِ نظر کی لذت

تم نے پائی ہی نہیں سوزشِ غم کی راحت

تم تو بس ذہن کے آوارہ بگولوں کے تعاقب میں بھٹکتے رہے

کیا جانیے کس دشتِ فراموشی میں

پروفیسر: میں نے جس دشتِ تفکر کی سیاحت کی ہے

تم کبھی اُس کا تصور بھی نہیں کر سکتے

میں نے ہر ذرے کے سینے میں اتارا خود کو

اور دل بن کے دھڑکتا رہا

خوں بن کے ہر اک رگ کی مسافت طے کی

میں نے ہر موجِ ہوا کے ہمراہ
وسعتِ ارض کے چکر کاٹے
میں ہواؤں سے خلاؤں میں اُڑا
اور مہر و مہ و انجم کے پراسرار فسانوں کو
حقیقت سے ہم آہنگ کیا
میں نے معلوم کیا
وقت، خدا، زیست، یہ دنیا، وہ جہاں

آواز: (ہنستے ہوئے)
اور جب آنکھ کھلی
حدِ نظر تک تھا دھواں
ایک تم اور یہ تنہائی۔۔۔ یہ تاریک مکاں
(زور کا قہقہہ لگاتا ہے)

پروفیسر: (غصے میں)
اوہ۔۔۔ تم۔۔۔ چپ رہو، خاموش

آواز: (سمجھاتے ہوئے)
بگڑنے کی ضرورت کیا ہے؟
میں تو سمجھا تھا کہ تم خواب سناتے ہو

ہر اک خواب کی تعبیر غلط ہوتی ہے
اس لیے میں نے یہ تعبیر بتائی تم کو

پروفیسر: تم مری بات پہ ہنستے ہو
مرے غم کا اُڑاتے ہو مذاق

آواز: (زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ)
آج تم کتنے حسین لگتے ہو
برہمی بھی ہے عجب شئے
یہ غضب ناک نگاہوں کے لپکتے شعلے
شکن آلود جبیں پر یہ پسینہ۔۔۔ جیسے
خشک پتوں پہ دمکتے ہوئے شبنم کے گہر
یہ لرزتے ہوئے ہونٹوں کا تشنج
بخدا!
آئینہ دیکھو تو اپنے پہ فدا ہو جاؤ

پروفیسر: (جھلا کر)
تم نہیں مانو گے، تم یوں نہیں مانو گے

آواز: نہیں۔۔۔ مان گیا ہوں تم کو
آج پہچان گیا ہوں تم کو

واقعی تم کو رہِ راست پہ لانا ہے محال
تم ہو اب عمر کی اُس منزل میں
جس جگہ کوئی کسی کو نہیں سمجھا سکتا
تم کہو تو میں چلا جاؤں
اُتر جاؤں پھر اُس قبر کی ویرانی میں
جس میں اک میں ہی نہیں
سینکڑوں تشنہ تمناؤں کی زندہ لاشیں
اپنی تقدیر کو روتی ہیں
نہ جیتی ہیں نہ مر سکتی ہیں
سالہا سال سے اِک مرگِ مسلسل میں گرفتار ہیں
شاید یہی برزخ ہے ہماری دنیا۔۔۔

پروفیسر: (حقیقت کو سمجھتے ہوئے)
ٹھہرو۔۔۔اک بات سنو
تم نہیں جانتے۔۔۔میں، آج ہوں کس غم کا شکار

آواز: مجھ کو معلوم ہے

پروفیسر: پھر بھی تمہیں احساس نہیں
ایسے عالم میں یہ طعنے۔۔۔یہ کچو کے

آواز: میں نے۔۔۔
خیر جانے دو

پروفیسر: نہیں۔۔۔اِس کا سبب بتلاؤ
تم تو احساس کی شدت کی علامت ہو
تمہیں
میرا مطلب ہے کہ تم
اتنے ظالم تو نہیں ہو سکتے

آواز: میں تو خود ظلم کا مارا ہوں
ستم جھیلے ہیں کیا کیا میں نے
جب تلک تم میں، تمہارے رگ و پے میں تھی حرارت
تم نے
مجھ پر ہر جبر کیا
جب بھی میں نے کوئی خواہش کی
کوئی بات بھی کہنا چاہی
میرے ہونٹوں پہ وہیں مہر، خموشی کی لگا دی تم نے
مجھ میں جاگا کوئی ارماں
کوئی نازک سی تمنا کبھی بیدار ہوئی

تم نے محسوس کیا، جیسے وہ ناگن ہے کوئی
تم نہ ماروگے تو ڈس لے گی تمہیں
کیسے کیسے نہ ستم تم نے کیے
کیسے کیسے نہ ستم میں نے سہے
میں کوئی ظلم کسی پر کبھی کر سکتا ہوں؟
میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ مجھے مار کے تم
وہی پتھر ہوا ابھی۔۔۔

پروفیسر: (بات کاٹتے ہوئے)
پھر وہی بات۔۔۔ تمہیں چین نہیں آئے گا

آواز: چین کس طرح سے آ سکتا ہے
میرے سینے میں دہکتا ہے جو دوزخ
جب تک
اس کا ہر شعلہ کوئی برگِ گلِ تر نہ بنے
میری آنکھوں میں ہیں آباد جو خوابوں کے خرابے
جب تک
اُن کی ویران فضاؤں کا دھواں
کوئی خوشبو نہ بنے

اُن کے آفاق پر اُڑتی ہوئی گرد
چادرِ نور نہ بن جائے
مجھے کیسے سکوں آئے گا

پروفیسر: (سوچتے ہوئے کہتا ہے)
اور شاید یہ مرے بس میں نہیں

آواز: (پورے یقین کے ساتھ)
بس میں سب کچھ ہے تمہارے
مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو
مجھ کو معلوم ہے۔۔۔ تم نے کیا کیا
خود فریبی کے حسیں جال بچھا رکھے ہیں

پروفیسر: خود فریبی کے حسیں جال۔۔۔!
یہ کیا کہتے ہو؟

آواز: ہاں۔۔۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ اپنے اطراف
اپنے ہاتھوں سے کوئی دامِ حسیں بُنتا ہے
اور پھر عمر تمام
ایک بے نام تگ و دو میں لگا رہتا ہے
خود اُلجھتا ہے، سلجھتا ہے

سلجھتا ہے، اُلجھتا ہے
اسی کوششِ بیکار میں دن رات بسر کرتا ہے

پروفیسر: ٹھیک کہتے ہو۔۔۔مگر
وہ حسیں دام ضروری نہیں یکساں ہو
کوئی گیسوئے پُرخم کے حسیں دام میں ہوتا ہے اسیر
اور کوئی دامِ خیالات میں
یہ اپنے مزاج، اپنی نظر
اور اجازت ہو تو اک بات کہوں
(ذرا ٹھہر کر)
یہ ہیں سب ظرف کی باتیں
لیکن

آواز: یہ بھی ہے ایک حقیقت کہ ہر اک ظرف کی حد ہوتی ہے
حد سے باہر وہی دنیا ہے، وہی تم، وہی میں
لاکھ ہم حد میں سمٹ آنے کی کوشش کرلیں
زندگی بھر کسی زنداں میں نہیں رہ سکتے
زندگی رنگ ہے، خوشبو ہے، کوئی نور کا دھارا ہے جسے
قید کرنا ہے محال

اس کو گر قیدِ تعین میں بھی لایا جائے
تو کسی وقت بھی وہ حد سے گزر سکتا ہے
ذات کے محبسِ تاریک سے ہو کر آزاد
وسعتِ قلب دو عالم میں بکھر سکتا ہے

پروفیسر: میرا مطلب بھی یہی تھا۔۔۔لیکن

آواز: یہی 'لیکن' تو ہے وہ لفظ جو ہر گام پہ دیوار بنا دیتا ہے
کتنی دیواریں اسی طرح نہ کھینچی تم نے
اپنی کھینچی ہوئی دیواروں میں بیٹھے ہو کسی سایۂ مجبور کے مانند
نہ جانے کب سے؟
تم فقط ذات کے زنداں ہی میں محبوس نہیں
بلکہ اس ذات کے اطراف بھی زنداں ہیں
ہزاروں زنداں
جن سے تم کو کبھی چھٹکارا نہیں مل سکتا

پروفیسر: تم خدا جانے کہے جاتے ہو کیا کچھ۔۔۔آخر
صاف الفاظ میں کہتے نہیں کیوں؟
صاف کہو

آواز: میری ہر بات بہت صاف ہے

تم خود نہ سمجھنا چاہو

تو الگ بات ہے

پروفیسر: میں کچھ بھی نہ سمجھا کہ یہ دیواروں کا مطلب کیا ہے

میرے اطراف تو اب کوئی بھی دیوار نہیں

(یکا یک ایک نوجوان جوڑے کی ہنسی اور قہقہے سنائی دیتے ہیں۔ جیسے وہ باہر سے گھر میں آئے ہوں۔ پروفیسر کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھ کر)

آواز: تم پریشان سے کیوں ہو گئے۔۔۔ کیا بات ہے؟

یہ ہنستے ہوئے لوگ برے لگتے ہیں؟

پروفیسر: تم نہیں جانتے

آواز: (بات کاٹتے ہوئے)

میں دونوں کو پہچانتا ہوں

دونوں شاگرد اِسی 'پیکرِ ادراک' کے ہیں

ایک اُن میں وہی لڑکی ہے جسے تم نے بڑے چاؤ سے

بیٹی کی طرح پالا ہے

اُس کے ساتھ اُس کا کوئی 'دوست' بھی ہے

پروفیسر: (ترش لہجے میں)

تم کو معلوم ہے یہ دونوں۔۔۔؟

آواز: محبت میں گرفتار ہیں۔۔۔ میں جانتا ہوں

پروفیسر: تم نہیں جانتے۔۔۔ یہ حد سے بڑھے جاتے ہیں

(قہقہوں کی آوازیں بدستور جاری ہیں)

آواز: یعنی اُس قید سے آزادی کے طالب ہیں جسے

تم نے اِن دونوں پہ عائد کی ہے

پروفیسر: یہ کوئی قید نہیں

وہ تو آزاد ہیں اور قید ہوا چاہتے ہیں

آواز: (بات کاٹتے ہوئے)

بس یہی فرق ہے ہم دونوں میں

تم جسے قید سمجھتے ہو وہ آزادی ہے میرے نزدیک

پروفیسر: ہاں اگر یہ نہ سمجھتے تو کسی ذات کو محبس

کسی قانون کو دیوار نہ کہتے تم بھی

خیر، میں تو اِسی دیوار، اِسی محبس کا ہوں پابند۔۔۔ مجھے

ایسی آزادی کی خواہش نہیں جس پر کوئی تحدید نہ ہو

میں سمجھتا ہوں کہ آزادی ہے پابندئ جذبات کا نام

کوئی قانون ضروری ہے جو دیوار کے مانند کھنچا ہو اطراف

اور ہم حد سے نہ بڑھنے پائیں

آواز: دل کی دنیا نہیں پابندِ رسوم و آئین
لاکھ دیواریں اٹھاؤ۔۔۔لیکن
دل وہ وحشی ہے جو ہر لمحہ نئے دشت و بیاباں مانگے
پروفیسر: زندگی دشت و بیاباں کی تمنائی نہیں
اب وہ شہروں میں سمٹ آئی ہے
شہر کے تنگ حصاروں میں جو وسعت ہے
جو پھیلاؤ ہے وہ دشت و بیاباں میں کہاں۔۔۔
خیر اس بحث سے حاصل کیا ہے
تم نے سمجھی ہے مری بات نہ سمجھو گے کبھی
میں اس آزادہ روی کا کبھی قائل تھا نہ قائل ہوں گا
میں ابھی دونوں کو سمجھاتا ہوں
آواز: تم نے پہلے بھی تو سمجھائی ہے یہ بات انہیں
کب وہ خاطر میں تمہیں لائے
کوئی حکم بھی مانا اب تک؟
اپنے الفاظ کو ضائع نہ کرو
چپ رہو
دیکھتے جاؤ کہ تم۔۔۔عرصہ گہہِ زیست میں اب ایک تماشائی ہو

اور کچھ بھی نہیں
پروفیسر: تم تو بہکاتے ہو مجھ کو
یہ غلط بات ہے
میں صرف تماشائی نہیں رہ سکتا
میں نے اُس لڑکی کو پالا
اُسے تعلیم دلائی ہے کہ وہ
آواز: زندگی بھر تمہیں اپنا سمجھے
عمر بھر صرف تمہارے ہی اشارے پہ چلے
پروفیسر: وہ ابھی اتنی سمجھدار نہیں ہے
آواز: تو سمجھدار بھی ہو جائے گی
اور پھر اتنی بھی نادان نہیں ہے کہ بھلے اور برے میں
کوئی تمیز نہیں کر سکتی
یہ بھی ممکن ہے کہ تم جس کو برا کہتے ہو
وہی اچھا ہو۔۔۔بہت خوب ہو اس کے نزدیک
(لڑکی کی گنگناہٹ سنائی دیتی ہے)
پروفیسر: اس کی آواز سنی تم نے۔۔۔؟
آواز: (مسکراتے ہوئے)

بہت پیاری، سریلی سی ہے آواز
بہت خوب گلا پایا ہے
آؤ آج اس سے کوئی گیت سنیں

پروفیسر: گیت؟

آواز: ہاں گیت ۔۔۔ ذرا لطف اٹھائیں کچھ دیر
فکرواحساس کو نغموں کی سبک لے میں بہادیں ۔۔۔ آؤ
(پروفیسر کو گومگو کے عالم میں دیکھ کر)
آؤ بے کار تکلف نہ کرو

پروفیسر: (الجھن محسوس کرتے ہوئے)
کیسی باتیں کیے جاتے ہو ۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ تم
تم کو معلوم ہے وہ ۔۔۔ وہ مری بیٹی کے برابر ہے

آواز: تو ہو
تم نے جس جذبۂ بے نام کی تسکین کی خاطر، اس کو
اپنی شاگرد بنایا، اسے یہ نام دیا۔ گھر میں رکھا
اور دن رات اسے اپنے قریں رکھتے ہو

پروفیسر: مجھ کو ان لفظوں سے کچھ ۔۔۔۔

آواز: (تائید کرتے ہوئے)

کوئی غلط بات نہیں
یہ بھی انسان کی فطرت ہے
یہ تنہائی، یہ ویران خموشی کب تک
کچھ تو اس غم کا مداوا ہو جائے
کوئی بے نام سی تسکین سہی
تشنگی کچھ تو مٹے
زندگی بھر کی مسافت میں ذرا دیر تو آرام ملے

پروفیسر: (بگڑ کر)
کیا کہے جاتے ہو
تم ۔۔۔
سوچ کے ہر بات کہو

آواز: سوچ سے مجھ کو تعلق کیا ہے
میں تو جذبات کی، احساس کی تصویر بناتا ہوں
مٹا دیتا ہوں
اور یہ تصویر تمہاری ہے ۔۔۔ مگر
تم نہ پہچان سکو گے اس کو
یہ ہے اس روح کی تصویر

جو اس جسم میں آویزاں ہے
یہ ضعیف اور تھکا ہارا بدن
جس کی ہر ایک شکن میں ہے جوانی کی وہ کروٹ پنہاں
جس کو آسودگیِ خواب نہیں مل پائی
وہ جو برسوں سے ہے بیدار
کسی رات کے آغوش میں سو جانے کو

پروفیسر: چپ رہو
یہ مرے کردار، مرے علم کی توہین ہے

آواز: میں خوب سمجھتا ہوں
یہ دھوکہ ہے جو تم خود کو دیے بیٹھے ہو
زعمِ آگاہی بھی ہے ایک فریب
تم ہر اک گام پہ اک دام کی الجھن میں گرفتار ہو
اور اس سے رہائی کو تم اک موت سے تعبیر کیا کرتے ہو
تم میں پوشیدہ ہے اک خوف
جو اک ناگ کے مانند ہے پھن پھیلائے
تم سمجھتے ہو کہ جیسے ہی تم اس دام سے باہر آئے
روح کا ناگ تمہیں ڈس لے گا

اور برسوں کی ریاضت
یہ خیالات کے آوارہ بگولوں کا تعاقب
یہ سفر
راہ کی اُڑتی ہوئی گرد میں کھو جائے گا
(پروفیسر کو سوچتا ہوا پا کر)
تم کو معلوم نہیں
زندگی صرف سفر ہی نہیں۔۔۔کچھ اور بھی ہے
فکر کی راہگزر ہی نہیں۔۔۔کچھ اور بھی ہے

پروفیسر: (الجھ کر)
آخر اِس درس کا مقصد کیا ہے؟

آواز: زندگانی کا حسیں روپ بھی دیکھو پل بھر
افقِ ذہن کے اُس پار۔۔۔جہاں
نیلگوں چرخ کی پہنائی میں
چاند کے پاس ستارہ ہے
جو چپکے چپکے
چاند کی نقرئی بانہوں میں سمٹ آیا ہے
کا رخِ گل کے کسی خاموش جھروکے سے کبھی جھانک کے دیکھا تم نے

کسی بہکی ہوئی خوشبو کا کوئی رقصِ لطیف
اور شبنم کے روپہلے گھنگرو
جب بج اٹھتے ہیں تو سورج کی سنہری کرنیں
کس لیے سجدے میں جھک جاتی ہیں۔۔۔کیا پاتی ہیں؟
صبح دم موجِ صبا کرتی ہے کس کے لب و عارض کا طواف؟
اُس کی اٹھلاتی ہوئی چال میں کیوں ہوتی ہے دل خیز ترنگ؟
کس کی آنکھوں کا نشہ
کس کے بدن کی خوشبو
کس کی زلفوں کی مہک
اس کے دامن میں چھپی ہوتی ہے
اک ذرا سوچو کہ فطرت کا تقاضا کیا ہے
عشق کیا چیز ہے اور حسن کا منشا کیا ہے

پروفیسر: لیکن اس تذکرۂ حسن سے اب کیا حاصل
آواز: موجِ طوفاں سے عبارت ہے سکونِ حاصل
پروفیسر: لیکن اب تو کوئی طوفاں نہیں مجھ میں پنہاں
آواز: سطحِ ساکن سے تموّج نظر آئے گا کہاں
مجھ کو دیکھو، اسی طوفان کی اک لہر ہوں میں

سینکڑوں تشنہ تمناؤں کا اک شہر ہوں میں
اس خرابے کی تمہیں سیر کراؤں۔۔۔آؤ
اپنے خوابوں کے کچھ اہرام دکھاؤں۔۔۔آؤ

پروفیسر: خواب تو ہوتے ہیں محرومیٔ دل کا حاصل
ان کھلونوں سے بہل سکتا ہے

آواز: (بات کاٹتے ہوئے)
مجھ سا کوئی دل
ٹھیک کہتے ہو۔۔۔مگر
میں تمہارا دلِ مرحوم نہیں ہوں اے دوست
اب بھی میں زیست سے محروم نہیں ہوں اے دوست
یہ کتابیں کہ جنہیں علم کی تُربت کہیے
یہ نوِشتے کہ جنہیں کذبِ صداقت کہیے
یہ قلم جیسے کوئی شمعِ مزارِ تازہ
(ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے)
کاش ہوتا، مرے غم کا بھی تمہیں اندازہ

پروفیسر: لیکن اب تو میں بہت دور نکل آیا ہوں
آواز: اسی دوری نے کیا ہے تمہیں منزل سے قریب

میرے ہمراہ چلو
تم تھکے ہارے ہو، بوڑھے ہو۔۔۔ یہ مانا لیکن
تم جواں بھی ہو، مری طرح تنومند۔۔۔ جواں
عمر بڑھ جائے تو بوڑھا نہیں ہوتا انساں
جب تلک تشنگیِ جذبہ و احساس ہے باقی
اے دوست
آدمی بھی ہے جواں
ضُعف، آسودگیِ حسرت و ارماں کا ہے نام
آؤ۔۔۔ آج اپنی تمناؤں کی تکمیل کریں
زندگانی کے ہر اک حکم کی تعمیل کریں
آؤ۔۔۔ اس منظرِ خاموش کا نظارہ کریں
جس کے ہر رنگ سے آوازِ جرس آتی ہے

پروفیسر: تم کہاں مجھ کو لیے جاتے ہو؟
اُس کمرے میں!
وہ سوئی ہے جس میں!

آواز: ہاں۔۔۔ آؤ

پروفیسر: میں نہیں جاؤں گا۔۔۔ ہرگز نہیں جاؤں گا

آواز: (بات کاٹتے ہوئے)
مگر اس سے تمہارا کوئی رشتہ تو نہیں
میرا مطلب ہے، کوئی خون کا رشتہ بھی نہیں
اور تم نے اسے جو 'نام' دیا ہے
وہی دھوکہ ہے جو تم خود کو دیے بیٹھے ہو

پروفیسر: نہیں یہ بات نہیں ہو سکتی
تم مجھے ایک گنہ کے لیے اُکساتے ہو

آواز: تم تو مفروضوں کی دنیا میں جیے جاتے ہو
یہ گنہ اور ثواب۔۔۔ اور یہ نیکی یہ بدی
محض مفروضے ہیں
خود ساختہ دیواریں ہیں
جن کی بنیاد میں کچھ بھی نہیں
سچائی کی اک اینٹ نہیں
یہ اصول اور ضوابط
وہ گھروندے ہیں جو تہذیب کے معماروں نے
کچی مٹی سے بنائے ہیں۔۔۔ کسی وقت بھی ڈھ سکتے ہیں

پروفیسر: ٹھیک ہے

میں۔۔۔مگر اس قسم کا اقدام نہیں کرسکتا

آواز: (لہجہ تلخ ہو جاتا ہے)
اس کا مطلب ہے کہ تم ایک نمائش کا کھلونا ہو
وہ بے جان کھلونا، جس میں
زندگی کا کوئی امکان نہیں
تم بظاہر جو نظر آتے ہو۔۔۔اِک جھوٹ
حسیں جھوٹ ہے۔۔۔اور کچھ بھی نہیں
تم وہ پتھر ہو جو انسان نہیں بن سکتا
میں سمجھتا تھا کہ تم میں اب تک
زندگانی کی حرارت ہو گی
تم مگر برف کا پیکر نکلے

پروفیسر: (مجبور ہو کر)
تم۔۔۔
سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں۔۔۔
کیسے سمجھاؤں
ذرا غور کرو
کچھ تو سوچو کہ وہ کیا سوچے گی

آواز: سوچ کا وقت نہیں
تم کو چلنا ہے
اُسی سمت جدھر میں چاہوں
میں نے ہر جبر گوارا کیا اب تک لیکن
اب میں یہ جبر، نہ برداشت کروں گا
آؤ
تم نے کل تک تو مجھے قوتِ بازو سے
ارادوں کی اٹل طاقت سے
سرکشی سے مجھے روکے رکھا
اب مگر تم میں وہ طاقت نہیں
وہ عزم وارادہ کی صلابت نہیں
تم موم کا ایک بت ہو جو اب میرے تصرف میں ہے
میرے بس میں
آؤ، اب وقت نہ برباد کرو
میرے ویرانے کو آباد کرو

پروفیسر: تم، مگر۔۔۔اتنا تو سوچو کہ میں بوڑھا ہوں
بڑھاپے کا جوانی سے علاقہ کیا ہے

مجھ میں اور اس میں سِن وسال کا ہے کتنا تفاوت ۔۔۔سوچو

آواز: یہ تفاوت ابھی مٹ جائے گا

جب بڑھاپے کو جوانی کا سہارا ہوگا

ہر بڑھاپے کو سہارے کی ضرورت ہے

سہارا کوئی بوڑھا تو نہیں دے سکتا

آؤ۔۔۔چپ چاپ چلے آؤ۔۔۔ادھر

(پروفیسر لڑکی کی خواب گاہ میں چلا جاتا ہے)

آواز: دیکھو۔۔۔یہ خواب میں کھویا ہوا حسن

سرخ ہونٹوں پہ یہ ہلکا سا تبسم۔۔۔توبہ

اور زلفوں کا یہ بکھرا ہوا انداز

یہ قامت کی درازی

یہ تراشا ہوا جسم

اور یہ ایک دریچے سے خنک چاند کی کرنوں کا نزول

جیسے اک چادرِ زرتار

فرشتوں نے اُسے عرش سے بھیجی ہے

ذرا دیکھو تو

ایسی تنہائی میں تم نے کبھی دیکھا کوئی سویا ہوا حسن

ہاں۔۔۔ذرا جرأتِ رندانہ سے لو کام

ذرا ہاتھ بڑھاؤ۔۔۔یہ لرزتے ہوئے ہاتھ

ریشمی زلفوں کو چھو کر دیکھو

آج محسوس کرو لمس کی راحت اے دوست

زندگانی ہے اسی راحتِ محسوس کا نام

(یکا یک پروفیسر پیچھے ہٹ جاتا ہے)

کیا ہوا۔۔۔ڈر گئے؟

کیا سوچ رہے ہو؟

مجھے اس طرح سے کیوں دیکھ رہے ہو؟

(پریشان ہوکر)

یہ نگاہوں میں ہیں شعلے کیسے؟

تم مجھے کھینچ کے لے جاتے ہو اس طرح کہاں؟

پروفیسر: (بھاگ کر کمرے میں آتے ہوئے)

مجھ کو بہکائے لیے جاتا تھا

مجھ کو سمجھا تھا کہ بوڑھا ہوں میں، کمزور ہوں میں

تیری طاقت سے میں دب جاؤں گا

تو نے آخر مجھے سمجھا کیا ہے

(میز کی دراز سے پستول نکالتا ہے)

میں تجھے آج فنا کردوں گا

آج میں تجھ کو فنا کردوں گا

(یکا یک پستول کی آواز فضا میں گونج جاتی ہے اور ساتھ ہی پروفیسر کی دلدوز چیخ سنائی دیتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں دروازہ پیٹنے اور پھر ٹوٹنے کی آوازیں اور انہی میں لوگوں کا شور۔۔۔

’پروفیسر نے خودکشی کر لی‘

’پروفیسر نے خودکشی کر لی‘

اسی شور میں ایک نسوانی چیخ بلند ہوتی ہے۔۔۔اور پھر مسلسل رونے اور چیخنے کی آوازیں دیر تک جاری رہتی ہیں)

☆☆☆

ہارون کی آواز

نظمیں، غزلیں

اور

ایک طویل نظم

گنبد کی طرح دوش پہ رکھے ہوئے ہیں سر
جسموں کے مقبروں میں دریچے نہ جالیاں
(حمایت علی شاعر)

یاسر عرفات کے نام

مری زمیں ہے مری ماں ، میں ابن مریم ہوں
تمہارا خوں سے ہے رشتہ تو میرا دودھ سے ہے

ترتیب

o واحد متکلم ۔۔۔ جمع متکلم — حمایت علی شاعر — ۵۳۵

وہ — ۵۴۴
محاسبہ — ۵۴۶
بدن پہ پیرہنِ خاک کے سوا کیا ہے — ۵۵۰
ازل سے ایک عذابِ قبول درد میں ہوں — ۵۵۲
جو آگ نہ تھی ازل کے بس میں — ۵۵۳
کب تک رہوں میں خوف زدہ اپنے آپ سے — ۵۵۴
تناسخ — ۵۵۵
پابہ گِل — ۵۵۷
گوسالہ — ۵۵۹
یدِ بیضاء — ۵۶۰
احتجاج — ۵۶۲
اس شہرِ خفتگاں میں کوئی تو اذان دے — ۵۶۳
نسبتِ خاک — ۵۶۵
پتھر میں ہیں ڈھلے ہوئے شبنم سرشت لوگ — ۵۶۷
جو کچھ بھی گزرنا ہے، مرے دل پہ گزر جائے — ۵۶۸
حیراں نہ ہو یہ زہر ہے اپنی ہی کشت کا — ۵۷۰
بے زمین نسل کا نوحہ — ۵۷۱

مریم سے ایک سوال — ۵۷۳
پرانے سلسلے نئے رابطے — ۵۷۵
موئین جوڈرو میں دوسرا آدمی — ۵۷۸
ہارون کی آواز — ۵۸۰
ہر پل گزشتنی ہے تو پھر کیوں ملال ہو — ۵۸۲
یوسفِ ثانی — ۵۸۴
کاش! — ۵۸۵
خوش ہو رہے ہیں لوگ رقیبوں کے بخت پر — ۵۸۶
وہ ستارہ کہ جو دیکھو تو شبِ آثار بھی ہے — ۵۸۸
چپ کا لمحہ — ۵۹۰
صحافت — ۵۹۱
آنکھ کی قسمت ہے اب بہتا سمندر دیکھنا — ۵۹۲
تیسری ہجرت — ۵۹۴
جوشِ نمو میں سر جو اٹھاتی ہیں ڈالیاں — ۵۹۵
غمِ مشترک — ۵۹۷
انقلاب — ۶۰۰
ہر لفظ سے معانی تہہ دار کھینچنا — ۶۰۱
اِک سنگدل کا پھر ہے مقدر بنا ہوا — ۶۰۲
اب کیا فلک کی بات کریں ہم زمین پر — ۶۰۴
شاید بنا رکھی ہے ہماری ہواؤں پر — ۶۰۵
خدا تو ایک ہے لیکن خدا کے گھر ہیں بہت — ۶۰۷
اک جبر وقت ہے کہ سہے جا رہے ہیں ہم — ۶۰۹
رُباعی — ۶۱۰
دن ہی رہا نہ دن کی کوئی بات رہ گئی — ۶۱۱

اب کیا غزل میں بات کریں اس کے جور کی ۶۱۲

تعمیر کے ہیں خواب مگر سطحِ آب پر ۶۱۳

چراغ بجھ گیا ۶۱۴

بازیافت ۶۱۶

حریفِ وصال ۶۱۹

یہ آرزو ہے کہ جب بھی گلے لگاؤں اُسے ۶۲۲

چاند نے آج جب اِک نام لیا آخرِ شب ۶۲۳

تخاطب ہے تجھ سے، خیال اور کا ہے ۶۲۴

ہو چکی اب شاعری لفظوں کا دفتر باندھ لو ۶۲۶

حرف حرف روشنی (ایک طویل نظم) ۶۲۷

واحد متکلم ۔۔۔ جمع متکلم

(دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم)

تلمود سے منسوب ایک حکایت ہے کہ

بچپن میں حضرت موسیٰ نے فرعون کے تاج کو ٹھوکر ماردی تھی

ستارہ شناسوں نے اُسے بدشگونی قرار دیا اور بچے کی معصومیت مشکوک قرار پائی

امتحان لیا گیا

ایک تشت میں یاقوت کے ٹکڑے رکھے گئے اور دوسرے میں انگارے، بچے نے انگارہ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا

فرعون تو مطمئن ہو گیا مگر یہ آگ بچے کی پہچان بن گئی

یدِ بیضا اور زبان کی لکنت اسی آگ کی امانتیں ہیں

حقیقت کا یہ افسانوی پس منظر درست ہو یا نہ ہو مگر یہ سچ ہے کہ حضرت موسیٰ کی زبان رواں نہ تھی۔ بائبل سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے اور قرآن حکیم سے بھی۔

’اے خدا، میں فصیح نہیں ہوں، نہ پہلے ہی تھا اور نہ جب سے تو نے اپنے بندے سے کلام کیا، بلکہ رک رک کر بولتا ہوں اور میری زبان کند ہے‘

(خروج ۴/۱۰)

’اے پروردگار، میرا سینہ کھول دے اور میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ سلجھا دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں‘

قرآن حکیم سے اس دعا کا بھی سراغ ملتا ہے جو انہوں نے اپنے بھائی ہارون کے لیے مانگی تھی

'میرا بھائی ہارون، مجھ سے زیادہ زبان آور ہے، اس کو میرے ساتھ (نبی بنا کر۔ الشعراء) مددگار کی حیثیت سے بھیج' (القصص)

اور اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول بھی کر لی۔

'میں نے تجھے فرعون کیلئے گویا خدا ٹھہرایا اور تیرا بھائی ہارون تیرا پیغمبر ہوگا' (خروج)

'ہم تیرے بھائی کے ذریعے تیرا ہاتھ مضبوط کریں گے' (القصص)

ان الہامی حوالوں کی روشنی میں اگر ہارون کو 'اظہار' کی علامت قرار دیا جائے تو شاعری، جزویست از پیغمبری کے مصداق ٹھہرتی ہے اور میرا یہ مصرعہ ؎

ہارون کی زبان بھی لوحِ کلیم ہے

اپنے وسیع تر معنی آپ متعین کر لیتا ہے۔

مولانا گرامی نے علامہ اقبالؔ کے لیے فرمایا تھا

پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

یقیناً شاعر پیغمبر نہیں ہوتا۔ حضرت موسیٰ 'کلیم اللہ' تھے اور شاعر 'تلمیذ الرحمٰن' شاید اسی اعزاز کے سبب یہ دنیا شاعر کا بھی امتحان لیتی ہے۔ اس کے سامنے بھی دو تشت رکھے جاتے ہیں اور ایک زندہ ضمیر شاعر، دولت کو ٹھکرا کر انگاروں کو اپنے سینے سے لگا لیتا ہے۔

اپنا تعارف کراتے ہوئے میرؔ نے کہا تھا ؎

میں کون ہوں اے ہم نفساں، سوختہ جاں ہوں
اِک آگ ہے سینے میں، جو میں شعلہ فشاں ہوں

یہ آگ نہ صرف شاعر کے تخلیقی جوہر کی امین ہوتی ہے بلکہ ان محرکات کا بھی سراغ دیتی ہے جو ہمیشہ اسے اظہار کی حسرت میں مضطرب رکھتے ہیں۔ غالبؔ کے الفاظ میں

آتش کدہ ہے سینہ مرا، رازِ نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

اور جب اظہار کے لیے اقبالؔ ایسا صاحبِ شعور نصیب ہوتا ہے تو وہ شاعر کا منصب بھی متعین کر دیتا ہے ؎

مِری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

محرمِ راز ہونا ہی شعور کی دلیل ہے اور شعور۔ زندگی کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھنے کا نام ہے علامہ اقبال نے اسی شعور کی روشنی میں زندگی کی بنیادی حقیقت کا انکشاف کیا تھا ؎

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی، اُسی کا مشتاق ہے زمانہ

لیکن شاعر صرف قریب تر کا مشتاق نہیں ہوتا۔ وہ اس نامعلوم کو بھی امکانات کے حدود میں دیکھتا ہے۔ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے ؎

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا، مرے آئینۂ ادراک میں ہے
(اقبالؔ)

اور جب معلوم و نامعلوم کی سرحدیں مل جائیں تو عہدِ عتیق کو عہدِ حاضر سے اور موجود کو لاموجود سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کے درمیان اقدار کا ایک معنوی رشتہ برقرار رہتا ہے جو عہد بہ عہد، عمل اور ردِ عمل کے مختلف مراحل سے گزرتا ہوا نئے امکانات کی صورت متعین کرتا ہے۔ مثال کے طور پر:

حضرت یوسفؑ کے زمانے میں، حضرت یعقوبؑ کی اُمت نے قحط سالی کے سبب ارضِ کنعان سے ہجرت کر کے مصر میں بود و باش اختیار کر لی تھی لیکن دریائے نیل کے زرخیز کناروں پر

صدیوں آباد رہنے کے باوجود وہ بے زمینی کے احساس میں مبتلا رہی۔ اِس کا سبب جہاں نسلی اور تہذیبی فرق تھا وہیں معاشرے کی وہ مخصوص درجہ بندی، معاشی حق تلفی اور سیاسی ناانصافی بھی تھی جن کے باعث رفتہ رفتہ عبرانیوں کو قبطیوں کا غلام بن جانا پڑا اور بالآخر اس کا انجام پوری قوم کی مراجعت پر منتج ہوا۔ ظاہر ہے کہ فرعون کی مطلق العنان حکومت میں مظلوم طبقے کے حقوق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا لیکن یہ صدی جسے جمہوری حقوق کی صدی کہا جاتا ہے، اس جبر سے آزاد ہے۔ اس لیے ضروری نہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرانے لگے۔

جہاں تک تہذیبی آواگون سے گزر کر ایک نیا تشخص پانے کا مسئلہ ہے وہ قانونِ فطرت کا پابند ہے اور اِس میں صدیاں صرف ہوجاتی ہیں لیکن جہاں تک مظلوم طبقات کی حق طلبی کا مسئلہ ہے فلسطین سے لے کر لاطینی امریکہ تک، ہر ملک میں ایک جدوجہد جاری ہے۔

میری شاعری میں عہدِ پارینہ کی مخصوص حکایات اور اُن کے مختلف کردار جو اپنی پرچھائیاں تلاش کرتے نظر آتے ہیں ماضی وحال کے اِسی جدلیاتی ربط کے آئینہ دار ہیں۔ میں اس آئینے میں اُن حکایات کا نیا روپ اور اُن کرداروں کے نئے چہرے دیکھتا ہوں اور اس آگ کی روشنی میں جو میرے تخلیقی جوہر کی امین ہے، اپنے عہد کے ان پس پردہ محرکات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں جن کے سبب تاریخ کبھی اپنے آپ کو دہراتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور کبھی آگے بڑھتی ہوئی اور کبھی اس عالم میں جیسے اپنی جگہ ٹھہر کر رہ گئی ہو ؎

افسانہ یاد آگیا اصحاب کہف کا
تاریخ لکھنے بیٹھا تھا میں اپنے دور کی

اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا عہد کسی طلسم کا اسیر ہے اور ایک عالم خود فراموشی ہے کہ ہم سب پر طاری ہے ؎

اعجاز دیدنی ہے طلسم سراب کا
دریا رکا ہوا ہے، بہے جا رہے ہیں ہم

اور میرے ذہن میں مختلف سوالات جاگ اٹھتے ہیں۔ میں کبھی نسل پرستی کے خلاف حضرت عیسیٰ کے اجتہاد کو استعارے کے طور پر اپنا کر حضرت مریمؑ سے سوال کرتا ہوں ؎

مریم، کہو کہ جائے یہ لختِ جگر کہاں
اللہ کی زمین پہ ہے اِس کا گھر کہاں

اور کبھی عالمی انسانی برادری کے خوبصورت تصور میں برادرانِ یوسف کا کردار دیکھ چیخ پڑتا ہوں:

میں چاہِ کنعاں میں زخم خوردہ پڑا ہوا ہوں
زمیں میں زندہ گڑا ہوا ہوں
کوئی مجھے اس برادرانہ فریب کی قبر سے نکالے
مجھے خریدے کہ بیچ ڈالے

پھر مجھے انجیل کی ایک حکایت یوں تسلی دینے لگتی ہے ؎

حیراں نہ ہو، یہ زہر ہے اپنی ہی کشت کا
اک رشتہ سانپ سے بھی ہے باغِ بہشت کا

اور میں سوچنے لگتا ہوں

سانپ تو شیطان کا بہروپ تھا جس کے سبب باغِ بہشت، حضرت آدمؑ سے چھن گیا اور میرے ذہن میں وہ تمام سانپ پھنکارنے لگتے ہیں جنھوں نے انسانوں کو اپنی اپنی جنتوں سے محروم کردیا اور میں ایک اندرونی کرب سے بے تاب ہوکر پھر چیخ پڑتا ہوں ؎

جب سانپ ہی ڈسوانے کی عادت ہے تو یارو
جو زہر زباں پر ہے وہ دل میں بھی اتر جائے

لیکن پھر وہ انجام بھی نظر میں گھوم جاتا ہے جو ہر بے زمین قوم کا مقدر ہے ؎

دشتِ غربت میں ہوں آوارہ مثالِ گردباد
کوئی منزل ہے، نہ کوئی نقشِ پا رکھتا ہوں میں

زندگی کے یہ تمام مسائل جوان اشعار میں بکھرے ہوئے ہیں، میرے عہد کی منتشر حقیقتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن میں ایک مشترک صداقت پوشیدہ ہے اور میرے اندر چھپی ہوئی آگ اس صداقت کے اظہار کے لیے مضطرب رہتی ہے۔ کبھی شعلہ جوالا کی صورت تو کبھی راکھ کے اندر دہکتی ہوئی، کبھی چراغ کی لو کے مانند تو کبھی میرا بائی کے اس دوہے کی مثال:

لکڑی جل کوئلہ بھئی، کوئلہ جل بھئی آک
میں پاپن ایسی جلی، کوئلہ بھئی نہ راکھ

میرے پہلے مجموعۂ کلام کا نام تھا ’آگ میں پھول‘ (مطبوعہ ۱۹۵۶ء) اور اس میں ایک طویل افسانوی نظم تھی ’شعلۂ بے دود‘ (یہ نظم اب ’تشنگی کا سفر‘ میں ہے) یہ نظم میں نے ۱۹۵۶ء میں کہی تھی۔ اس دور میں میرے اندر جو آگ بھڑک رہی تھی اس کی تپش ہی کچھ اور تھی۔

آگ لاشوں کے قلب کی دھڑکن
آگ پیہم سکوت کا طوفاں
آگ محرومیوں کی تشنہ لبی
آگ غربت کا آخری ارماں

اور یہ آگ کر گئی روشن
مجھ پہ تاریخ کے مقدس راز
ہر گناہِ عظیم کے پیچھے
کس خدا کا ہے دست کار دراز

۱۹۶۲ء میں ایک طویل تمثیلی نظم ’شکست کی آواز‘ میں یہ آگ ایک کردار کی معرفت مجھے اپنی حقیقت کا سراغ دیتی ہے۔ (تشنگی کا سفر)

یہ بجھی آگ ہے؟ خوب آگ بجھی بھی ہے کہیں
آگ بجھ جائے تو زندہ بھی رہے گی یہ زمیں
یہ مہ و مہر ہیں کیا چیز اگر آگ نہیں
زندگی کے ہر اک ایوان میں پوشیدہ ہے آگ
زندگی کے ہر اک امکان میں پوشیدہ ہے آگ

پھر ۱۹۷۲ء میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یہ آگ میری روح کا عذاب بن گئی۔

میرے سینے کے دہکتے ہوئے انگارے کو
اب تو جس طرح بھی ممکن ہو، بجھا دے کوئی

اور ۱۹۸۲ء میں جب ہر گفتنی ناگفتنی ہو کر رہ گئی تو مجھے اپنی ذات میں ایک ’اجتماعی نزاع‘ کی کیفیت محسوس ہونے لگی۔

بدن پہ پیرہنِ خاک کے سوا کیا ہے
مرے الاؤ میں اب راکھ کے سوا کیا ہے

تیس برس کے اِس سفر میں آگ کی حدت کا جو گراف بنتا ہے وہ میری تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔ اس المیے کا پس منظر اس عظیم المیے سے مختلف نہیں جو حضرت موسیٰ کی امت کا مقدر بن گیا تھا، فرعون کے تاج کو ٹھوکر مارنے اور انگارہ منہ میں رکھ لینے کے باوجود ان کی قوم سامری کے سحر کا شکار ہوگئی اور ’گوسالہ‘ کی پرستش کرنے لگی۔

’گوسالہ‘ زر پرستی کا جو استعارہ ہے

صدیاں گزر گئیں حتیٰ کہ بنی اسرائیل پر ایک نیا صحیفہ بھی اتار دیا گیا مگر یہ المیہ تاریخ پر

محیط رہا اور آج بھی استہزائیہ لہجے میں اپنی قوم کا مرثیہ سنا رہا ہے ۔

’یہ معجزہ‘ بھی وقت کا کتنا عظیم ہے
اب ’دستِ سامری‘ میں ’عصائے کلیم‘ ہے

لیکن اِسے تاریخ کی جدلیات کہیے کہ وقت کا انتقام ۔ جس اُمت نے اپنے پیغمبر سے انحراف کیا ۔ اُسی امت کے ایک باغی مفکر کے قلم نے عصائے موسیٰ کی روایت تازہ کردی اور اُس ’گوسالہ‘ کا طلسم توڑ دیا جس نے ساری دنیا کو دولت کا پجاری بنا کر رکھ دیا تھا ۔

آں کلیم بے تجلی، آں مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب
(اقبالؔ)

قلم نے انسان کو کتاب دی اور کتاب نے حقیقت کا شعور اور آج شعورِ انسانی ایک فیصلہ کن منزل پر پہنچ چکا ہے ۔

کھینچی تھی جن کے خوف سے سدِّ سکندری
سوئے نہیں ہیں آج وہ دیوار چاٹ کے

روایت ہے کہ یاجوج ماجوج جس دن یہ دیوار چاٹ لیں گے اُس دن قیامت آجائے گی اور قیامت کا مطلب ہے ۔ روزِ حساب یعنی سزا و جزا کا دن ۔

شہنشاہیت کا دفاع کرنے والی یہ دیوار شاید اُسی قیامت کو روکنے کیلئے کھڑی کی گئی تھی سکندرِ ذوالقرنین سے لے کر اَبرہہ تک ہر استحصالی طاقت نے اپنے تحفظ کیلئے کہیں دیوار اٹھائی ہے تو کہیں گرانے کی کوشش کی ہے اور آج بھی یہی کچھ ہو رہا ہے ہر عہد ایک امتحان سے گزر رہا ہے ۔

اِک طرف اُڑتے ’ابابیل‘ اِک طرف ’اصحابِ فیل‘
اب کے اپنے کعبۂ جاں کا مقدر دیکھنا

ظاہر ہے کہ سکندر کی فوج قیامت کو روک سکتی ہے نہ ابرہہ کے ہاتھی کعبے کی دیوار گرا سکتے ہیں، یہ وقت کا فیصلہ ہے اور وقت ۔۔۔ خدا ہے:

DON'T VILIFY TIME
BECAUSE TIME IS GOD

’زمانے کو برا نہ کہو ۔۔۔ زمانہ خدا ہے‘ (حدیث نبویؐ)

اور شاعر، تلمیذ الرحمٰن ہوتا ہے، وہ جس زبان سے بولتا ہے، وہ ہارون کی زبان ہے اور جس ہاتھ سے لکھتا ہے وہ یدِ بیضا کی طرح روشن ہے ۔

مری ہتھیلی کہ جس میں روشن
وہ آگ بھی ہے، وہ نور بھی ہے
جو دستِ موسیٰ ہے، طور بھی ہے

لیکن اس روشنی میں لفظ و معنی کے قافلے کو لے کر شاعر فن کے جس پل صراط سے گزرتا ہے وہ بحرِ احمر پار کرنے کے مترادف ہے اگر اس کا قلم، عصائے کلیم کی طرح معجز نما نہ ہو تو وہ بیچ منجدھار میں ڈوب بھی سکتا ہے ۔

تاریخِ ادب میں کتنے ہی شاعر اس منجدھار کی نذر ہو گئے اور کون جانے کہ میرے نصیب میں کیا ہے ۔

حمایت علی شاعر
شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی
(۱۸/جون ۱۹۸۵ء)

وہؐ

میں جس کا مدح خواں ہوں وہ انساں بھی ہے عظیم
اور اُس کا اِس جہان پہ احساں بھی ہے عظیم

اُس نے زمیں کے ذروں کو اُڑنا سکھا دیا
ہر آسماں کو پاؤں کے نیچے --- بچھا دیا
اُسطور سے رِہا کیا، فکر و خیال کو
انساں بنا دیا ہے خدا کے جمال کو
اُس نے کہا --- کہ برتر و افضل ہے آدمی
ہر شئے ہے نا تمام --- مکمل ہے آدمی
ہر آدمی کے دل میں خدا کا وجود ہے
یہ آدمی ہے جس کے لیے ہست و بود ہے

انساں کے حق میں اُس کا یہ فرماں بھی ہے عظیم
میں جس کا مدح خواں ہوں، وہ انساں بھی ہے عظیم

وہ شہرِ علم --- لفظ و معانی کا رشتہ داں
حدِ مکاں میں دیکھ لیا جس نے لامکاں
ہر چیز کے ظہور میں ہے ماورا کا نور
جیسے پسِ شعور ہے، اِک عکسِ لاشعور
ہر ذرہ اِک حقیقتِ کُل کا ہے آئینہ
گلزار جیسے وسعتِ گُل کا ہے آئینہ
ہر موت پیش رو ہے مسلسل حیات کی
کڑیاں جُڑی ہوئی ہیں فنا و ثبات کی

اس آگہی میں، فکر کا امکاں بھی ہے عظیم
میں جس کا مدح خواں ہوں، وہ انساں بھی ہے عظیم

محاسبہ

(بحضور سرورِ کائناتؐ)

حضورؐ، آپ کی اُمت کا ایک فرد ہوں میں
مگر خود اپنی نگاہوں میں آج گرد ہوں میں
میں کس زباں سے کروں ذکر اُسوۂ حسنہ
کہ اہلِ درک و بصیرت نہ اہلِ درد ہوں میں
میں کس قلم سے لکھوں سرخیِ حکایتِ عشق
کہ رنگ دیکھ کے اپنے لہو کا، زرد ہوں میں
سمجھ سکوں گا میں کیا سرِ نکتۂ معراج
شکست خوردۂ دنیائے گرم و سرد ہوں میں
بہ زعمِ خود تو بہت منزل آشنا ہوں مگر
جو راستے ہی میں اُڑتی پھرے وہ گرد ہوں میں
عجیب ذوق سفر ہے کہ صورتِ پرکار
جو اپنے گرد ہی گھومے، وہ رہ نورد ہوں میں
دہائیوں سے نچوڑا تھا جس اکائی کو
اب اس اکائی سے آمادۂ نبرد ہوں میں

بچھا رکھی ہے جو اک دستِ مکر نے ہر سو
اُسی بساطِ سیاست پہ ایک نرد ہوں میں
میں اپنی ذات میں ہوں اپنی قوم کی تصویر
کہ بے عمل ہی نہیں جہل میں بھی فرد ہوں میں

حضورؐ آپ نے چاہا تھا کیا، ہوا کیا ہے
مگر میں سوچ رہا ہوں، مری خطا کیا ہے

فقط تلاوتِ الفاظ میرا سرمایہ
پسِ حروف ہے کیا، کب مجھے نظر آیا
کہی تھی آپؐ نے جو بات استعاروں میں
مرا شعور کب اُس کا سفیر بن پایا
نہ میں نے سوچا کہ 'شق القمر' میں رمز ہے کیا
مری گرفت میں کس طرح آفتاب آیا
سوادِ غیب سے جبریل کی صدا نے مجھے
سماعتوں کے کس ادراک پر ہے اکسایا
نہ میں نے جانا کہ اِک عکسِ لاشعور بھی ہے
جو حرف و صوت کی صورت ہے میرا ہمسایہ

میں اپنی ذات میں کس طرح ایک عاَلم ہوں
سمجھ سکی نہ کبھی میری فکر کم مایہ
نہ میرا عشق ہے میرے یقین کا حاصل
نہ میری عقل ہے میرے جنوں کی ہم پایہ
وہی عقائدِ افسوں زدہ، وہی اسطور
بدل کے شکل مری عقل کے ہیں ہمسایہ
کھلے تو کیسے کھلے مجھ پہ معنیِ اقرأ
کہ میرے علم پہ ہے میرے جہل کا سایہ
نہ میں نے سوچا کہ قرآں کا مدعا کیا ہے
عروجِ آدمِ خاکی کی انتہا کیا ہے
میں بت پرست نہیں ہوں پہ بت شکن بھی نہیں
وہ مردِ تیشہ بکف ہوں جو کوہکن بھی نہیں
میں کس کے نام لکھوں یہ ستم کہ اہلِ کرم
فقیہ و صوفی و ملاّ ہیں، برہمن بھی نہیں
میں ایک چہرہ تھا اور اب ہزار چہرہ ہوں
اب اعتبار کے قابل مرا سخن بھی نہیں

میں روشنی کے بہت خواب دیکھتا ہوں مگر
اُس انجمن میں جہاں شمعِ انجمن بھی نہیں
میں فکرِ بوذرؓ و صبرِ حسینؑ کا ورثہ
گنوا چکا ہوں تو ماتھے پہ اِک شکن بھی نہیں
میں چل رہا ہوں کسی پیرِ تسمہ پا کی طرح
اگرچہ پاؤں میں میرے کوئی رسن بھی نہیں
مرا وجود ہے سنگِ مزار کے مانند
کہ میرے ساتھ مری روح کیا، بدن بھی نہیں
میں 'شہرِ علم' سے منسوب کیا کروں خود کو
کسی کتاب کا سایہ مرا کفن بھی نہیں
کہا گیا جسے قرآں میں بندۂ مومن
وہ میں تو کیا کہ مرا کوئی ہم وطن بھی نہیں
ہر اُمتی کی یہ فردِ عمل ہے، کیا کیجئے
حضورؐ آپ ہی ہم سب کا فیصلہ کیجئے

O

بدن پہ پیرہنِ خاک کے سوا کیا ہے
مرے الاؤ میں اب راکھ کے سوا کیا ہے

یہ شہرِ سجدہ گزاراں، دیارِ کم نظراں
یتیم خانۂ ادراک کے سوا کیا ہے

تمام گنبد و مینار و منبر و محراب
فقیہِ شہر کی املاک کے سوا کیا ہے

کھلے سروں کا مقدر بہ فیضِ جہلِ خرد
فریبِ سایۂ افلاک کے سوا کیا ہے

یہ میرا دعویٔ خود بینی و جہاں بینی
مری جہالتِ سفاک کے سوا کیا ہے

جہانِ فکر و عمل میں یہ میرا زعمِ وجود
فقط نمائشِ پوشاک کے سوا کیا ہے

تمام عمر کا حاصل بہ فضلِ ربِ کریم
متاعِ دیدۂ نمناک کے سوا کیا ہے

O

ازل سے ایک عذابِ قبول درد میں ہوں
کبھی خدا تو کبھی ناخدا کی زد میں ہوں

خدا نہیں ہوں مگر زندہ ہوں خدا کی طرح
میں اک اکائی کے مانند ہر عدد میں ہوں

میں اپنا آپ ہی خالق ہوں آپ ہی مخلوق
میں اپنی حد سے گزر کر بھی اپنی حد میں ہوں

مرا تضاد ہی میری بقاء کا ضامن ہے
میں مطمئن ہوں اگر اپنے جزر و مد میں ہوں

یہی بڑائی ہے میری کہ آدمی ہوں میں
کہ اپنے جسم میں ہوں، اپنے خال و خد میں ہوں

O

جو آگ نہ تھی ازل کے بس میں
وہ آگ ہے میری دسترس میں

قدرت سے نبرد آزما ہوں
ہر چند ہوں جسم کے قفس میں

وہ لفظ ہوں کاتبِ ازل کا
اُترا جو ہزارہا برس میں

ہر دور میں حرفِ حق کہا ہے
میں اب بھی نہیں ہوں پیش و پس میں

شاعؔر کی نظر ہی جانتی ہے
کتنے ہیں جہان خار و خس میں

O

کب تک رہوں میں خوف زدہ اپنے آپ سے
اک دن نکل نہ جاؤں ذرا اپنے آپ سے

جس کی مجھے تلاش تھی، وہ تو مجھی میں تھا
کیوں آج تک میں دور رہا اپنے آپ سے

دنیا نے تجھ کو میرا مخاطَب سمجھ لیا
محوِ سخن تھا میں تو سدا اپنے آپ سے

تجھ سے وفا نہ کی تو کسی سے وفا نہ کی
کس طرح انتقام لیا اپنے آپ سے

لوٹ آ درونِ دل سے پکارے کوئی مجھے
دنیا کی آرزو میں نہ جا اپنے آپ سے

تناسخ

جب ایک سورج غروب ہوتا ہے
کم نظر لوگ یہ سمجھتے ہیں
اب اندھیرا زمیں کی تقدیر ہو گیا ہے
زمانہ زنجیر ہو گیا ہے

انہیں خبر کیا
کہ مہر و ماہ و نجوم سارے
تو روشنی کے ہیں استعارے

طلوع کا دل فروز منظر
غروب کا دل شکن نظارہ
ازل سے اس روشنی کا پرتو ہے
جو مسلسل سفر کے عالم میں
ہر مکاں، لامکاں کو اپنے جلو میں لے کر
رواں دواں ہے

یہ رات اور دن
ہر ایک ظاہر، ہر ایک باطن
ہر ایک ممکن
اسی تسلسل کا زیر و بم ہے
نگارِ فطرت کا حسنِ رم ہے

افق افق پر یہی رقم ہے
کہ جو عدم ہے
وہ زندگی کا نیا جنم ہے

پا بہِ گل

(انسانی ارتقاء کا ایک نفسیاتی مطالعہ)

صدیوں کا فاصلہ ہے جنگل سے میرے گھر تک
شاخِ ثمر بکف سے تخلیق کے ہنر تک
اُس پا پیادگی سے، اِس برق پا سفر تک

یہ فاصلہ ہے میرے ذہنِ رسا کا ضامن
منزل سے تا بہ منزل ہر نقشِ پا کا ضامن
ہر خواب، ہر حقیقت، ہر ارتقاء کا ضامن

اب میری دسترس میں، سورج بھی ہے ہوا بھی
یہ پرکشش زمیں بھی، وہ بے کشش خلا بھی
اب تو ہے میری زد میں دنیائے ماورا بھی

پھر بھی نہ جانے کیوں میں جنگل کو اتنا چاہوں
فردوسِ گم شدہ کے موہوم خواب دیکھوں
گلدان ہی میں اپنے، پودا کوئی لگاؤں

نوٹ ○ اس نظم میں پہلے یہ مصرعہ لکھا تھا۔

'آنگن میں کچھ نہیں تو اک پیڑ ہی لگاؤں'

جو میرے خیال میں ہر گھر پر صادق نہیں آتا۔ آنگن سے ہم محروم ہوتے جا رہے ہیں (شاعر)

گوسالہ

لوحِ کلیم ٹوٹ گئی ـــ پارہ پارہ ہے
ہارون شرمسار کہ موسیٰ سے کیا کہے
گوسالے کو جب اُمت موسیٰ خدا کہے
گوسالہ زر پرستی کا جو استعارہ ہے

لفظوں کے در کھلے تو معانی ہوئے عیاں
جاری ہے ہر خیال میں آزر کا سلسلہ
ٹوٹا نہیں حرم میں بھی پتھر کا سلسلہ
اک کارگاہِ سنگ ہے، شیشے کی ہر دکاں

گوسالہ اب بھی زندہ ہے دولت کے روپ میں
بدلے نہیں ہیں آج بھی آدابِ بندگی
اک سامری کا خواب ہے، ہر خوابِ بندگی
یہ رات، سایہ سایہ ہے سورج کی دھوپ میں

ید بیضاء

مری ہتھیلی کے سانپ کب تک ڈسیں گے مجھ کو
مری ہتھیلی کے سانپ جو، اب۔۔۔
مری رگوں میں اتر چکے ہیں
بدن کو زنجیر کر چکے ہیں

میں خواب دیکھوں تو کوئی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ دے
قدم اٹھاؤں تو کوئی میرے قدم پکڑ لے
پلٹ کے دیکھوں تو کوئی پیچھے نہ کوئی آگے
بس ایک سایہ
مری حقیقت کا اک کنایہ

مری حقیقت کہ میں اندھیرے کی رہنمائی میں چل رہا ہوں
ازل سے اک سامری کے سانپوں میں پل رہا ہوں

مری ہتھیلی کہ جس میں روشن
وہ آگ بھی ہے وہ نور بھی ہے
جو دستِ موسیٰ ہے طور بھی ہے
جو اس عصاء کی تلاش میں ہے
جو ہر تہی دست کی متاعِ گراں بہا ہے
جو کشتگانِ طلسمِ زر کی حیاتِ تازہ کا معجزہ ہے
جو عہدِ حاضر کے ساحروں
اور ان کے سانپوں کے واسطے
ضربتِ قضاء ہے

احتجاج

جو کاٹتے ہیں شاخِ گل، جو چھانٹتے ہیں برگ و بار
وہ جن کے نام کی دہائی دے ہر ایک شاخسار
انہیں خبر نہیں کہ برگ و بار کا
شجر شجر ہر ایک شاخسار کا
زمیں سے ایک رشتۂ نمو بھی ہے
وہ رشتۂ نمو جو سرخرو بھی ہے
ہر ایک شاخ ہاتھ میں گل و ثمر لیے ہوئے
نکل پڑے گی بطنِ خاک کے گہر لیے ہوئے
زمیں جو اِس گہر سے آبدار ہے
یہ آفتاب کا زمیں سے پیار ہے
انہیں خبر نہیں، مجھے یقین ہے
زمین، آفتاب کی امین ہے
نمودِ گل، ثمر ہے دو دلوں کے امتزاج کا
یہ سر بلند شاخِ گل، علم ہے احتجاج کا

O

اس شہر خفتگان میں کوئی تو اذان دے
ایسا نہ ہو زمیں کا جواب آسمان دے

پڑھنا ہے تو نوشتۂ بین السطور پڑھ
تحریرِ بے حروف کے معنی پہ دھیان دے

سورج تو کیا بجھے گا مگر اے ہوائے مہر
تپتی زمیں پہ ابر کی چادر ہی تان دے

اب دھوپ سے گریز کرو گے تو ایک دن
ممکن ہے سایہ بھی نہ کوئی سائبان دے

میں سوچتا ہوں اس لیے شاید میں زندہ ہوں
ممکن ہے یہ گمان، حقیقت کا گیان دے

میں سچ تو بولتا ہوں مگر اے خدائے حرف
تو جس میں سوچتا ہے، مجھے وہ زبان دے

سورج کے گرد گھوم رہا ہوں زمیں کے ساتھ
اس گردشِ مدام سے مجھ کو امان دے

میں تنگیٔ مکاں سے نہ ہو جاؤں تنگ دل
اپنی طرح مجھے بھی کوئی لامکان دے

میری گواہی دینے لگے میری شاعری
یارب مرے سخن کو وہ حسنِ بیان دے

نسبتِ خاک

زمیں سے کیوں نہ مجھے پیار ہو کہ میرا وجود
ازل سے تا بہ ابد خاک سے عبارت ہے
مرا خیال، مرے خواب، میری فکر و نظر
جسد سے تا بہ لحد خاک سے عبارت ہے

وہ مشتِ خاک جسے نور نے کیا سجدہ
خرد کے نت نئے سانچوں میں ڈھل رہی ہے آج
وہ آگ جس نے کیا انحرافِ عظمتِ خاک
خود اپنی ذات کے دوزخ میں جل رہی ہے آج

میں اپنی خاک سے کس طرح بے نیاز رہوں
مری زمیں مجھے جنت دکھائی دیتی ہے
وہ گفتگو جو سرِ عرش میرے حق میں ہوئی
خدا کے لہجے میں اب بھی سنائی دیتی ہے

میں اپنی خاک وطن سے جو پیار کرتا ہوں
تو اس لیے کہ مجھے اِس سے خاص نسبت ہے
مرے وجود کی عظمت، مرا عروج و زوال
ازل سے تا بہ ابد خاک سے عبارت ہے

O

پتھر میں ہیں ڈھلے ہوئے شبنم سرشت لوگ
دوزخ کو بھی بنائے ہوئے ہیں بہشت لوگ

گل کیا، ثمر بھی بانٹ رہے ہیں بصد خلوص
اپنا نصیب سمجھے ہوئے سنگ و خشت لوگ

سینے میں، آئینے کی طرح پاک صاف دل
معصوم و سادہ، بے خبرِ خوب و زِشت لوگ

لوحِ کلیم سی وہ جبینیں کہ حرف حرف
پڑھ لیں خود اپنے عہد کی بھی سرنوشت لوگ

اک عمر کاٹ کر بھی طلسم سراب میں
سیراب کس قدر ہیں یہ بے آب وکشت لوگ

O

جو کچھ بھی گزرنا ہے، مرے دل پہ گزر جائے
اترا ہوا چہرہ مری دھرتی کا نکھر جائے

اک شہرِ صدا سینے میں آباد ہے لیکن
اک عالمِ خاموش ہے جس سمت نظر جائے

ہم بھی ہیں کسی کہف کے اصحاب کے مانند
ایسا نہ ہو، جب آنکھ کھلے وقت گزر جائے

جب سانپ ہی ڈسوانے کی عادت ہے تو یارو
جو زہر زباں پر ہے وہ دل میں بھی اتر جائے

کشتی ہے مگر ہم میں کوئی نوح نہیں ہے
آیا ہوا طوفان خدا جانے کدھر جائے

میں سایہ کیے ابر کے مانند چلوں گا
اے دوست جہاں تک بھی تری رہگزر جائے

میں کچھ نہ کہوں اور یہ چاہوں کہ مری بات
خوشبو کی طرح اُڑ کے ترے دل میں اتر جائے

O

حیراں نہ ہو یہ زہر ہے اپنی ہی کِشت کا
اک رشتہ سانپ سے بھی ہے باغِ بہشت کا

اچھا کیا کہ تو نے مرا گھر ہی ڈھا دیا
یوں بھی یہ اک فریب ہی تھا سنگ وخشت کا

آرائشیں جدا سہی، بنیاد ایک ہے
کعبے سے مختلف نہیں پتھر کنشت کا

اس کو رقم کرے گی مرے بعد نسلِ نو
جو باب رہ گیا ہے مری سرگذشت کا

بے زمین نسل کا نوحہ

ہر شخص اپنے گھر کی طرف جا رہا ہے اب
اے آسماں بتا کہ ہمارا ہے گھر کہاں

اللہ کی زمین پہ ڈھلتا ہوا یہ دن
کیا جانے چھوڑ آیا ہے اپنی سحر کہاں

سورج کے ڈوبتے ہی ہنسی کھلکھلا کے رات
اس رات میں جلائیں چراغِ نظر کہاں

آغوشِ بام و در کہو، یا ماںتا کی گود
اب ماںتا کی گود بھی ہے معتبر کہاں

جس روشنی کے گرد اندھیرا ہو دور تک
اس روشنی کا ہو گا دلوں میں گزر کہاں

زیرِ زمین دوڑتے پھرتے ہیں زلزلے
ہم اس زمیں پہ پاؤں تو رکھیں مگر کہاں

سر پر جو بدلیاں تھیں، ہواؤں میں اُڑ گئیں
اب سر پہ آسماں تو ہے، شانوں پہ سر کہاں

خاموش انتظار میں اک عمر کٹ گئی
لیکن شبِ فراق ہوئی مختصر کہاں

حدِ نگاہ پر جو ستارہ تھا، بجھ گیا
’اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں‘

مریم سے ایک سوال

مریم تمہیں تو خون تھا اپنا بہت عزیز
تم نے اُس کے واسطے سب سے لڑائی کی

تاریخ ہے گواہ کہ اپنی انا کے ساتھ
(لے کر خدا کا نام) تمہیں نے خدائی کی

تم نے حسب نسب کی روایت کو توڑ کر
رکھی بِنا، جہان میں آزاد اکائی کی

جس خوں سے سرخرو ہوئی مجروح ماںتا
اس خوں نے آدمی کی بہت رہنمائی کی

جو ہاتھ پھول بن گیا شاخِ صلیب پر
اس نے رخِ حیات کی پردہ کشائی کی

مریم یہ خون بھی تو تمہارا ہی خون ہے
کیوں تم نے اپنے خون سے بے اعتنائی کی

اس خون میں مہک ہے تمہارے ہی دودھ کی
کیوں مامتا پہ شرط ہے اب کتخدائی کی

تم تو زمیں ہو، مرکزِ تخلیق زندگی
کیوں آج تم کو فکر ہوئی پارسائی کی

تم نے تو آدمی کو کیا تھا خدا صفات
تکذیب کی ہے کس لیے اپنی بڑائی کی

کیوں آج شرطِ رزق ہے یہ شجرۂ نسب
تم نے تو اپنے آپ سے بھی بے وفائی کی

مریم، کہو کہ جائے یہ لختِ جگر کہاں
اللہ کی زمین پہ ہے اس کا گھر کہاں

پرانے سلسلے نئے رابطے

عمر ہو، جام تماچی ہو یا چنیسر ہو
تمہارا کوئی بھی ہو نام، کوئی مذہب ہو
تمہاری خاک سے میں ہوں، مرے لہو میں ہو تم
مرے خدا کی زمیں کا وقار تم سب ہو

وہ ماروی ہو کہ نوری، سسی ہو یا لیلاں
ہر ایک پیار بھرا دل، مری زمیں کا جمال
کراچی تا بہ موئن جودڑو، مری تاریخ
ہر اک فسانہ، مری داستانِ ہجر و وصال

میں اپنی چاہ میں رانو، وفا میں رائے ڈیاچ
مرا سکون ہے سورٹھ، مرا جنوں بیجل
مرے وجود میں شہباز، روح میں سرمد
مرا دماغ لطیفی تو میرا دل سچل

مرا بدن مری دھرتی ہے جس کے دامن میں
بچھے ہوئے ہیں یہ دریا، مری رگوں کی طرح
یہ ریگ زار ہے میرا ہی ریزہ ریزہ جسد
مرے درخت ہیں سب میرے بازوؤں کی طرح

میں ابر بن کے اڑا تو میرے سمندر نے
مری ہواؤں کا جھولا بنا دیا مجھ کو
کیا گریز زمیں سے تو بے زمینی نے
وہ گردشیں دیں، بگولہ بنا دیا مجھ کو

میں گرد گرد کہیں تھا تو آب آب کہیں
سمیٹتا رہا پھر بھی زمیں کا چاک مجھے

دِکھا کے مجھ کو مرا ظرف، کوزہ گر کی طرح
مرے حدود میں لے آئی میری خاک مجھے

مرا سفر مری تاریخ کا ہے آئینہ
وہ آئینہ جو شکستہ بھی ہے سلامت بھی
کسی کو اس میں نظر آئے کیا مرا پرتو
کہ میں بھی جس میں ہوں کچھ اور میری صورت بھی

یہ چہرہ جس کا ابھی کوئی نام ہے نہ نسب
یہ چہرہ میرا ہے، لیکن ہے یہ تمہارا بھی
وہ رابطہ کہ جو تاریخ میں ہے دفن کہیں
ہماری ہم نسبی کا ہے استعارہ بھی

تمہارے ورثۂ اجداد کو خدا رکھے
مجھے بھی پیار مرے شہرِ ہست و بود سے ہے
مری زمیں ہے مری ماں میں ابنِ مریم ہوں
تمہارا خوں سے ہے رشتہ تو میرا دودھ سے ہے

موئین جوڈرو میں دوسرا آدمی

بدل گئے ہیں عقیدے، بدل گئی تہذیب
مگر وہ خون کہ آتی ہے جس سے بوئے حبیب
بدن کا دوست ہے لیکن دماغ و دل کا رقیب

لہو کا رشتہ، ازل اور ابد کا رشتہ ہے
بصد تضاد سہی، خال و خد کا رشتہ ہے
یہ آدمی کی دوئی میں اَحد کا رشتہ ہے

میں سوچتا ہوں کہ میرے ہزار نام سہی
میں زندگی کی مسافت میں بے مقام سہی
یہ میرے حال سے ماضی کا انتقام سہی

میں آج اپنے کھنڈر میں ہوں اپنے گھر کی طرح
یہ میرے ساتھ رہا میرے بام و در کی طرح
یہ شہر مجھ میں ہے زندہ، مرے ہنر کی طرح

میں اجنبی نہیں روحِ وطن، مجھے پہچان
میں تیرا خون ہوں، تیرا بدن مجھے پہچان
نہاں ہے مجھ میں ترا بانکپن مجھے پہچان

O

یہ معجزہ بھی وقت کا کتنا عظیم ہے
اب دست سامری میں عصائے کلیم ہے

وہ وقت ہے کہ لفظ سے معنی بچھڑ گئے
روئیں دوئی کو کیا کہ اکائی دونیم ہے

ہارون کی آواز

دیکھو ابھی ہے وادیِ کنعاں نگاہ میں
تازہ ہر ایک نقشِ کفِ پا ہے راہ میں
یعقوبؑ بے بصر سہی، یوسفؑ کی چاہ میں
لہرا رہا ہے آج بھی طُرہ کلاہ میں
یہ طرہ گر گیا تو الٹ جائے گی زمیں
محور سے اپنے اور بھی ہٹ جائے گی زمیں

تاریخ کے سفر میں غلط بھی قدم اٹھے
گاہے لباسِ فقر میں اہلِ حشم اٹھے
گاہے صنم تراش بہ نامِ حرم اٹھے
پردے نگاہ کے بھی مگر بیش و کم اٹھے

یوں بھی ہوا۔۔۔ دہائی اکائی میں ڈھل گئی
خورشید کے الاؤ میں ہر شے پگھل گئی

جب یوں نہ ہو سکا تو یہ تاریخ ہے گواہ
اٹھے عصا بدست، غلامانِ کج کلاہ
زیرِ زمیں کشادہ ہوئی زندگی کی راہ
اور کچھ نہ کر سکی، کسی فرعون کی سپاہ
ہر موجِ نیل، سانپ سی بل کھا کے رہ گئی
اہرام کی نگاہ بھی پتھرا کے رہ گئی

اضداد کی یہ جنگ، اصولِ قدیم ہے
اور اب کہ آدمی کی اکائی دونیم ہے
افلاک کے تلے سہی، مٹی عظیم ہے
ہارون کی زبان بھی، لوحِ کلیم ہے
حد سے گزر نہ جائیں کہیں کمترین لوگ
موسیٰ کے انتظار میں ہیں بے زمین لوگ

O

ہر پل گزشتنی ہے تو پھر کیوں ملال ہو
ممکن ہے کل یہ وقت بھی خواب و خیال ہو

شوقِ سفر میں گرد نہ اتنی اڑا کہ پھر
منزل پہ جا کے سانس بھی لینا محال ہو

اُس کو ملے گی بھیک ہی جس طرح بھی ملے
کاسہ نما دراز جو دستِ سوال ہو

اب آگہی کی زد پہ ہیں صدیوں کے واہمے
لاکھ آسماں اٹھائے ہوئے اپنی ڈھال ہو

وہ عشق کیا جو حدِ جنوں تک نہ آ سکے
وہ لمس کیا جو موجِ صبا کی مثال ہو

جی چاہتا ہے اب وہ رُت آئے کہ جس کے ساتھ
سورج کا غیظ ہو تو ہوا کا جلال ہو

پگھلے یہ برف ٹوٹ گریں خشک برگ و بار
آئے وہ فصل، شعلہ فشاں ہر نہال ہو

شامِ وصال میں نہ ہو دھڑکا فراق کا
صبحِ فراق بھی بہ امیدِ وصال ہو

ہر لفظ میں ہو صورتِ معنی دلوں کی آگ
شعلہ بیاں یہ شاعرِ شیریں مقال ہو

یوسفِ ثانی

میں چاہ کنعاں میں زخم خوردہ پڑا ہوا ہوں
زمیں میں زندہ گڑا ہوا ہوں
کوئی مجھے اس برادرانہ فریب کی قبر سے نکالے
مجھے خریدے کہ بیچ ڈالے
کہ چشمِ یعقوب تو مرے غم میں کل بھی گریاں تھی
آج بھی ہے

کاش!

یہ سب اشجار کتنے خوبصورت ہیں
نظر آتا ہے
سب کڑیل جواں، دھرتی کے بیٹے
موسموں کا ظلم سہتے
سر اٹھائے اپنے پیروں پر کھڑے ہیں
اپنی ماں کو اپنے سائے میں لیے
سینہ سپر، میں
کاش میں بھی اک شجر ہوتا

○

خوش ہو رہے ہیں لوگ رقیبوں کے بخت پر
شہزادیٔ سبا ہے، سلیماں کے تخت پر

بیٹھے ہوئے زمیں پہ جگالی میں ہیں مگن
وہ جانور جو چڑھ نہیں سکتے درخت پر

شاید کہ راس آ گئیں جنگل کی وحشتیں
چونکا نہیں ہے کوئی صدائے کرخت پر

اب سوچتے ہیں، ابر ہے دوشِ ہوا پہ کیوں
کیوں آشیاں بناتے ہیں طائر درخت پر

پتوں کی تالیاں ہیں کہ گھوڑوں کی ٹاپ ہے
رکھنا نگاہ ہم سفرو اپنے رخت پر

کوئی تو ہو جو اشک بہائے مری طرح
بکھری ہوئی متاعِ دلِ لخت لخت پر

شاعرؔ یہ کیا زمین چنی شعر کے لیے
تیشہ چلائے جیسے کوئی سنگِ سخت پر

O

وہ ستارہ کہ جو دیکھو تو شبِ آثار بھی ہے
سوچیے تو وہی سورج کا پرستار بھی ہے

صرف دیوار کو رستے کی رکاوٹ نہ سمجھ
پسِ دیوار کہیں، سایۂ دیوار بھی ہے

یہ الگ بات کہ میں ہی نہیں یوسف ورنہ
بکنا چاہوں تو یہاں مصر کا بازار بھی ہے

نقدِ جاں چھیننے والوں سے کوئی یہ کہہ دے
مرے قبضے میں ابھی دولتِ پندار بھی ہے

وہ بھلا کیسے سکوں پائے کہ جس کی قسمت
دلِ حساس بھی ہے، دیدۂ بیدار بھی ہے

اک عذاب اور بھی ہے اہلِ وفا پر نازل
حسن کا پاس تو ہے، عشق کا پندار بھی ہے

یہ عجب کیفیتِ دل ہے کہ سب کچھ کہہ کر
اِک خلش سی ہے کہ کچھ تشنۂ اظہار بھی ہے

میں تو یوں چپ ہوں کہ آئے نہ ترے ذوق پر حرف
جو سخن فہم ہے، غالبؔ کا طرف دار بھی ہے

چپ کا لمحہ

ذرا شور کم ہو تو سوچوں
یہ خاموش الفاظ کیا کہہ رہے ہیں
ابھی تو وہ عالم ہے
گویا میں نقار خانے میں ہوں
میری اپنی ہی آواز مجھ کو سنائی نہیں دے رہی ہے
میں کیوں لفظ ضائع کروں
زبان اور قلم کا گنہ گار بن کر
میں کیا کر سکوں گا

صحافت

ہر اک اخبار۔۔۔یوں لگتا ہے
مجرم کا کٹہرا ہے
کٹہرے میں کھڑا ہر لفظ
جمہوری عدالت میں
صداقت کی قسم کھا کر
نیا اک جھوٹ گھڑتا ہے

O

آنکھ کی قسمت ہے اب بہتا سمندر دیکھنا
اور پھر اک ڈوبتے سورج کا منظر دیکھنا

شام ہو جائے تو دن کا غم منانے کے لیے
ایک شعلہ سا منوّر اپنے اندر دیکھنا

روشنی میں اپنی شخصیت پہ جب بھی سوچنا
اپنے قد کو اپنے سائے سے بھی کمتر دیکھنا

سنگِ منزل، استعارہ، سنگِ مرقد کا نہ ہو
اپنے زندہ جسم کو پتھر بنا کر دیکھنا

کیسی آہٹ ہے، پسِ دیوار آخر کون ہے
آنکھ بنتا جا رہا ہے، روزنِ در دیکھنا

ایسا لگتا ہے کہ دیواروں میں در کھل جائیں گے
سایۂ دیوار کے خاموش تیور دیکھنا

اک طرف اڑتے ابابیل، اک طرف اصحابِ فیل
اب کہ اپنے کعبۂ جاں کا مقدر دیکھنا

صفحۂ قرطاس ہے یا زنگ خوردہ آئینہ
لکھ رہے ہیں آج کیا اپنے سخنور دیکھنا

تیسری ہجرت

(سرور بارہ بنکوی کے انتقال پر)

سرور تم بھی چلے گئے ہو
خدا کی یہ سرزمیں تمھیں بھی نہ راس آئی
تمھارے دل میں بھی رفتگاں کی طرح کوئی غم
سلگ کے ناسور بن گیا تھا
جسے تم اپنے حسین اشعار میں چھپا کر
شکستہ دل ساتھیوں کو تسکین دے رہے تھے
یہ زہرِ غم جس کو پی کے تم نیل کنٹھ کی طرح جی رہے تھے
کسے خبر تھی
تمھیں اس ایثار کا وہ اجرِ عظیم دے گا
کہ تم وطن در وطن نئی ہجرتوں کے پیہم عذاب کی اک مثال بن کر
ہماری تاریخ کے لیے اک سوال بن کر
خدا کی اس سرزمیں کا احساں اتار دو گے
ہر اک غریب الوطن کو اپنے مآل کا انتظار دو گے

O

جوشِ نمو میں سر جو اٹھاتی ہیں ڈالیاں
پتے ہوا کی شہ پہ بجاتے ہیں تالیاں

اس رقصِ بے خودی میں چھلک کر نہ گر پڑیں
شاخوں کے ہاتھ سے کہیں پھولوں کی پیالیاں

یہ کہہ کے اڑ گئے ہیں پرندے درخت سے
کرتے رہو زمین پہ بیٹھے جگالیاں

گنبد کی طرح دوش پہ رکھے ہوئے ہیں سر
جسموں کے مقبروں میں دریچے نہ جالیاں

جلوت گریز ہی سہی، خلوت میں دیکھنا
کیا گل کھلا رہی ہیں تری پردے والیاں

شاہی حرم سے ’شاہی محلّہ‘ تک آ گئیں
شام اوَدھ کے ساتھ کراچی کی چالیاں ٥

مسی کی سب سیاہیاں دل میں اتر گئیں
ہونٹوں پہ خونِ دل کی ابھر آئیں لالیاں

الفاظ کی منڈیر سے نیچے اتر کے دیکھ
بین السطور سے جو گذرتی ہیں نالیاں

وہ تو دکھا رہا ہے ہتھیلی میں سبز باغ
یاں آمدِ بہار کی ہیں خوش خیالیاں

٥ مزدوروں کے گھر

غمِ مشترک

(یومِ مئی)

یہ غم، تمہارا غم نہیں، مزدور ساتھیو
یہ غم ہمیں بھی کم نہیں، مزدور ساتھیو
انداز مختلف سہی، منصب تو ایک ہے
جب تم نہیں تو ہم نہیں، مزدور ساتھیو

گولی چلی جو تم پہ تو ہم بھی ہوئے شہید
تیشے کے ساتھ لوح و قلم بھی ہوئے شہید

جو خون قتل گاہِ شکاگو میں بہہ گیا
وہ داغ بن کے دامنِ مغرب پہ رہ گیا
وہ خون بے ضمیر نہ تھا، بے صدا نہ تھا
خاموش ہو کے جبر کا ہر راز کہہ گیا

یہ دن شعورِ جبر کے اظہار کا ہے دن
صدیوں میں ایک لمحۂ بیدار کا ہے دن

وہ لمحہ جس نے فکر کا دھارا بدل دیا
صدیوں کی پستیوں کو ابھارا، بدل دیا
تاریخ کے عمل میں صداقت کو جانچ کر
زندہ حقیقتوں کو نکھارا، بدل دیا

اب آئینہ ہی اور ہے صورت ہی اور ہے
نوعِ بشر سے شرطِ رفاقت ہی اور ہے

اب آدمی نے جان لیا آدمی کا فن
انسانیت کا نام ہے اور زرگری کا فن
معیار خوب و زِشت بدل کر بصد وقار
مردہ دلوں نے سیکھ لیا زندگی کا فن

مانا کہ سامری کی خدائی عظیم ہے
اب اپنے ہاتھ میں بھی عصائے کلیم ہے

ہم تم گزر کے آئے ہیں جس پل صراط سے
وہ اک سحر کی جنگِ مسلسل تھی رات سے
اب فتح کے قریب ہے سورج کا مورچہ
اب چھوٹنے نہ پائے کوئی ہاتھ، ہاتھ سے

بڑھتے چلو کہ سامنے جو رہگزار ہے
کیوبا سے ویت نام تلک اُستوار ہے

انقلاب

زمین کو آخر جلال آیا
فلک کا عہدِ زوال آیا
بپھر اٹھا ہے ہر ایک جنگل
نکل پڑے چھاپہ ماروں کے دَل
پہاڑ ڈھالوں میں ڈھل گئے ہیں
درخت بھالوں میں ڈھل گئے ہیں
بنا ہوا ہے ہر ایک ذرہ
برستی گولی لپکتا چھرہ
ہر ایک دریا ہے ناگ جیسا
لہو ہے سیال آگ جیسا
خدائے زر سے ٹھنی ہوئی ہے
زمین سورج بنی ہوئی ہے

O

ہر لفظ سے معانی تہہ دار کھینچنا
جو نقش ہو وہ نقش بہ دیوار کھینچنا

کیا لوگ تھے کہ ہجر میں تھا جن کا مشغلہ
عکسِ جمالِ یارِ طرح دار کھینچنا

ان کو تھی ایک فکر، کہ فکرِ سخن کہیں
ہم کو یہ زندگی گراں بار کھینچنا

اپنا نصیب، فکرِ معاش اور غمِ معاش
ان کا نصیب، عشق کا آزار کھینچنا

ان کا عمل، قصیدۂ شاہانِ کج کلاہ
اپنا عمل، عمامہ و دستار کھینچنا

O

اِک سنگدل کا پھر ہے مقدر بنا ہوا
ہر آدمی ہے شہر میں پتھر بنا ہوا

گوتم سے شرمسار، ارسطو ہے یا نہیں
پورس کی سرزمیں پہ سکندر بنا ہوا

اس کو ستم نصیب کہوں یا ستم نواز
جو آدمی ہے صبر کا پیکر بنا ہوا

کیا جانے کب نیام سے باہر نکل پڑے
جو ہاتھ آستیں میں ہے خنجر بنا ہوا

تجھ کو نظر نہ آئے تو میری نظر سے دیکھ
آئینے کے ادھر ہے جو منظر بنا ہوا

بنیاد پر نظر ہو تو شاید سمجھ سکو
کیوں ٹوٹنے لگا ہے مرا گھر بنا ہوا

یہ بات ظرف کی ہے مگر کس سے کیجئے
قطرہ بھی آج کل ہے سمندر بنا ہوا

O

زمیں پہ دھوپ کی چادر بچھائے لیٹے ہیں
مرے وطن یہ ترے خوش نصیب بیٹھے ہیں

O

اب کیا فلک کی بات کریں ہم زمین پر
سائے گماں کے چھائے ہوئے ہیں یقین پر

گر پڑھ سکو نوشتۂ بین السطور کو
دل کا ہر ایک حال رقم ہے جبین پر

اب اس قدر بھی دعویِٰ مہر و وفا نہ کر
پڑنے لگی نگاہ تری آستین پر

ڈرتا ہوں تیرے قول و عمل کے تضاد سے
الزام آ نہ جائے کہیں تیرے دین پر

O

شاید بِنا رکھی ہے ہماری ہواؤں پر
اب تک گزر رہی ہے بقاء کی دعاؤں پر

محسوس ہو رہا ہے گراں گوش ہے یہ عہد
رکھ دی بساطِ حرف جو ہم نے صداؤں پر

گل کاریوں سے لاکھ چھپاؤ لہو کے داغ
چہرے بنے ہوئے ہیں تمہاری قباؤں پر

اک چیخ جیسے ہو گئی ساکت فضاؤں میں
اب کے عجیب سحر ہے طاری نواؤں پر

تیری جفا بھی مصلحت آمیز تھی اور آج
تو چاہتا ہے شک نہ ہو تیری وفاؤں پر

پتھر تھے کل، اور آج ہیں انساں کے روپ میں
یارب کوئی عذاب، زمیں کے خداؤں پر

شاعرؔ خرید لو کہ خطا پوش ہے عبا
باطن کا کوئی قرض نہیں پارساؤں پر

O

خدا تو ایک ہے لیکن خدا کے گھر ہیں بہت
کہ ملکیت کے بہانے، زمین پر ہیں بہت

اسی بہانے مقدر کا فیض جاری ہے
فقیہہ شہر کے فتوے بھی معتبر ہیں بہت

غریب کے لیے دنیا میں ایک چھت بھی نہیں
امیر کے لیے دیوار و بام و در ہیں بہت

غریب کے لیے دنیا، سرائے فانی ہے
امیر کے لیے جینے کے بھی ہنر ہیں بہت

غرض عجیب ہے یہ اہلِ شرع کی منطق
خداوِ دیں کے سہارے ہی، اہل زر ہیں بہت

جنہیں خود اپنے سوا کچھ نظر نہیں آتا
مری نگاہ میں ایسے بھی دیدہ ور ہیں بہت

یہ پھول چاند ستارے، اُسی کا پرتو ہیں
وہ ہم سفر نہ سہی، میرے ہم سفر ہیں بہت

O

اک جبر وقت ہے کہ سہے جا رہے ہیں ہم
اور اس کو زندگی بھی کہے جا رہے ہیں ہم

اعجاز دیدنی ہے طلسم سراب کا
دریا رکا ہوا ہے، بہے جا رہے ہیں ہم

رہنے کی یہ جگہ تو نہیں ہے مگر یہاں
پتھر بنے ہوئے ہیں، رہے جا رہے ہیں ہم

اونچی عمارتوں پہ ہے تعمیر کا گماں
اور اندرونِ ذات ڈہے جا رہے ہم

یہ دل کی تیرگی ہے کہ قسمت کی تیرگی
سورج کی روشنی میں گہے جا رہے ہم

رُباعی

تم ہی نہیں قسمت کے ہیں ہیٹے ہم بھی
برسوں سے ہیں دکھ درد سمیٹے ہم بھی
کیا تم سے کہیں اپنی تباہی کا سبب
نادان اب و جد کے ہیں بیٹے ہم بھی

O

زباں تو چپ ہے لیکن دل کہاں چپ رہنے والا ہے
صداؤں کے جہاں میں خامشی کا بول بالا ہے

ہمارے گرد تو خیر ایک مدت سے ہے تاریکی
وہ کیا دیکھے گا جس کے گرد اجالا ہی اجالا ہے

O

دن ہی رہا نہ دن کی کوئی بات رہ گئی
آنکھوں میں کاٹنے کے لیے رات رہ گئی

اک زنگ خوردہ آئینہ ہاتھوں میں آ گیا
اور دیکھنے کو صورتِ حالات رہ گئی

وہ لمس لمس پھول سا کھلتا ہوا بدن
خوابوں میں اُس کے قرب کی سوغات رہ گئی

وہ تو چلا گیا مگر اُس کے جمال کی
نادیدہ روشنی سی مرے ساتھ رہ گئی

O

اب کیا غزل میں بات کریں اس کے جور کی
حالات اپنے اور حکایات اور کی

اخبار سے زیادہ ہے دیوار معتبر
شاید ہو آپ کے لیے یہ بات غور کی

افسانہ یاد آ گیا اصحابِ کہف کا
تاریخ لکھنے بیٹھا تھا میں اپنے دور کی

O

تعمیر کے ہیں خواب مگر سطحِ آب پر
کشتی چلائی جاتی ہے موجِ سراب پر

جس کے سرور میں نہ ہو بیدار روحِ عصر
اک بوجھ ہے وہ نغمہ بھی تارِ رباب پر

جس میں ترے بدن کا ہو گلشن کھلا ہوا
سو جنتیں نثار ہیں اس ایک خواب پر

لاتی ہے اپنے ساتھ ہی طوفانِ رنگ و بو
وہ موجِ گل جو آئی ہوئی ہو شباب پر

جوشِ نمو سے آپ کھلے ہیں قبا کے بند
نشہ ہے اپنے خوں کا بدن کے گلاب پر

چراغ بجھ گیا

(منظر اکبر کے انتقال پر)

لوگ ملتے ہیں سر راہ بچھڑ جاتے ہیں
لیکن اک دوست جو دل میں رہا دھڑکن بن کر
وادیٔ جاں میں رہا، روح کا مسکن بن کر
اپنے پیکر میں جو اک پیکر محبوبی تھا
یوں تو تنہا تھا، مگر انجمنِ خوبی تھا
اس کے چہرے میں تھی کیا بات، بتاؤں کیسے
شاخِ سر سبز پہ کھلتا سا شگوفہ جیسے
گفتگو ایسی کہ محفل ہی دگر ہو جاتی
قہقہہ مار کے ہنستا تو سحر ہو جاتی

وہ ملاقات کا انداز کہ دل کھل جائیں
جیسے بچھڑے ہوئے برسوں کے بہم مل جائیں
اجنبی کو بھی مرے یار نے اپنا سمجھا
اپنی آنکھوں ہی کا کھویا ہوا سپنا سمجھا
ظرف ایسا کہ کوئی عالمِ وحشت آئے
اس کے لب پر نہ کبھی حرفِ شکایت آئے
اس نے ہم سب کی طرح دکھ بھی اٹھائے تھے بہت
زخم احباب کے ہاتھوں سے بھی کھائے تھے بہت
کام کرتا رہا، چلتا رہا اک عزم کے ساتھ
بزم آراء تھا، نبھاتا رہا ہر بزم کے ساتھ
مہر کے نام پہ یا قہر کی صورت گزری
اس نے ہنس ہنس کے سہی، جو بھی قیامت گزری
ایسا انسان جدا ہو یہ غضب ہے کہ نہیں
اپنے اللہ کی رحمت بھی عجب ہے کہ نہیں
لوگ ملتے ہیں سر راہ بچھڑ جاتے ہیں
جیسے ہم اجڑے ہیں، کب ایسے اجڑ جاتے ہیں

بازیافت

مدت کے بعد تم سے ملا ہوں تو یہ کُھلا
یہ وقت اور فاصلہ دھوکہ نظر کا تھا
چہرے پہ عمر بھر کی مسافت رقم سہی
دل کے لیے تمام سفر، لمحہ بھر کا تھا

کیسی عجیب ساعتِ دیدار ہے کہ ہم
پھر یوں ملے کہ جیسے کبھی دور ہی نہ تھے
آنکھوں میں کم سنی کے وہ سب خواب جاگ اٹھے
جن میں نگاہ و دل کبھی مجبور ہی نہ تھے

معصوم کس قدر تھیں وہ بے نام چاہتیں
بچپن سے ہم کنار تھا عہدِ شباب بھی
یوں آتشِ بدن میں تھی شبنم گھلی ہوئی
مہتاب سے زیادہ نہ تھا آفتاب بھی

پھر وہ ہوا چلی کہ سبھی کچھ بکھر گیا
وہ محفلیں، وہ دوست، وہ گلرنگ قہقہے
اب رقصِ گردباد کی صورت ہے زندگی
یہ وقت کا عذاب کہاں تک کوئی سہے

اب تم ملیں تو کتنے ہی غم ہیں تمہارے ساتھ
پتھر کی طرح تم نے گزاری ہے زندگی
کتنا لہو جلایا، تو یہ پھول مسکرائے
کس کس جتن سے تم نے سنواری ہے زندگی

میں نے بھی ایک جہدِ مسلسل میں کاٹ دی
وہ عمر، تھی جو پھول سے ارماں لیے ہوئے

اب وہ جنوں رہا ہے نہ وہ موسمِ بہار
بیٹھا ہوں اپنا چاک گریباں سیے ہوئے

اب اپنے اپنے خوں کی امانت ہے اور ہم
اور ان امانتوں کی حفاظت کے خواب ہیں
آنکھوں میں کوئی پیاس ہو، دل میں کوئی تڑپ
پھیلے ہوئے افق سے افق تک سراب ہیں

کس کو خبر تھی لمحہ اک ایسا بھی آئے گا
ماضی تمام پھر سمٹ آئے گا، حال میں
محسوس ہو رہا ہے کہ گزرا نہیں ہے وقت
اک لمحہ ڈھل گیا تھا فقط ماہ و سال میں

تم بھی وہی ہو، میں بھی وہی، وقت بھی وہی
ہاں اک بجھی بجھی سی چمک چشمِ نم میں ہے
یہ لمحہ جس کے سحر میں کھوئے ہوئے ہیں ہم
کتنی مسرتوں کا سرور، اس کے غم میں ہے

حریفِ وصال

عجیب شب تھی
جو ایک پل میں سمٹ گئی تھی
عجیب پل تھا
جو سال ہا سال کی مسافت پہ پرفشاں تھا
اور اس کے سائے میں ایک موسم ٹھہر گیا تھا
(کسی کے دل میں تھا کیا، کسی کو خبر نہیں تھی)

بس ایک عالم سپردگی کا
بس ایک دریائے تشنگی تھا کہ جس کی موجیں

امڈ امڈ کر بکھر رہی تھیں
کھلے سمندر میں ڈوب جانے کی آرزو میں مچل رہی تھیں

خیال۔۔۔حسنِ خیال میں گم
نگاہ۔۔۔خوابِ جمال میں گم
نہ جانے کس خواب کی یہ تعبیر تھی کہ آنکھوں میں جاگتی تھی
نہ جانے کس آرزو کی تکمیل ہو رہی تھی
کہ آنکھ سے آنکھ
لب سے لب محو گفتگو تھے
مگر بس اک بات معتبر تھی
کسی کے دل میں تھا کیا، کسی کو خبر نہیں تھی

وہ لمحہ گزرا کہ سحر ٹوٹا
یکا یک احساس عمر جاگا
ہر ایک چہرہ خود اپنی آنکھوں میں آئینہ ہو گیا ہو جیسے
طلسمِ سم سم سے جس خزانے کا در کھلا تھا

وہ یک بہ یک کھو گیا ہو جیسے
عجیب تھا ایک چور دل میں
جو اس خزانے کا پاسباں تھا
جو سائے کی طرح درمیاں تھا

تقاضۂ ماہ و سال تھا وہ؟
کہ دل کی گہرائیوں میں بیدار
کوئی خوفِ مآل تھا وہ
عجیب سا اِک خیال تھا وہ
ہجوم جذبات میں در آیا تھا جو حریفِ وصال بن کر
جو دل کی دھڑکن میں رک گیا تھا، ضمیر کا اِک سوال بن کر

O

یہ آرزو ہے کہ جب بھی گلے لگاؤں اُسے
حصارِ ذات سے باہر نکال لاؤں اُسے

وہ جل رہی تھی کڑی دھوپ کی تمازت میں
ملی جو اب تو اُڑھا دوں گا اپنی چھاؤں اُسے

یہ عشق بھی ہے عجب امتحانِ عہدِ وفا
وہ آزمائے مجھے اور میں آزماؤں اُسے

وہ شہر، شہرِ چراغاں سہی، مگر اِک دن
ہوائیں یاد دلائیں گی اپنا گاؤں اُسے

وہ اپنے خواب میں شاید مجھی کو دیکھتی ہو
میں تشنہ لب سہی، سوتے میں کیا جگاؤں اُسے

O

چاند نے آج جب اِک نام لیا آخرِ شب
دل نے خوابوں سے بہت کام لیا آخرِ شب

ہائے وہ خواب کہ تعبیر سے سرشار بھی تھا
اُس کی آنکھوں سے جو انعام لیا آخرِ شب

ہائے کیا پیاس تھی، جب اُس کے لبوں سے میں نے
مسکراتا ہوا اِک جام لیا آخرِ شب

میں جو گرتا بھی تو قدموں میں اُسی کے گرتا
اُس نے خود بڑھ کے مجھے تھام لیا آخرِ شب

زندگی بھر کی مسافت کا مداوا کہیے
اُس کی بانہوں میں جو آرام لیا آخرِ شب

O

تخاطب ہے تجھ سے، خیال اور کا ہے
یہ نکتہ وفا میں بڑے غور کا ہے

وہ خلوت میں کچھ اور جلوت میں کچھ ہے
کرم اس کا مجھ پر عجب طور کا ہے

مرا چہرہ بھی، میرا چہرہ نہیں ہے
یہ احسان مجھ پہ مرے دور کا ہے

یہ نفرت محبت کا ردِعمل ہے
کہ مجھ سے تقاضا، ترے جور کا ہے

نئے دور کی ابتدا کا ہے ضامن
کہ دل آئینہ گوشۂ ثور کا ہے

کراچی میں بھی معتبر ہو رہا ہے
سخن میں جو انداز لاہور کا ہے

O

ہو چکی اب شاعری لفظوں کا دفتر باندھ لو
تنگ ہو جائے زمیں تو اپنا بستر باندھ لو

دوش پر ایمان کی گٹھڑی ہو، سر ہو یا نہ ہو
پیٹ خالی ہیں تو کیا، پیٹوں پہ پتھر باندھ لو

عافیت چاہو تو جھک جاؤ سرِ پاپوشِ وقت
پھر یہ دستارِ فضیلت اپنے سر پر باندھ لو

قاضی الحاجات سے اک عہد باندھا تھا تو کیا
اب فقیہہ شہر سے عہدِ مکرر باندھ لو

آشیانوں میں چھپے بیٹھے ہیں سب شاہین و زاغ
تم بھی شاعر طائرِ تخئیل کے پر باندھ لو

حرف حرف روشنی

(ایک طویل نظم)

۱۹۷۴ء

(اپنے بچوں کی معرفت)

نئی نسل کے نام

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
سنو، یہ میری نصیحت بھی ہے وصیت بھی

میں آج تم میں ہوں موجود، کل نہیں ہوں گا
مگر جو تم ہو، تو میں ہوں سدا سلامت بھی

تم اپنا نقطۂ آغاز ہی سہی لیکن
تمہارے ساتھ رواں ہے مری روایت بھی

میں اپنے ماضیِ مرحوم کی امانت تھا
سو آج تم سے ہے منسوب یہ امانت بھی

مجھے جو غم ہے تو اتنا کہ اپنے ہی گھر میں
تمہارا ورثہ ہے، میرا عذابِ ہجرت بھی

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
تم اس عذاب کو اک امتحاں سمجھ لینا

تم اپنے غم کا نہ دینا زمین کو الزام
کوئی یقیں بھی دلائے، گماں سمجھ لینا

وطن کے نام پہ کوئی زیادتی ہو اُسے
عنایتِ نگہِ دوستاں سمجھ لینا

یہ جبرِ وقت بھی تاریخ کا تقاضہ ہے
اِسے بھی مرحلۂ قرضِ جاں سمجھ لینا

جو کوئی پوچھے تمہارا حسب نسب کیا ہے
تو میرے نام کو حرفِ زیاں سمجھ لینا

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
میں آج اپنی کہانی سنا رہا ہوں تمہیں

وہ راز جو میرے سینے میں دفن تھا اب تک
وہ راز اب سرِ محفل بتا رہا ہوں تمہیں

وہ خواب جس کی حقیقت ہے عالمِ سکرات
میں ایسے خوابِ گراں سے جگا رہا ہوں تمہیں

تم اپنی آنکھ سے دیکھو خود اپنے چہرے کو
کہ آج اپنا بھی چہرہ دِکھا رہا ہوں تمہیں

وہ 'حرفِ حق' جو سنایا نہیں گیا تم کو
سنو کہ پہلے پہل میں سنا رہا ہوں تمہیں

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
دروغ و مکر کا انبار ہے مری تاریخ

برائے نام خدا ہے، برائے نام ہے دیں
خدا و دیں کی گنہگار ہے مری تاریخ

نہ آدمی کی حقیقت نہ زندگی کا سراغ
فقط قصیدۂ دربار ہے مری تاریخ

فقیہ و شاعر و فن کار سب وظیفہ خوار
غلام فکر کا بیوپار ہے مری تاریخ

جو آج ’شاہی محلّہ‘ ہے کل یہی تھا ’حرم‘
حقیقتاً پسِ دیوار ہے مری تاریخ

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
تمہیں گمان کہ دیں دار تھے بہت اسلاف

وفا شعار، محبّ وطن، غریب نواز
عمل میں صاحبِ کردار تھے بہت اسلاف

حقیقتِ پسِ پردہ، بتاؤں کیسے تمہیں
نشے میں اپنے ہی سرشار تھے بہت اسلاف

بدلتے وقت کے تیور کو بھانپ لیتے تھے
ہر اِک گھڑی سے خبردار تھے بہت اسلاف

زمیں کی چاہ میں جاگیر کے تصور میں
بس اپنے شاہ کے غم خوار تھے بہت اسلاف

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
عجب حکایتِ مذموم ہے یہ افسانہ

خبر نہیں ہے کہ بین السطور میں کیا ہے
کچھ اتنا سادہ و معصوم ہے یہ افسانہ

ہجومِ لفظ میں اک حرفِ حق نہیں ملتا
صدائے حق سے بھی محروم ہے یہ افسانہ

یہ اور بات، مرے لوگ باشعور نہیں
جبینِ وقت پہ مرقوم ہے یہ افسانہ

مورخین اسے کوئی رنگ دیں لیکن
مرے خدا کو تو معلوم ہے یہ افسانہ

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
میں ابتدا سے سناؤں یہ داستان عجیب

وہ آریائی تمدن ہو یا کہ سامی ہو
وہ غوریوں کی حکومت ہو یا مغل تہذیب

مری زمین کو جس نے بھی دل سے اپنایا
سمجھ لیا اسے اہلِ وطن نے اپنا حبیب

بڑی کتابیں جو لکھی گئیں کہ اتری ہوں
انہیں سنبھال کے رکھا ہے اپنے دل کے قریب

عجب تھی تشنگیِ علم میرے لوگوں کی
ہر ایک علم ہے سینے میں آج بالترتیب

O

مرے لہو کے چراغو ـــ مرے جگر پارو
ورود کا یہ عمل بھی مگر ہے غور طلب

کسی نگاہ میں تھی اس زمیں کی زرخیزی
حصولِ زر تھا کہیں حملہ آوری کا سبب

کسی کو دیں سے محبت نہ فکر وفن سے پیار
کسی نے آ کے نہ پرکھا یہاں کا علم و ادب

جو چند لوگ کہیں تھے بھی اہلِ دل تو انہیں
زبان کھولنے دیتا نہ حکمراں کا غضب

ہو جوگیوں کی تپسیا کہ صوفیوں کا عمل
رہا ہے سینہ بہ سینہ بہ حرفِ زیرِ لب

O

مرے لہو کے چراغو ـــ مرے جگر پارو
تم اپنے دیس کی مٹی اٹھا کے دیکھو تو

ہر ایک ذرہ ہے اپنے لہو میں ڈوبا ہوا
حنا سے اپنی ہتھیلی سجا کے دیکھو تو

حرم سرا ہو کہ دربار ہو کہ راج بھون
سبھی ہیں ایک، یہ دیوار ڈھا کے دیکھو تو

وہی وزیر، وہی منتری، وہی سالار
کسی کا چہرہ کسی پر لگا کے دیکھو تو

کہیں زمین سے ملتا نہیں کنارِ فلک
بلندیوں پہ بہت دور جا کے دیکھو تو

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
وہ لوگ اور تھے جن سے ہے یہ زمیں روشن

وہ برہمن تھے نہ مُلّا نہ جوتشی نہ فقیہ
وہ عام لوگ تھے جن کا دِلوں میں تھا مسکن

وہی جنہوں نے بتانِ حروف کے بدلے
دلِ بشر کو بنایا حیات کا مخزن

خدا کو قید معابد سے دے کے آزادی
وسیع کر دیا اس کائنات کا دامن

زمیں گواہ کہ وہ خاک بھی مقدس ہے
جہاں جہاں بھی ہیں ان اہلِ درد کے مدفن

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
تمھیں خبر ہے کہ انساں ہے خواہشات کا نام

جو خواہشات ہوں پوری تو یہ جہاں فردوس
وگرنہ مرگِ مسلسل ہے اس حیات کا نام

خیال و خواب ہوں آزاد تو قفس بھی چمن
جو ہوں اسیر تو زنداں ہے کائنات کا نام

مگر یہ فلسفہ کیا ہے، یہ فلسفہ کیوں ہے
کہ زندگی کا ہے اثبات، قطعِ ذات کا نام

عوام کو یہ عقیدہ دیا گیا ہے کیوں
کہ قتلِ نفس ہے اک دائمی نجات کا نام

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
یہ نکتہ غور طلب بھی ہے، گفتنی بھی ہے

تمام عیش تجمل حسین خاں کے لیے
مگر ہو خواہش غالبؔ تو کشتنی بھی ہے

عوام کے لیے ہر اک شجر ہے ممنوعہ
خواص کے لیے اللہ بڑا غنی بھی ہے

غریب ہو تو وہ قسمت کا بھی غریب مگر
امیر ہو تو وہ تقدیر کا دھنی بھی ہے

فقیہِ شہر کی اس دو رخی نے سمجھایا
ہزار چہرہ ہو راون، شکستنی بھی ہے

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
میں مانتا ہوں کہ ہر عہد خام ہوتا ہے

ہر اِک زمانہ ہے اِک حدِ فکر کا پابند
اور اس کی زد میں ہر اک خاص و عام ہوتا ہے

ہر ایک لمحے کی تکمیل دوسرا لمحہ
یہ وقت کا ہے سفر، کب تمام ہوتا ہے

بس اک کشاکشِ اضداد ہے کہ جاری ہے
قیام ہے جو بظاہر خرام ہوتا ہے

وہ فلسفہ جو حقیقت نگر نہیں ہوتا
تو اس کا رد عمل انتقام ہوتا ہے

O

مرے لہو کے چراغو --- مرے جگر پارو
زوال بادشہی ہے، زوالِ فکر قدیم

وہ جبر و قدر کے اسرار، وہ رموزِ عدم
وہ ماورائے حقیقت، مجاز کی تفہیم

یہ زندگی ہے قفس اور موت آزادی
وہ لامکاں میں طلسم حیات کی تجسیم

حقیقتوں سے زیادہ وہ عکس پر اصرار
وہ آدمی سے سوا اس کے سائے کی تعظیم

جنون و عشق پہ ایمان اور خرد سے گریز
یہی تھا اپنے اب و جد کا ورثۂ تعلیم

O

مرے لہو کے چراغو --- مرے جگر پارو
تغیرات کی زد میں ہے زندگی کا نظام

ہر اک عمل کا مقدر ہے ایک ردعمل
ہر ایک صبح کی تقدیر میں لکھی ہے شام

ہر ایک مظہر فطرت ہے آدمی کا رفیق
ہر ایک لوح پہ کندہ ہے آدمی کا نام

زمیں کو اہلِ سیاست نے کر دیا تقسیم
وگرنہ اہلِ زمیں میں ہے کوئی خاص نہ عام

یہ شرق و غرب، سفید و سیاہ، پست و بلند
ہر ایک فرق سے بالا ہے آدمی کا مقام

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
یہ عہد، عہدِ خرد ہے ، بہ فیضِ حسنِ عمل

گمان و وہم کے سارے طلسم ٹوٹ گئے
کہ آدمی ہی ابد ہے اور آدمی ہی ازل

نہ وہ جہانِ عدم ہے، وجود کا مامن
نہ یہ جہانِ حسیں ہے، حیات کا مقتل

خدا بھی ہے تو وہیں ہے، جہاں ہیں ہم آباد
نظر میں وہ بھی ہے موجود، جو ہے آنکھ اوجھل

یہ وقت کا ہے تسلسل، طلوع ہو کہ غروب
یہ اک عمل کا تواتر ہے، زیست ہو کہ اجل

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
تمہیں زمین پر رہنا ہے آسماں کی طرح

سمیٹنا ہے ہر اک غم کو اپنے دامن میں
کشادہ ظرفیِ قلبِ پیمبراں کی طرح

ملا ہے جو بھی تمہیں میری زندگی کے عوض
عزیز رکھنا ہے اپنی متاعِ جاں کی طرح

یہ رہگزر جو بچھی ہے تمہارے قدموں میں
بصد خلوص کسی نیک میزباں کی طرح

اسی وطن کی عطا ہے، اسی وطن کا کرم
جنم دیا ہے تمہیں جس نے ایک ماں کی طرح

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
تم اب جہاں بھی ہو آباد اسی زمیں پہ رہو

جو اس زمیں کا ہے ماضی، وہی تمہارا ہے
وہی تمہاری ہے تاریخ، تم کہیں پہ رہو

شجر کا رشتہ جڑوں سے تو کٹ نہیں سکتا
جہاں جہاں بھی اُگے ہو، وہیں وہیں پہ رہو

تمہاری خاک بھی اس خاک ہی کا حصہ ہے
تم اپنی خاک میں مل جاؤ گے یہیں پہ رہو

خیال و خواب کی باتیں، فسانہ و افسوں
یقیں ہے اصل حقیقت سدا یقیں پہ رہو

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
ہر ایک ارضِ وطن کی یہی کہانی ہے

ہر اک زمین کا ہوتا ہے اپنا ایک ازل
وطن نیا سہی، تہذیب تو پرانی ہے

سراغ ملتا ہے تاریخ سے صداقت کا
یہ راز ایک حقیقت ہے اور زمانی ہے

یہ رَمز، وحدتِ اقوام میں ہے پوشیدہ
جو اپنے ربط سے ٹوٹی وہ قوم فانی ہے

ہزار گردشِ افلاک ہو، یہ گردشِ خوں
ازل سے جاری و ساری ہے، غیر فانی ہے

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
پلٹ کے دیکھو تو شاید زمانہ دکھلائے

وہ شہر جس نے تمھیں زندگی عطا کی ہے
وہ گھر کہ جس کے تصور سے تم کو نیند آئے

وہ پیڑ (ماؤں کے مانند) سائے میں جن کے
بھری دوپہر میں کچھ دیر تم بھی ستائے

وہ لوگ جن کی محبت کی تم نشانی ہو
وہ راستے جو تمھیں اپنے عہد تک لائے

وہ دور جس کے تسلسل کی اک کڑی ہو تم
تمھارے سامنے ہے آج ہاتھ پھیلائے

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
یہ ہاتھ ہاتھ میں لے لو کہ ہیں یہ پیار کے ہاتھ

ہزاروں سال کی بچھڑی ہوئی محبت کے
کسی کی یاد میں خاموش انتظار کے ہاتھ

خزاں کی راہ میں سرمایۂ نمو لے کر
گلوں کی آس میں بے رنگ شاخسار کے ہاتھ

ہوا کا جھونکا ہی شاید کوئی خبر لائے
کسی کی چاپ پہ رکتی ہوئی بہار کے ہاتھ

یہ ہاتھ چھوڑ نہ دینا اگر زمیں ہے عزیز
کہ ان سے بڑھ کے نہیں کوئی اعتبار کے ہاتھ

میں کچھ نہ کہوں اور یہ چاہوں کہ مری بات
خوشبو کی طرح اُڑ کے ترے دل میں اتر جائے

ثلاثیاں
اور
ہائیکو

اپنے باوا حضرت

مولوی عبدالغفور صاحب کے نام

جنہوں نے مجھے

زندگی کی 'معراج' عطا کی

(حمایت علی شاعر)

ثلاثی

تین مصرعوں پر مشتمل میری مختصر نظمیں ۔۔۔بغیر کسی نام کے ۔۔۔۱۹۶۰ء سے مختلف رسائل میں چھپ رہی تھیں۔ نام کے حوالے سے سب سے پہلے 'نئی قدریں' (حیدرآباد، سندھ) کے سالنامے (جنوری، فروری ۱۹۶۲ء) میں اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوئیں۔

'میرے خیال میں مختصر ترین نظم تین مصرعوں ہی پر مشتمل ہو سکتی ہے اس لیے میں نے اس نئی صنف کا نام مذہبی نظریات سے قطعِ نظر مثلث کی رعایت سے 'تثلیث' مناسب سمجھا۔'

جون ۱۹۶۲ء میں ہندوستان کے نقاد اثر فاروقی کا ایک مضمون 'الشجاع' (کراچی) میں شائع ہوا جس میں اُنہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ مذہبی عقیدے سے محفوظ رکھنے کے لیے مثلث ہی کی رعایت سے اس صنف کا نام 'ثلاثی' بھی رکھا جا سکتا ہے۔ مجھے یہ تجویز پسند آئی۔ میں نے اپنے کچھ بزرگ اہلِ قلم علامہ نیاز فتح پوری، حضرت اثر لکھنوی اور محترم احمد ندیم قاسمی سے بذریعہ خطوط مشورہ کیا۔ سبھی نے 'ثلاثی' کو پسند کیا چنانچہ سب سے پہلے اِس نام سے میری ثلاثیاں قاسمی صاحب کے رسالے 'فنون' (لاہور) ہی میں شائع ہوئیں۔

اِسی دوران میں کچھ 'احباب' نے میرے خلاف لکھنا شروع کر دیا اور مختلف رسائل میں مراسلوں کی صورت میں مجھ پر الزامات عائد کیے جانے لگے۔ آخر مجبور ہو کر 'الشجاع' نومبر ۱۹۶۳ء کے شمارے میں، میں نے ایک وضاحتی خط لکھا:

'اچھا اب ثلاثی کی اصل حقیقت ظاہر کر دوں، اس کی محرک نہ ہائیکو ہے نہ کسی شاعر کی نظم، ثلاثی کہنے کا خیال میرے دل میں رباعی سے پیدا ہوا۔ رباعی ہماری سب سے مختصر اور شائد

سب سے مشکل صنفِ سخن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم شعرأ اِس پر طبع آزمائی کرتے ہیں (اس کی ایک وجہ چند مخصوص بحروں کی پابندی بھی ہے) غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ اکثر رباعیوں میں دوسرا مصرعہ اضافی ہوتا ہے اور محض ہیئت کی پابندی کی خاطر کہا جاتا ہے۔ میں نے سوچا اگر پہلا مصرعہ ہی ہر طرح مکمل ہو تو دوسرے مصرعے کا احسان اُٹھانا نہیں پڑے گا اس طرح میں نے اپنے تئیں الفاظ کی 'فضول خرچی' سے دامن بچانے کی کوشش کی اور اِن مصرعوں کو اُن بحروں کا پابند نہیں رکھا جو رباعی کے لیے مخصوص ہیں۔ ہیئت میں اس تھوڑی سی تبدیلی سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ بحروں کے انتخاب سے شاعر کو آزادی مل گئی اور دوسرا یہ کہ ایک مختصر ترین صنفِ سخن وجود میں آئی جس میں خیال کو اور بھی احتیاط کے ساتھ نظم کرنے کی ذمہ داری شاعر پر عائد ہوتی ہے'۔

میری ثلاثیاں چھپتی رہیں اور مشاعروں میں بھی پسند کی جانے لگیں چنانچہ دوسرے شعرأ نے بھی اس صنف کو اپنا لیا اور جاپانی صنف 'ہائیکو' کے ساتھ کبھی کبھی ثلاثی کو بھی نوازتے رہے۔ بزرگ شعرأ میں حضرت راغب مرادآبادی نے اس کی طرف خاص توجہ دی۔ اُن کی ثلاثیوں کا مجموعہ 'سخنِ مختصر' کے نام سے شائع ہونے والا ہے جس کا انتساب اُنہوں نے میرے نام کیا ہے ؂

حمایت علی شاعرِ خوش کلام
ثلاثی ہے جن کی لطیف اختراع
ہے مجموعے کا انتساب اُن کے نام

راغب صاحب اردو کے پہلے شاعر ہیں جن کا پنجابی میں بھی ایک مجموعہ ہے 'تاریاں دی لو'، اُس میں رباعیات بھی ہیں اور ثلاثیاں بھی، ایک ثلاثی میں مجھے یوں نوازا ہے ؂

ثلاثی اے اردو وچ ایجاد اوہدی
حمایت علی جنھوں کہندے نیں شاعر
وسے دل چِ پنجاب دے یاد اوہدی

بعض شعرأ نے ثلاثی کو اپنا تو لیا ہے مگر اُسے من مانے انداز میں لکھنے اور نت نئے نام دینے لگے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ یہ کام لاعلمی میں سرزد ہو رہا ہے یا ثلاثی کی صنفی وحدت کو منتشر کرنا مقصود ہے۔ حال ہی میں محترمہ رعنا اقبال کی ایک کتاب 'تثلیث یا ثلاثی' کے نام سے شائع ہوئی (مطبوعہ ۲۰۰۵ء) اس میں وہ سارے مباحث اور مضامین تاریخ وار جمع کر دیے گئے ہیں جو اس سلسلے میں ۱۹۶۰ء سے اب تک مختلف رسائل میں چھپتے رہے۔ وہ اپنے مضمون میں 'ثلاثی' کے مختلف ناموں کے بارے میں لکھتی ہیں۔

'۱۔ کراچی کے ایک بزرگ شاعر حنیف اسعدی نے (حمایت صاحب کے تتبع میں) اپنے تین مصرعوں کو قافیے کا پابند کر دیا اور اُسے 'سہ مصرعی' کہنے لگے۔

۲۔ انڈیا کے شاعر قمر اقبال نے 'تتلیاں' کے نام سے ۱۹۸۱ء میں ایک مجموعہ شائع کیا اور اپنے تین مصرعوں کو (حمایت صاحب کا پہلا دیا ہوا نام) 'تثلیث' ہی سے موسوم کیا۔

۳۔ انڈیا کے مشہور فلم ڈائریکٹر اور نغمہ نگار گلزار اپنے تین مصرعوں کو 'تروینی' کہتے ہیں اور اُنہیں قافیہ ردیف کا پابند نہیں رکھتے۔

۴۔ انڈیا ہی کے ایک شاعر علیم صبا نویدی نے 'ترسیلے' کے نام سے تین تین مصروعوں کا ایک مجموعہ شائع کیا۔

۵۔ انڈیا ہی کے ایک شاعر صابر زاہد اپنے تین مصرعوں کو 'مثلثے' کہتے ہیں۔

۶۔ انڈیا میں کچھ شاعر 'ترائیلے' کے نام سے تین مصرعے لکھتے ہیں (اردو ادب کی مختصر تاریخ۔ ڈاکٹر انور سدید) 'ترائیلے' فرانسیسی زبان کی صنفِ سخن ہے جو آٹھ مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اس میں صرف ایک مصرعہ تین بار دہرایا جاتا ہے۔

۷۔ پاکستان کے ایک شاعر ساحل احمد بھی تین ہم قافیہ مصرعوں کو 'مثلث' کا نام دیتے ہیں۔ (اردو ادب کی مختصر تاریخ)

۸۔ایک مزاح نگار شاعر نے اسے 'تپائی' کا نام دے رکھا ہے۔

۹۔حیدر آباد، سندھ کے ایک شاعر ظافر تشنہ کا ۲۰۰۳ء میں ایک نعتیہ دیوان 'کجری' کے نام سے شائع ہوا ہے اس میں تین مصرعوں پر مشتمل مختلف نظمیں ہیں حالانکہ 'کجری' پوربی زبان کا ایک لوک گیت ہے جو شمالی ہند میں بہت مقبول ہے۔

۱۰۔لندن کے ایک شاعر انور شیخ نے اپنی ایک شعری صنف کا نام 'تکونی' رکھا تو لندن ہی کے ایک نقاد محمود ہاشمی نے 'ثلاثی' کو اس سے ملوث کر دیا حالانکہ یہ صنف تین مصرعوں کی بجائے تین بندوں پر مشتمل ہوتی ہے اور ہر بند میں چار چار شعر ہوتے ہیں۔مگر ہمارے محترم نقاد نے شائد اس کا صرف نام پڑھا ہے کلام نہیں دیکھا۔(نقاد جو ٹھہرے)'

حیرت ہے کہ اس کتاب میں بھوپال کے ایک شاعر کوثر صدیقی کے 'کارناموں' کا کہیں ذکر نہیں۔ہندوستان میں یہ مشہور کیا گیا ہے کہ کوثر صدیقی 'ثلاثی کے موجد' ہیں۔اُن کی شخصیت اور شاعری پر ایک ضخیم کتاب بھی اُن کے صاحبزادوں نے مرتب کی ہے جس میں برادرم اثر فاروقی کے سوا سبھی اہلِ قلم نے اُنہیں یہ اعزاز عطا کر دیا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ موصوف نے کہیں تردید بھی نہیں کی۔اُن کی خاموشی 'اعتراف' کے مترادف ہے۔

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اِسے کیا کہیے
غالبؔ

حمایت علی شاعر

'یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری'

ثلاثی

الہام

کوئی تازہ شعر، اے ربِّ جلیل
ذہن کے غارِ حرا میں کب سے ہے
فکر، محوِ انتظارِ جبرئیل

حسینؑ

طلوع صبح کا منظر نگاہ میں رکھنا
پھر اپنی آنکھ کو شبنم سے باوضو کر کے
جمال سبطِ پیمبرؐ نگاہ میں رکھنا

رسولِ پاکؐ کا ہر لفظ اک اشارہ ہے
خدا کو مجھ سے تو مجھ کو حسینؑ سے جانو
حسینؑ دینِ محمدؐ کا استعارہ ہے

حق کا عجب قرینۂ اظہار تھے حسین
مسجد کے واسطے سے جو سوچا تو یہ کھلا
گنبد نبیؐ کی ذات تو مینار تھے حسینؑ

یہی نہیں کہ جگر پارۂ بتول تھا وہ
عمل تھا، علم تھا، کردار تھا، اصول تھا وہ
علیؑ کے بعد نمائندۂ رسولؐ تھا وہ

نبیؐ کا دل تو نظر بوتراب کے مانند
وہ شخص جس کا تصور کروں تو روشن ہو
افق سے تا بہ افق، آفتاب کے مانند

قرآں کی حفاظت تو خدا نے کی ہے
اسلام کی بنیاد محمدؐ نے رکھی
تکمیل، امامِ شہدا نے کی ہے

گرمی ہے اور پیاس کی شدت ہے اور حسینؑ
دریا ہے موج موج تو دشمن ہے فوج فوج
حدِ نگاہ تک یہ قیامت ہے اور حسینؑ

احمد ندیم قاسمی

قاسمی صاحب میں یوں تو خوبیاں ہیں بے شمار
مختصر الفاظ میں سوچا تو یہ دل نے کہا
اچھے انساں، اچھے شاعر، اچھے افسانہ نگار

اک امتزاج بھی ہے جدید و قدیم کا
لیکن فقط یہی نہیں حسنِ کمالِ فن
اوروں سے مختلف بھی ہے لہجہ ندیم کا

افسانہ ہو کہ شعر و سخن، ایک رنگ ہے
ہر ظلم کے خلاف، ادب کے محاذ پر
احمد ندیم قاسمی مصروفِ جنگ ہے

سلیم احمد

وہ ایک شخص جو سایہ بھی تھا اجالا بھی
ہر اختلاف کا مرکز رہا مگر اکثر
رقابتوں میں محبت کا تھا حوالہ بھی

اسلوب

کس طرح تراش کر سجائیں
نادیدہ خیال کے بدن پر
لفظوں کی سلی ہوئی قبائیں

شاعری

ہر موجِ بحر میں کئی طوفاں ہیں مشتعل
پھر بھی رواں ہوں، ساحلِ بے نام کی طرف
لفظوں کی کشتیوں میں سجائے، متاعِ دل

اساس

کب ہوا کی کوئی تحریر نظر میں آئی
گر زمیں ہو، تو ہر اِک بیج میں امکانِ شجر
بے زمیں ہو، تو ہر اِک نقشِ نمو ہے کائی

علم

مرنا ہے تو دنیا میں تماشا کوئی کر جا
جینا ہے تو اِک گوشۂ تنہائی میں اے دل
معنی کی طرح لفظ کے سینے میں اُتر جا

حرفِ آخر

ہر لفظ میں پوشیدہ ہے خود اپنا جواز
ایماں میں نہ کیوں علم ہو شرطِ اول
'اقرأ' ہے نبوت کا بھی حرفِ آغاز

حسنِ تحریر

یہ عظمتِ قلم کی اِک ادنیٰ دلیل ہے
لب بستگی کو حرفِ سخن یوں عطا ہوا
پتھر ہی راستے کا سہی، 'سنگِ میل' ہے

یقین

دشوار تو ضرور ہے یہ سہل تو نہیں
ہم پر بھی کھل ہی جائیں گے اسرارِ شہرِ علم
ہم ابنِ جہل ہی سہی، 'بوجہل' تو نہیں

خودفریبی

الفاظ کے طواف میں اربابِ علم ہیں
لیکن یہ بات اہلِ مدارس سے کیا کہیں
یہ علم تو نہیں، فقط آدابِ علم ہیں

انکشاف

عالم تھے، باکمال تھے، اہلِ کتاب تھے
آنکھیں کھلیں تو اپنی حقیقت بھی کھل گئی
الفاظ کے لحاف میں ہم محوِ خواب تھے

زاویۂ نگاہ

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اِسے محبت تراش لے تو یہی صنم ہے
اِسے عقیدت نواز دے تو یہی خدا ہے

دسترس

کس نے کمند پھینکی ہے روح الامین پر
میں سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھا، قریب ہی
بادل کا سایہ رینگ رہا تھا زمین پر

مابعدالطبیعات

حرف ورنگ وصوت سب اظہار کے آداب ہیں
ماورائے ذہن ہر تمثیل، ہر کردار میں
آدمی کی آرزو ہے، آدمی کے خواب میں

ارتقاء

یہ اوج، بے فراز ہے آوارہ بادلو
کونپل نے سر اُٹھا کے بڑے فخر سے کہا
پاؤں زمیں میں گاڑ کے سوئے فلک چلو

انتباہ

مغرور ہوا سے کہو، یہ بات نہ بھولے
جم جائیں تو بن جاتے ہیں اِک کوہِ گراں بھی
ویرانوں میں اُڑتے ہوئے آوارہ بگولے

ارتفاع

اپنی زمیں کا حسن تھا اپنی نظر سے دور
دنیا کو ماہتاب سے دیکھا تو یہ کھلا
ہم ہوں اگر بلند تو یہ خاک بھی ہے نور

زندگی

دھوپ کے پیچھے سایہ بھاگے، دن کے پیچھے رات
آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں ثابت اور سیار
سب کی ایک تمنا لیکن، کوئی نہ آئے ہاتھ

جدلیات

مخلوق بھی حیات کا خلاّق بھی ہوں میں
میرے تضاد سے ہے عبارت مرا وجود
گر زہر ہوں تو زہر کا تریاق بھی ہوں میں

تناسخ

اگرچہ قبر میں شب کی، اُتر گیا خورشید
زمیں اُجالے سے پھر بھی نہ ہو سکی محروم
مہ و نجوم کی صورت اُبھر گیا خورشید

شرط

شب کو سورج کہاں نکلتا ہے
اِس جہاں میں تو اپنا سایہ بھی
روشنی ہو تو ساتھ چلتا ہے

تعلق

کچھ بھی نہیں ہے، فرق سفید و سیاہ میں
پھوٹی ہے جب بھی کوئی کرن، رات ہو کہ دن
سائے نکل پڑے ہیں، اُجالے کی چاہ میں

خوش فہمی

خوش ہے سورج کہ کٹ گئی ہے رات
کاش یہ بھی اُسے خبر ہوتی
سائے سائے میں بٹ گئی ہے رات

دوسرا رخ

سورج کا یہ اندازِ گواہی تو نہیں ہے
آئینہ دکھاتا ہے اُجالا مجھے پیہم
سایہ، مرے اندر کی سیاہی تو نہیں ہے

المیہ

مجھ کو محسوس ہو رہا ہے یوں
اپنی صورت میں ہوں نہ دنیا میں
زنگ آلود آئینے میں ہوں

بے کسی

کون دنیا میں رفیقِ غمِ جاں ہوتا ہے
دل میں جاگ اُٹھتا ہے جب بھی کوئی سویا ہوا درد
قطرۂ اشک بھی پلکوں پہ گراں ہوتا ہے

دانشور

ہم کہ روشن ظلمتوں میں شمع کی صورت ہوئے
خوش قدوں کے درمیاں پگھلے خود اپنی آگ میں
اور ہم ہی انجمن میں سب سے کم قامت ہوئے

ابن الوقت

سورج تھا سر بلند تو محوِ نیاز تھے
سورج ڈھلا تو دل کی سیاہی تھی دیدنی
کوتاہ قامتوں کے بھی سائے دراز تھے

کرسی

جنگل کا خونخوار درندہ، کل تھا مرا ہمسایہ
اپنی جان بچانے، میں جنگل سے شہر میں آیا
شہر میں بھی ہے میرے خون کا پیاسا اِک 'چوپایہ'

رویتِ ہلال

خود آگہی نہ جدتِ فکر و نظر ملی
وہ قوم آج بھی ہے پرستار چاند کی
جس قوم کو روایتِ 'شق القمر' ملی

ذوقِ تعمیر

ہم میں وہ شوقِ عبادت اب کہاں
ہر محلے میں بناتے ہیں، مگر
اے خدائے لامکاں، تیرا مکاں

نمائش

قرآں، خدا، رسول ہے، سب کی زبان پر
ہر لفظ آج یوں ہے معانی سے بے نیاز
جیسے لگی ہو نام کی تختی مکان پر

تضاد

اہلِ اسلام میں نہیں طبقات
اور فرما رہے تھے مولانا
اہلِ ثروت پہ فرض ہے خیرات

مساوات

زندگی بھر تو نہیں، ہاں مگر اِک وقتِ نماز
اپنے ایماں کی سرِ عام نمائش کے لیے
'ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز'

کشش ثقل

آزاد کب ہوا کوئی قیدِ مقام سے
جالندھری ہے کوئی تو کوئی ہے لکھنوی
ترکِ وطن کے بعد بھی نسبت ہے نام سے

سیکولرزم

اس دکھ بھرے جہان میں کوئی کہاں رہے
گرجا ہو، گردوارہ ہو، مندر ہو یا حرم
جس کو جہاں سکون ملے، وہ وہاں رہے

مردم گزیدہ

شمع روشن ہو تو پھر سایہ ڈراتا ہے مجھے
آئینہ دیکھتے ڈرتا ہوں میں غالبؔ کی طرح
اب تو ہر دوست بھی دشمن نظر آتا ہے مجھے

ہم سفر

شاید اک دوسرے سے جلتے ہیں
ایک منزل کے راہرو ہیں مگر
کب مہ و مہر ساتھ چلتے ہیں

دیوانگی

یار تو بھی عجیب انساں ہے
ایسی کشتی میں ڈھونڈھتا ہے پناہ
جس کے اندر خود ایک طوفاں ہے

تلاوت

ہر فتح میں نہاں کوئی گہری شکست ہے
معنی سے بے نیاز یہ لفظوں کا احترام
ہر بت شکن کے دل میں کوئی بت پرست ہے

تجرید

اک وہ کہ ہر خیال کو صورت میں ڈھال دیں
اک ہم کہ شکل رکھتے ہوئے شکل سے گریز
تصویر کا خیال ہی دل سے نکال دیں

الفاظ

اِک لفظ کُن کہ روزِ ازل سے کمالِ فن
اِک لفظ رب کہ خالقِ کون و مکان ہے
اِک لفظ خاک جس سے عبارت جمالِ فن

حقیقت

لفظ کے بت گر ہیں اور معنی کے قاتل لوگ ہیں
سوچتا ہوں میں تو اکثر بول اٹھتی ہے کتاب
صاحبانِ علم بھی دراصل جاہل لوگ ہیں

زندہ لاشیں

بند ہیں اپنی کتب میں، اِسم کی قبروں میں ہیں
بات کرتا ہوں تو ہوتا ہے یہ مجھ پر انکشاف
کیسے کیسے زندہ انساں، جسم کی قبروں میں ہیں

سزا

خود اپنا لہو چاٹ رہی ہے کب سے
اِک شخص کی ناعاقبت اندیشی کی
اِک قوم سزا کاٹ رہی ہے کب سے

بٹوارہ

یہ نکتہ ہے سیاست کا، یہ نفرت ہے بہت گہری
کہ اب بھائی بھی باہم ایک ہو کر رہ نہیں سکتے
میں پاکستان کا شہری، وہ ہندوستان کا شہری

امکان

بعید تو نہیں سب لوگ نیک ہو جائیں
جہاں کے سارے مسلمان ایک ہو جائیں
یہ سچ ہے کام یہ مشکل ہے لیک، ہو جائیں

مکافات

اولاد ہم سے دور چلی جا رہی ہے آج
ہم بھی تو والدین کو چھوڑ آئے تھے کہیں
تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے آج

نیا معجزہ

یہ معجزہ بھی وقت کا کتنا عظیم ہے
امریکہ ہو عرب کہ خدا کی یہ مملکت
اب دستِ سامری میں عصائے کلیم ہے

ضرورت

کروں انکار یا اقرار، لیکن یہ حقیقت ہے
وہ خالق ہی سہی میرا، میں بندہ ہی سہی اس کا
مجھے اُس کی ضرورت ہے، اُسے میری ضرورت ہے

الفاظ کے مارے

نہ پوچھو کس قدر ہم تم خدا کا ذکر کرتے ہیں
کبھی اللہ کہتے ہیں، کبھی کہتے ہیں 'بائی گاڈ'
مگر 'پرماتما' اور 'ایشوّر' کہنے سے ڈرتے ہیں

پس منظر

ریگزار اُر کا افسانہ، حقیقت ہی نہ ہو
اک ذرا تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھئے
آگ میں گلشن کھلانا، حسنِ محنت ہی نہ ہو

احترامِ آدمیت

بشر نے ڈالی ہے کیا عظمت بشر کی طرح
سکھا رہی ہے یہی سنتِ براہیمی
کہ آدمی نہ ہو قربان جانور کی طرح

خودفریبی

دل کی وحشت کسی عنوان تو کم ہو جائے
زندگی اپنے لیے اور بھی ہو جائے عذاب
ہم سے جنت کا تصور بھی اگر کھو جائے

ایک سوال

تخلیق ہوں شعور کی یا لاشعور کی
میری طرح جہاں میں کوئی دوسرا نہیں
یہ عجز کی ہے بات کہ فن پر عبور کی

عشق

پروانے کی مانند ہر اک حد سے گزر جا
اے دل تجھے گر حسنِ حقیقت کی طلب ہے
بے خوف و خطر شمع کے شعلے میں اُتر جا

لنڈا بازار

مردہ انسانوں کے زندہ پیرہن
زیبِ تن کر تو لیے ہم نے مگر
روح میں حل ہو گئی بوئے کفن

زہر خند

جانے کس بات پر ہنسی آئی
رنگ برسے، بکھر گئے اور پھر
اپنی اوقات پر ہنسی آئی

وابستگی

جب بھی دیکھا اسے تو یاد آئے
چاند کے گرد گھومتے تارے
دھوپ کے پیچھے بھاگتے سائے

پرتو

شاعری ہے شعور کا پرتو
چاند میں جیسے آفتاب کا عکس
برق میں جیسے آبشار کی ضو

شماتت

دن بھر اپنی آگ میں جل کر جب سورج بجھ جاتا ہے
دھرتی اندھیارے میں چھپ کر چپ چپ سوگ مناتی ہے
چاند ستاروں کے جھرمٹ میں کیا کیا موج اڑاتا ہے

خیرگی

ہر گام پہ جیسے کوئی دیوار کھڑی ہے
میں دیکھنا چاہوں بھی تو کس طرح سے دیکھوں
آنکھوں میں تو اِک نور کی زنجیر پڑی ہے

سرشاری

میں ہوں اپنے نشے میں کھویا ہوا
آنکھ کیسے کھلے کہ میٹھی نیند
زیرِ مژگاں ہے کوئی سویا ہوا

من توشدم

دیکھ کر اس کو اور کیا دیکھوں
اب تو یوں بس گیا ہے وہ مجھ میں
جب بھی دیکھوں تو آئینہ دیکھوں

شغل

اُس کے ہونٹوں کے پھول چن لینا
اور اُن کو بسا کے آنکھوں میں
کچھ ادھورے سے خواب بُن لینا

وصال

لرزتے ہوئے لب پہ لرزاں تھے کیا کیا ادھورے سخن
دھڑکتے ہوئے دل سے دونوں نے دیکھا سوئے آسماں
سرکنے لگا چاند کے جسم سے ابرئی پیرہن

سپردگی

خواب میں جیسے ناؤ کھیتا تھا
سانس کے زیر و بم کے ساتھ کبھی
زیرِ لب ایک نام لیتا تھا

بعد از خدا

زندگی یوں گزارتا ہوں میں
پہلے ہونٹوں پہ تھا خدا کا نام
آج تجھ کو پکارتا ہوں میں

دو قومیں

اِدھر میں بھی مسلماں ہوں، اُدھر تو بھی مسلماں ہے
مگر اب میں ہوں پاکی اور تو ہے بنگلہ دیشی
ہم اب 'دو قوم' ہیں گرچہ ہمارا 'ایک ایماں' ہے

مصرف

صبح سے رہنا ہے کتنا انتظار
اور جب اخبار آتا ہے تو سب
ڈھونڈھتے ہیں نوکری کا اشتہار

ہائیکو

(ایک خط مورخہ ۱۷/۱۱ اگست مطبوعہ 'ہائیکو انٹرنیشنل کراچی' ستمبر اکتوبر ۲۰۰۰ء)

اتفاق سے اردو کی اپنی کوئی صنف سخن نہیں۔سبھی اصناف باہر آئی ہیں۔مگر عجیب بات ہے کہ اس کشادہ دامنی کے باوجود ہماری شاعری اپنے گرد و پیش حتیٰ کہ اپنے پاس پڑوس سے بھی بیگانہ رہی۔علاقائی زبانوں کی وہ اصناف جو سہیلیوں کی طرح بچپن سے جوانی تک اردو کے ساتھ رہیں اس کی زندگی کی رفیق نہیں بن سکیں۔شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان سے ہمارا تعلق رسمی رہا، ہم انہیں پوری طرح جان نہ سکے۔اردو کو جو محبت فارسی سے رہی ہے، مذہبی زبان ہونے کے باوجود عربی سے بھی نہیں رہی۔'عربی الفاظ' بھی فارسی کی معرفت ہماری زبان کا حصہ بنے۔اس کا سبب بھی شاید یہ ہو کہ 'فارسی حکمران' زبان تھی چنانچہ جب فارسی کی جگہ انگریزی نے لی تو ہم اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور پھر کئی شعری اصناف مثلاً فری ورس (آزاد نظم) بلینک ورس (نظم معریٰ) سانٹ حتیٰ کہ پروز پرئم (نثری نظم) تک ہماری شاعری میں در آئی۔مغرب کی لگن میں ہم نے لمرک اور ترائیلے کو بھی اپنانے کی کوشش کی مگر موضوع اور ہیئت کی پابندی کی بناء پر ان سے رشتہ استوار نہ ہو سکا۔

اب ہم 'ہائیکو' کی طرف متوجہ ہیں۔یہ جاپانی صنف سخن ہے۔جاپان ہم پر 'حکمران' تو نہیں مگر صنعتی اور معاشی لحاظ سے دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں شمار ہوتا ہے اس لیے اس سے متاثر ہونا ہماری نفسیات کا تقاضا ہے۔ہائیکو سے بھی ہم انگریزی کے ذریعے متعارف ہوئے ہیں۔مگر جاپانی کونسلیٹ کی حوصلہ افزائی سے کچھ لسانی حجابات بھی اٹھے اور کچھ جان پہچان مزید بڑھی۔اب اسے

قدرت کی ستم ظریفی کہئے کہ ایک ایسی ہی صنف 'ماہیا' کے نام سے پنجابی میں بھی ہے یہ اور بات کہ برسوں کی شناسائی کے باوجود پنجاب کے اردو شعراء نے بھی اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ہائیکو کے آئینے میں جب ماہیا کا چہرہ جھلکا تو ہماری 'قومی غیرت' جوش میں آئی اور ہم اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ماہیا کو چونکہ 'سرکار کی سرپرستی' حاصل نہیں ہے اس لیے ابھی کم لکھی جا رہی ہے۔اس کے علاوہ اس کی مستند مثالیں بھی زیادہ نہیں ہیں۔برسوں پہلے چراغ حسن حسرت نے موسیقار برکت علی خاں کی فرمائش پر دو ایک ماہیے اردو میں لکھ دیے تھے بس اسی پر مشق ہو رہی ہے۔اب حیدر قریشی جیسے صاحب علم شعراء نے اس کی ہیئت پر روشنی ڈالی اور حسرت صاحب کے 'ماہیا' کو غلط ٹھہرایا اور جب یہ بتایا کہ صنف سخن سہ مصرعی نہیں بلکہ ڈیڑھ مصرعی (۱) ہے تو لوگ چونکے کہ یہ تو مختصر ترین پیمانہ شعر ہے۔غزل کے شعر سے بھی مختصر۔۔۔

'ہائیکو کے بارے میں بھی ہم برسوں لاعلم رہے جب کہ اسے اردو میں متعارف ہوئے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ماہنامہ 'ساقی' (دہلی) کا 'جاپانی ادب نمبر' جنوری ۱۹۳۶ میں شائع ہوا تھا اور بحوالہ مرزا حامد بیگ (اردو میں ہائیکو نگاری مطبوعہ 'فنون' مئی اکتوبر ۱۹۹۴ء) حمید نظامی (بانی روزنامہ 'نوائے وقت') جو بطور شاعر معروف نہیں مگر پہلی بار ان کے ترجمہ شدہ سات عدد ہائیکو 'ہمایوں' (لاہور) کے اکتوبر ۱۹۳۸ء کے شمارے میں شائع ہوئے اور پھر وقفے سے ان کے متعدد ترجمہ شدہ ہائیکو 'ہمایوں' میں ۱۹۴۰ء تک چھپتے رہے۔اسی دور میں میراجی کا بھی ایک ترجمہ شدہ ہائیکو ملتا ہے۔یادگار کے طور پر نوٹ کر لیا ہے ملاحظہ فرمائیں ۔

ہرکارہ سیاں لایا
جوہی کے پھولوں کی ڈالی
اور سندیسہ بھول گیا

(۱) 'ماہیا کی ہیئت کا مسئلہ' ارشد محمود ناشاد، مطبوعہ ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، اگست ۱۹۹۷ء

مگر یہ تمام تراجم 'ہائیکو' کی ہیئت کے مطابق نہیں تھے۔اس کے بعد بھی قاضی سلیم (تحریک جولائی ۱۹۶۶ء) تصدق حسین خالد (مکاں لامکاں، مطبوعہ ۱۹۷۶ء) عبدالعزیز خالد (غبارِ شبنم مطبوعہ ۱۹۷۸ء) تک کسی نے بھی 'ہائیکو' کی تکنیک کے مطابق نہیں لکھا۔گویا کوئی اس سے واقف ہی نہیں تھا۔آج سے پندرہ یا سترہ سال پہلے ۱۹۸۳ء جاپان کونسلیٹ نے کراچی میں ہائیکو مشاعروں کا آغاز کیا تو اس وقت تک (مجھ سمیت) کوئی شاعر اس کی ہیئت کو نہیں جانتا تھا۔ چنانچہ میں نے مشاعرے میں اپنی 'ثلاثیاں' پڑھ دیں۔ پروفیسر احمد علی نے 'ہائیکو' کے بارے میں جو مضمون پڑھا۔کراچی کے شعراء کسی حد تک اس صنف کے بارے میں واقف ہوئے۔پھر جاپان کونسلیٹ نے ہدایات دیں اور اصرار کیا کہ ۵۔۷۔۵ سلے بلز میں لکھ کر لایا کریں ورنہ زحمت نہ کریں۔اس کے باوجود ابھی تک اکثر شعراء تین مساوی یا تین من مانے چھوٹے بڑے مصرعے لکھ کر رسالوں میں چھپواتے ہیں اور اسے 'ہائیکو' کہنے پر اصرار بھی کرتے ہیں۔کچھ شعراء البتہ ایسے ہیں جنھوں نے 'ہائیکو' کی خاطر جاپانی زبان سیکھی جن میں محمد امین، رئیس علوی اور وضاحت نسیم شامل ہیں۔مگر آخرالذکر دونوں (شاعر اور شاعرہ) کو 'ہائیکو' کے نام پر بھی اعتراض ہے، وہ اسے 'ہائیک' کہتے ہیں۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میں بھی 'ہائیکو' اور 'ماہیا' کے بارے میں یہی کہوں گا کہ 'زبان یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم'۔

میں مختلف مضامین کی روشنی میں یہ سمجھ سکا ہوں کہ 'ہائیکو' ۵۔۷۔۵ سلے بلز (دوحرفی اصوات) میں تین معریٰ مصرعوں کے اشتراک کا نام ہے اور اس کا مخصوص موضوع مناظرِ فطرت کی عکاسی اور معنی آفرینی ہے۔اردو ادب کی بدنصیبی کہ 'ہائیکو' پر لکھنے والے 'نقاد' بھی جاپانی زبان نہیں جانتے۔ بیشتر لاعلم شعراء اپنی 'غلطی' کو 'جدت' سے تعبیر کرتے ہیں یا اسے 'اردو ہائیکو' کا نام دے کر خوش ہو لیتے ہیں۔نتیجہ یہ ہے کہ رسالوں سے کتابوں تک غلط تحریروں کا انبار لگ گیا ہے اور

جاپانی سفارت خانہ خوش ہے کہ اردو میں ہائیکو رواج پا چکی ہے۔حیرت اور افسوس کی بات یہ ہے کہ طالب علموں کے لیے لکھی ہوئی کتابوں میں بھی ان (ملکی اور غیر ملکی) اصنافِ سخن کی تعریف صحیح نہیں لکھی جاتی۔

دوسری زبانوں سے استفادہ اچھی بات ہے بشرطیکہ ہماری معلومات درست ہوں۔ ان کی زبانوں کی اصنافِ سخن ہمارے پاس 'امانت' ہوتی ہیں۔اس میں ترمیم و تنسیخ کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ایسی کوشش ہماری لاعلمی یا خیانت کے مترادف ہوگی۔ملکی اور غیر ملکی اصنافِ سخن میں فارسی کی اصناف کے علاوہ صرف فری ورس (آزاد نظم) اردو شاعری کا حصہ بن سکی، باقی تمام اصناف ابھی تک نامانوس ہیں یا ہماری لاعلمی کے نتیجے میں غلط لکھی جا رہی ہیں۔'ہائیکو' کے بارے میں دلاور فگار نے اپنے انداز میں ایک پتے کی بات کہہ دی تھی ۔

ہمیں شعور کہاں ہے کہ 'ہائیکو' لکھیں
خود اپنی 'کو' نہیں آتی، پرائی 'کو' لکھیں

—
حمایت علی شاعر

ہائیکو

(طبع زاد)

(۵۔۷۔۵)

یہ بھی سوچا ہے
سائے بڑھتے جاتے ہیں
جب دن ڈھلتا ہے

سوچوں اپنے آپ
میں تو گھر میں تنہا ہوں
لیکن پھر وہ چاپ؟

دل ہے جس کا نیک
شیشے جیسا ہوتا ہے
اندر باہر ایک

دل ہے جس کا صاف
اس کی تحریریں بھی ہیں
شیشے سی شفاف

دل کے لوبھی ہیں
اس کی پلکوں کے پیچھے
سپنے جو بھی ہیں

ہنستے رہتے ہیں
غنچے اپنے دل کی بات
مجھ سے کہتے ہیں

پھولوں کی خوشبو
ہر جانب ہے یوں جیسے
ہر جانب ہے تو

چھوڑیں خلد کی بات
دنیا بھی اک جنت ہے
جب تک تم ہو ساتھ

چاند ہے کیا چالاک
رات کو زیبِ تن کر لے
سورج کی پوشاک

کوئی ہاتھ نہ آئے
بھاگتے رہتے ہیں پھر بھی
دھوپ کے پیچھے سائے

پھر کیا ہے یہ دہر
شکر کو بھی کہتے ہیں
جب ہم میٹھا زہر

کیا ہے رازِ نہاں
آنکھوں میں پل کر بھی اشک
پلکوں پر ہیں گراں

راہ کرے کیا پار
واماندہ راہی کو تو
سایہ بھی دیوار

تیرے پاؤں کی چاپ
ایسے آتی ہے جیسے
پھول کھلیں چپ چاپ

یوں ہے مجھ میں تو
جیسے چندا میں سورج
یا گل میں خوشبو

کوئی نہ آئے ہاتھ
اک دوجے کے پیچھے ہیں
کب سے یہ دن رات

شاعر ہیں وہ لوگ
اوروں کو خوش کرتے ہیں
خود کو لگا کر روگ

کتنے ہیں مجبور
ایک ہی گھر میں رہتے ہیں
چاند اور سورج دور

سورج چاند زمیں
کوئی کہیں ہے کوئی کہیں
پھر بھی دور نہیں

خار و گل کا پیار
تب محسوس ہوا ہے جب
ہو گئے ہاتھ فگار

کیسا غیب و حضور
آنکھ لگی تو ہم تم پاس
آنکھ کھلی تو دور

جس سے مجھ کو پیار
تیرا ہی ہوگا کوئی روپ
تیرے روپ ہزار

کوئی ہو میرے ساتھ
میرے تصور میں تو رہے
تیرا پھول سا ہاتھ

سائے کی کیا بات
اپنی سمت بدلتا جائے
اجیارے کے ساتھ

یہ ہے دل کا راز
سناٹے میں سنتا ہوں
میں تیری آواز

پھولوں جیسے لوگ
دل میں چھپائے رکھتے ہیں
کیسے کیسے روگ

ہے یہ عجب دستور
دور ہے جب تک سورج سے
چاند رہے پرنور

چین بھلا کیا پاؤں
دیپ بجھے تو رات ڈرائے
دیپ جلے تو چھاؤں

جب تک ہم ہیں ساتھ
بیگانوں سے کیا لینا
اپنے غم ہیں ساتھ

دیواروں کے سائے
سورج کے ہیں پروردہ
دھوپ کے ہیں ماں جائے

سن اے میرے خدا
ہم میں ایک ہی رشتہ ہے
میں بھی ہوں تنہا

ساگر اور سورج
ماں کی گودی کے بالک
جیون کی سج دھج

ماں کا دل جھومے
سورج جھک کے ادب سے جب
ساگر کو چومے

اپنے دن اور رات
اتنے دلکش گزرے ہیں
بھولے ہم ہر بات

سات دھنک کے رنگ
سات افلاک تلے دنیا
سات سروں کے سنگ

سورج ڈوبا کب؟
چاند ستاروں میں ڈھل کر
روشن رکھے شب

دل یہ کہتا ہے
دھڑکن بن کر سینے میں
تو بھی رہتا ہے

سوئی ہوئی سی رات
جاگے ہوئے سے ہم دونوں
ٹھہرے ہوئے لمحات

گیتا اور قرآن
کافر، مومن کی پہچان
سوچے کیا انسان

روشنیوں کا شہر
شہر قائد ہے اب تو
قدرت کا اک قہر

کیوں دل دھڑکے ہے
دور کہیں اندھیارے میں
شعلہ بھڑکے ہے

پھول کتابوں کو
روزانہ پڑھتا ہے کون
سورج سے پوچھو

کیا بھولا من ہے
اس کی چاپ سے ہم آواز
دل کی دھڑکن ہے

(تراجم)

(۵۔۷۔۵)

یاما گوچی سی شی

گلشن کے اس پار
چھپ کر بیٹھی ہے اک رات
تارے ہیں دو چار

موسم ہے یخ ریز
کیوں ہے پھسلن سے پہلے
دل کی دھڑکن تیز

جب میں لڑکا تھا
میلے میں اک عورت نے
مجھ کو تاکا تھا

شام کی یہ ٹھنڈک
جھیل کنارے بیٹھا ہوں
راہ تکے ہے سڑک

میں نے کہا تھا نا
خزاں میں رہ نہیں پائے گا
دھنک سے یارانہ

باشو

جب بھی کرے وہ بات
فصلِ خزاں میں بھی ہو جائے
پھولوں کی برسات

کیسی ہے بے داد
کہساروں میں ڈوب گئی
ٹڈی کی فریاد

بارش جب ہو تیز
ہر قطرہ کرتا جائے
دریا کو مہمیز

موسم گل آیا
کاش میں تیرا ہر آنسو
خود ہی پی جاتا

کپڑوں کی خوشبو
موج ہوا لے کر نکلے
پھیلا دے ہر سو

جاگے کیوں نہ غریب
یخ سی ٹھنڈی راتوں میں
سوئے جس کا نصیب

آخر موت ہے کیا
جیسے خزاں کا نقش مٹائے
موسمِ گل کی ہوا

چیونی

دنیا میں ہر سو
لوگ جئیں اس طرح سدا
پھول میں جیوں خوشبو

دل میں عجب ہے جوش
موسمِ گل کی لائے خبر
تیری نئی پاپوش

یوں میں جگ میں رہا
جیسے اندھیرے میں جگنو
چمکا۔۔۔ڈوب گیا

جب کوئی غنچہ
صبح کھلے تو میں دیکھوں
خالق کا چہرہ

موکائی کیورائی

پھر میں نے دیکھا
پام کی شاخ پہ جو چمکا
وہ اِک جگنو تھا

رینکو

نیا بہتی جائے
پنچھی جھومیں ناچیں گائیں
دریا موج اڑائے

کیکا کو

موجوں میں کھو جائے
ہنستے پھولوں کی آواز
ساحل سے جب آئے

تمہاری بے مثال زندگی
نثار ہو کے دے گئی ہے اس جہان میں
کسی کو لازوال زندگی

کِین

سورج ڈوبتا جائے
خاموشی کے عالم میں
پھیلے شام کے سائے

جو کرتا تھا پیار
خود اتنا شرمیلا تھا
کیا کرتا اقرار

(آزاد تراجم)

کیکاکو

خزاں کا چاند بے کراں فلک
زمیں پہ جھیل کا طواف اور میں
تمام رات دور دور تک

باغباں سویا رہے
پھول مہکیں اور وہ اپنے خواب میں
دیر تک کھویا رہے

کہر میں لپٹا ہوا
صبح دم کھلتا ہوا مندر کا در
اور موجوں کی ہوا

فاختہ نوحہ کناں
ڈوبتے سورج کی گم سم روشنی
حاصلِ سالِ رواں

تمہاری دولتِ حیات
بکھر چکی ہے اب نہ آئے گی یہ ہاتھ
جو ہے سو ہے غریب رات

گوتم کا جنم دن ہے
دیکھو تو یہ بَن بالک، مندر کا ہے اب مالک
اور آج بھی کم سن ہے

سوکھے پتوں سے اٹی یہ رہگذر
اک پہاڑی مقبرے تک لے تو جاتی ہے مگر
ختم ہوتا ہے وہیں اس کا سفر

دور جنگل میں کہیں دیوانہ وار
چیختے ہیں بادوباراں اور شکستہ برگ و بار
اور سدا ہوتی ہے میرے دل کے پار

مقدس رقص جاری ہے
ہر اک چہرے کے پیچھے، آہ بھرتی جو بھی صورت ہے
وہی صورت ہماری ہے

جگمگاتی رات رقصاں پیرہن
نوجواں جسموں پہ ہر سو موجزن
آنے والے موسموں کا بانکپن

عجیب سی یہ رات ہے
گزر رہی ہے اور اس کے دوش پر
جنازۂ حیات ہے

تمھاری روح کے گہر
زمیں پہ ٹوٹ کر بکھر گئے مگر
یہ رات ہوگئی امر

پام کا ہر برگ ہے
قطرہ شبنم کا مامن۔۔۔ماں کے دامن کی طرح
زندگی کا سورگ ہے

باشو

کھینچتی ہے دل کے تار
اک پہاڑی راستے کی ہمسفر
اودھے پھولوں کی قطار

وہ مری بانہوں میں تھی
دل کا دھڑکا تھا کہ دستک۔۔۔اور پھر
ہم تھے دونوں اجنبی

کیا ملے گا ان کو مار کر
غریب سی یہ مکھیاں جو دست و پا سمیٹ کر
جی رہی ہیں زندگی سے ہار کر

ایک پرانے جوہڑ کی دمساز
اک مینڈک کی جست
اور اک لمحہ پانی کی آواز

جیسے سبزہ زمیں پر لہکے
جاگ اٹھے جذبۂ ندامت تو
دل بھی ایک پھول کی طرح مہکے

ایسا کوبا یاشی

کچھ نہیں ہے میرے پاس
ہاں فقط یہ گوشۂ خاموش، ٹھنڈا، پرسکوں
اور دل میں تیری آس

غریب ہوں امیر ہوں
سبھی یہ چاہتے ہیں اس کی بزم میں جگہ ملے
اسی کے سب اسیر ہوں

مبارک ہو۔۔۔کہا اس نے
مگر اس وقت، جب میری جوانی کا حسیں موسم
بس اب جانے ہی والا ہے

جس دن بدھا آئے
اتنے پھول کھلے دھرتی پر
دھرتی ماں کہلائے

اونٹی سورا

قدرت کا شہکار
ہرے بھرے کھیتوں کے اوپر
چڑیوں کی چہکار

تجھ کو معلوم نہیں

(منتخب فلمی نغمات)

اپنے عزیز دوست

مشہور میوزک ڈائریکٹر

خلیل احمد کے نام

جس کی خوبصورت موسیقی نے

میرے نغمات کو ابدی غنائیت عطا کر دی

(حمایت علی شاعر)

ترتیب

o میری فلمی شاعری	حمایت علی شاعؔر	۱۵

(انتخاب)

نغمات

اے حبیب کبریا، اے رحمت اللعالمینؐ	نور جہاں	۲۷
'اور بھی غم ہیں زمانے میں غمِ دل کے سوا'	ترنم، حمایت علی شاعؔر	۲۸
کسی چمن میں رہو تم بہار بن کے رہو	احمد رُشدی	۳۰
نہ چھڑا سکو گے دامن نہ نظر بچا سکو گے	نور جہاں	۳۱
جب رات ڈھلی تم یاد آئے	احمد رُشدی۔ مالا	۳۳
تجھ کو معلوم نہیں تجھ کو بھلا کیا معلوم	سلیم رضا	۳۴
خداوند! یہ کیسی آگ سی جلتی ہے سینے میں	مہدی حسن	۳۵
ہر قدم پر نت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ	نور جہاں	۳۶
اس کے غم کو غمِ ہستی تو مرے دل نہ بنا	مہدی حسن	۳۷
ہم بھی مسافر، تم بھی مسافر، کون کسی کا ہووے	مسعود رانا	۳۸
میں نے تو پریت نبھائی' سانوریا رے نکلا تو ہرجائی	مالا	۴۰
نوازش کرم، شکریہ، مہربانی	مہدی حسن	۴۱
سامنے رشکِ قمر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں	مسعود رانا	۴۲
دور ویرانے میں اِک شمع ہے روشن کب سے	مسعود رانا۔ مالا	۴۳
واللہ، سر سے پاؤں تلک موجِ نور ہو	احمد رُشدی	۴۵
اے جانِ وفا' دل میں تیری یاد رہے گی	مہدی حسن	۴۶
ہوا نے چپکے سے کہہ دیا کیا	مالا	۴۸

کلی مسکرائی جو گھونگھٹ اٹھا کے	نور جہاں۔مسعود رانا	۷۴۹
تو حسیں، تیرا جہاں حسیں	احمد رُشدی	۷۵۱
تم سا حسیں کوئی نہیں کائنات میں	مسعود رانا	۷۵۲
گُل کہوں، خوشبو کہوں، ساغر کہوں، صہبا کہوں	احمد رُشدی	۷۵۴
جب سے دیکھا ہے تمہیں دل کا عجب عالم ہے	سلیم رضا	۷۵۵
زندگی کی ہر مسرت آپ کے پہلو میں ہے	نور جہاں	۷۵۶
میں خوشی سے کیوں نہ گاؤں، مرا دل بھی گا رہا ہے	مجیب عالم	۷۵۷
لاج کرو نا مورے بالم، نجریا ہم سے ملاؤ	نسیمہ شاہین	۷۵۸
مانا کہ حضور آپ ہزاروں میں حسیں ہیں	احمد رُشدی	۷۵۹
ہم نے تو تمہیں دل دے ہی دیا، اب تم یہ بتاؤ کیا دوگے	سلیم رضا۔مالا	۷۶۱
کوئی میرے محبوب سا دنیا میں نہیں ہے	نور جہاں	۷۶۳
یہ خوشی عجب خوشی ہے، اسے جانے کیا زمانہ	احمد رُشدی	۷۶۵
میرے محبوب تجھے یاد کروں یا نہ کروں	نور جہاں	۷۶۶
میری نظر میں کیا ہو تم، کیا ہوں میں	رُشدی۔ناہید نیازی	۶۶۷
چاند سے چاندنی جدا ہو سکتی ہے	احمد رُشدی	۷۶۹
لیے چلا ہے دل کہاں	احمد رُشدی۔نجمہ نیازی	۷۷۰
ساتھی میرے، شام سویرے، محنت اپنا کام	مسعود رانا اور ہمنوا	۷۷۲
رائت الصبیحاً علیٰ قصراً	رُشدی، ناہید، نجمہ نیازی	۷۷۴

قوالی	بشیر احمد قوال	۷۷۵
شادی کے گیت	آئرین پروین، نسیمہ شاہین	۷۷۶
لوریاں	نور جہاں، ثریا، نگہت سیما	۷۷۹
شوخ ومزاحیہ نغمے	رشدی، مالا، آئرین پروین	۷۸۲
قومی اور ملّی نغمے	رشدی، مالا، نسیم بیگم	۷۹۴
	مہناز، مسعود رانا	۸۰۰

میری فلمی شاعری

(پس منظر اور پیش منظر)

میری فلمی شاعری کا آغاز ۱۹۵۱ء کے اوائل سے ہوتا ہے۔

اکتوبر ۱۹۵۰ء میں جب آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد (دکن) سے میری ملازمت ختم کر دی گئی اور میری بیگم معراج نسیم کو بھی ایک اسکول سے ہٹا دیا گیا تو میں نے احتجاجاً اخبار بیچنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ کچھ اہلِ ادب (قمر ساحری اور وہاب حیدر) اور کچھ عوامی انجمنوں نے ریڈیو کی انتظامیہ کے خلاف آواز اٹھائی اور حیدر آباد اور بمبئی کے اردو اور انگریزی اخبارات نے احتجاجی کالم بھی لکھے۔ یہ سلسلہ دو ماہ تک چلتا رہا اور ایک ہفتہ وار رسالے ''پرواز'' نے مختلف اہل قلم کے بیانات اور رسائل کے اداریوں اور کالموں کو جمع کر کے ۹ نومبر ۱۹۵۰ء کو ایک خصوصی شمارہ شائع کر دیا، حکومتی محکمے تو خاموش رہے لیکن مجھے بمبئی کے ایک رسالے ''نیا محاذ'' کی ادارت کی دعوت مل گئی اور میں اپنی بیگم اور ننھی سی بچی کو اورنگ آباد میں اپنے والدین کے پاس چھوڑ کر بمبئی چلا گیا۔

یہ رسالہ بائیں بازو کی جماعتوں کا ترجمان تھا، مہاراشٹر کے محکمہ اطلاعات نے پریس سے ضمانت کے طور پر ایک بڑی رقم کا مطالبہ کر دیا چنانچہ بادلِ ناخواستہ رسالے کی اشاعت کو ملتوی کرنا پڑا۔ انھیں دنوں مسلم ضیائی بھی بمبئی آئے ہوئے تھے اور اندھیری میں کرشن چندر کے بنگلے میں مقیم تھے۔ ترقی پسند ادیبوں میں صرف کرشن چندر ایسے ادیب تھے جو نسبتاً خوشحال سمجھے جاتے تھے۔ ان کے بنگلے کے اوپر کے حصے میں بمبئی آنیوالے اکثر احباب ٹھہر جاتے تھے۔ ان دنوں ساحر لدھیانوی بھی اپنی والدہ اور نانی کے ہمراہ وہاں قیام پذیر تھے اور ڈرائنگ روم میں سردار ملک (موسیقار انو ملک کے والد) اور مسلم ضیائی تھے، اب میں بھی آ چکا تھا۔

روز گار میرا اولین مسئلہ تھا، والد صاحب جو اورنگ آباد میں ایک پولیس افسر تھے ریاست پر ہندوستان کے قبضے کے بعد ریٹائر کر دیے گئے تھے۔ بہن بھائی چھوٹے تھے، ہماری زمینوں پر بھی کچھ سیاسی لوگوں کی شہ پر ناجائز قبضہ ہو چکا تھا۔ ہمارا گھرانا سخت معاشی مشکلات کا شکار تھا۔ بمبئی میں میرے جاننے والے کم تھے۔ اتفاق سے ''اپٹا'' (انڈین پیپلز تھیٹرز ایسوسی ایشن) میں ایک دن مجھے اوشا مل گئی۔ اوشا میری ریڈیو کی ساتھی تھی۔ اُن دنوں وہ اپنے شوہر کے ساتھ اپٹا میں کام کر رہی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب کوریا پر امریکہ نے حملہ کر دیا تھا جسے لوگ تیسری عالمی جنگ کا پیش خیمہ سمجھ رہے تھے۔ ساری دنیا میں امن تحریک چل رہی تھی۔ فرانسیسی مصور پکاسو نے عالمی امن تحریک کی علامت کے طور پر ایک فاختہ کی تصویر بنائی تھی جو امن کے پرچم پر ساری دنیا میں اُڑ رہی تھی۔ امن تحریک میں ترقی پسند ادیب بھی شامل تھے۔ روسی اور چینی ادیبوں کے ساتھ فرانس میں لوئی اراگاں، برطانیہ میں ٹی ایس ایلیٹ، شمالی امریکہ میں ہاورڈ فاسٹ، جنوبی امریکہ میں پابلو نرودا اور ترکی میں ناظم حکمت، سبھی یک زبان ہو کر اپنے اپنے انداز میں جنگ کے خلاف لکھ رہے تھے۔ پاک و ہند میں بھی یہی عالم تھا میں نے بھی امن کی حمایت میں کالموں (ہفتہ وار ''پرواز'' حیدرآباد دکن ۱۹۵۰) کے علاوہ ایک طویل نظم ''کوریا'' (مطبوعہ ''آدمیت'' حیدرآباد دکن) بھی لکھی تھی جو مشاعروں میں بھی مجھ سے بہ اصرار سنی جاتی تھی۔ خاص طور پر اس کا ایک مصرعہ ؎

تم اس جانب سے آؤ' ہم تلنگانے سے آتے ہیں

بہت مشہور تھا۔ اوشا نے اسی مصرعہ کو پڑھتے ہوئے ایک دن مجھ سے فرمائش کی۔ ''حمایت، ایک سیاسی بھجن بھی لکھ دو، پھر ہم سب مل کر تلنگانے سے کوریا چلیں گے''، میں ہنس پڑا اور وعدہ کر لیا امن تحریک کے سلسلے میں وہ ''اپٹا'' میں ایک بھجن اسٹیج کرنا چاہتی تھی۔ اُسے اسٹیج پر اس طرح پیش کیا گیا تھا کہ پس منظر میں ایک پردے پر بمباری سے تباہ شدہ شہروں کا ملبہ پینٹ کیا گیا تھا اُس کے سامنے ڈالروں کے ڈھیر پر امریکہ کے صدر ٹرومین کی مورتی کھڑی کی گئی۔ اُس کے کئی ہاتھ بنائے گئے اور ہر ہاتھ میں جنگی ہتھیار تھے، مورتی کے اطراف امریکہ کے پٹھو حکمران (چنگ کائی شیک، شاہ ایران، پاک و ہند کے کچھ لیڈر اور مشرق وسطیٰ کے بعض بادشاہ) بیٹھے یہ بھجن گاتے ہیں اپٹا کے شاعر و موسیقار پریم دھون نے اِس کی دُھن ایسی پیاری بنائی تھی کہ جس نے سنا یا اسٹیج پر یہ

منظر دیکھا اُسے یاد ہو گیا۔ یہ بھجن اُس وقت کے سیاسی پس منظر میں لکھا گیا تھا جس کا مکھڑا تھا ؎

ڈالر دیس کے راجہ، او سب راجوں کے رکھوالے
کٹھن گھڑی ہے ہم بھگتوں پر آ کر ہمیں بچالے
او سب راجوں کے رکھوالے

(یہ بھجن میرے پہلے مجموعۂ کلام 'آگ میں پھول' کے دوسرے ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۸۰ء) میں اپٹا کے حوالے سے شامل ہے اور میں نے اپنی منظوم خود نوشت سوانح حیات 'آئینہ در آئینہ' (مطبوعہ ۲۰۰۱ء) میں بھی اس واقعہ کا تفصیلی ذکر کیا ہے)

اس بھجن کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ ساحرؔ صاحب کے کہنے پر سردار ملک نے میوزک ڈائریکٹر حسن لال بھگت رام سے مجھے ملایا جو اُن دنوں ایک فلم ''اسٹیج'' کی میوزک دے رہے تھے (سردار ملک ان کے اسسٹنٹ تھے) مجھے ''اسٹیج'' کا ایک گانا لکھنے کا موقع ملا مگر اس شرط پر کہ اسکرین پر میرا نام نہیں ہوگا۔ سارے گانے سرشار سیلانی لکھ رہے تھے اس لیے صرف انہیں کا نام ہوگا اور گانے کا معاوضہ مجھے دو سو روپے ملے گا۔ فلم انڈسٹری میں مجھے کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔ ساحرؔ صاحب کی سفارش بھی اس لیے قبول کر لی گئی تھی کہ ان کی فلم ''بازی'' کے گانے ہٹ ہو چکے تھے (بازی ساحر صاحب کی پہلی فلم تھی) اور اے آر کاردار نے بھی ان سے اپنی نئی فلم ''نوجوان'' کا کانٹریکٹ کر لیا تھا۔

مجھے تو اس دور میں صرف ایسے کام کی ضرورت تھی جو میرے معاشی مسائل میں مددگار ثابت ہو۔ کبھی کبھی آل انڈیا ریڈیو بمبئی میں رفعت سروش بھی کسی پروگرام میں بُک کر لیتا مگر ''میر حمایت'' کے نام سے تا کہ ریڈیو کے صاحبانِ اقتدار کو شبہ نہ ہو کہ یہ وہی نوجوان ہے جس نے اخبار بیچ کر آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کو بدنام کر دیا تھا لیکن دو ایک مہینے ہی یہ سلسلہ چل سکا۔ ایک دن حیدرآباد ریڈیو کے ڈائریکٹر جی ایم شاہ نے مجھے اسٹوڈیو میں دیکھ لیا اور انھوں نے احساس دلایا کہ اس طرح رِفعت سروش کی ملازمت پر بھی اثر پڑ سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے آل انڈیا ریڈیو کا راستہ ہی چھوڑ دیا۔

بھجن کے اسٹیج ہوتے ہی بمبئی کی سی آئی ڈی اوشا اور پریم دھون کو تلاش کرنے لگی، وہ انڈر گراؤنڈ جا چکے تھے۔ اندیشہ تھا کہ میری بھی کوئی نشاندہی نہ کردے اس لیے مسلم ضیائی کے مشورے پر میں کچھ دنوں کے لیے اورنگ آباد چلا گیا۔ میری غیر موجودگی میں فلم کا گانا ریکارڈ ہوا۔

دل مچلنے لگا، جاگ اٹھیں دھڑکنیں
تیری آنکھوں میں کیا آج کی رات ہے

والد صاحب چونکہ پولیس میں رہ چکے تھے اس لیے انہیں فکر تھی کہ کہیں میں گرفتار نہ کرلیا جاؤں اس لیے اُن کے اور بعض دوسرے رشتہ داروں کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنے دوایک ہم عمر عزیزوں کے ساتھ میں کھوکھرا پار کے راستے جون ۱۹۵۱ء میں پاکستان آ گیا۔

ریڈیو پاکستان کراچی میں میرے کچھ پرانے ساتھی پہلے ہی کام کررہے تھے۔ بزرگوں میں احمد عبدالقیوم اور مرزا ظفر الحسن اور دوستوں میں وراثت مرزا، جہاں آرا سعید، عبدالماجد اور بدر رضواں وغیرہ۔ مجھے بھی کانٹریکٹ پر کام مل گیا اور میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ قائداعظم کے مزار (اس وقت تک مقبرہ نہیں بنا تھا) کے اطراف جیل تک جو جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں انہیں میں، خداداد کالونی کے قریب اسلام آباد (موجودہ کشمیر روڈ) پر پچاس روپے میں ایک جھونپڑی خرید کر رہنے لگا۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ ان جھونپڑیوں میں علم وادب کی بعض بڑی بڑی شخصیتیں بھی آباد تھیں۔

کراچی میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ معاشی حالات ایسے تھے کہ اپنی فیملی کو بلا بھی نہ سکتا تھا۔ کچھ مہینے اسی عالم میں گزر گئے۔ کھوکھرا پار کا راستہ بند ہونے کی وجہ سے اب صرف مشرقی پاکستان کے راستے ہندوستان جایا جاسکتا تھا جو بہت مہنگا سفر تھا۔ کراچی سے چٹاگانگ پانی کے جہاز سے اور پھر بذریعہ ٹرین کلکتہ، بمبئی اور اورنگ آباد۔۔۔۔ کئی دنوں کا سفر۔۔۔۔ ریڈیو سے مجھے صرف سوڈیڑھ سو روپے مہینہ ملتے تھے۔ اکثر کانٹریکٹ ختم ہوجانے پر صبح وشام کے مسائل سے بھی دوچار رہتا۔ میری اس دور کی شاعری میرے تمام احساسات اور جذبات کی گواہ ہے جو ''آگ میں پھول'' میں موجود ہے۔

ایک دن یکایک صہبا لکھنوی کی معرفت مجھے ساحر صاحب کا خط ملا جس میں یہ اطلاع

تھی کہ ''اسٹیج'' فلم ریلیز ہوگئی اور اس کا صرف وہی گانا ہٹ ہوا جو میں نے لکھا ہے تھا لیکن اس پر میرا نام نہ ہونے کی وجہ سے کسی کو یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ میرا لکھا ہوا ہے مگر مخصوص حضرات جانتے تھے۔۔۔۔۔ سردار ملک کو بھی کسی فلم کا چانس مل گیا تھا۔ ساحر صاحب نے اپنے خط میں خفگی کا بھی اظہار کیا تھا کہ میں انہیں بتائے بغیر پاکستان آ گیا۔ انہوں نے مجھے فوراً واپس آنے کے لیے لکھا (یہ خط جون ۱۹۵۲ء کا تھا) میں نے میاں افتخار الدین کے اخبار ''امروز'' جو اِن دنوں کراچی سے بھی نکلتا تھا، کے آفس جا کر ابراہیم جلیس کو ساحر صاحب کا خط دکھایا اور اُن سے مشورہ کیا۔ جلیس صاحب نے کہا ''ساحر صاحب پاکستان بننے کے بعد انڈیا ضرور گئے تھے مگر وہ دن اور تھے۔ تم نہیں جاسکتے۔ تم ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہو تمہارا نام نشر ہوتا رہتا ہے اور حیدرآباد دکن کے اخبار ''سیاست'' میں ریڈیو پاکستان سے تمہاری وابستگی کی خبر بھی چھپ چکی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم اپنی فیملی کو یہیں بلوا لو'' جلیس صاحب نے مزید بتایا کہ اب پرمٹ سسٹم رائج ہوگیا ہے یہ پرمٹ وزارتِ داخلہ کے آفس سے ملے گا۔ اتفاق سے وہاں میرا طالب علمی کے زمانے کا دوست محمد میاں مالاباری متعلقہ شعبے میں افسر تھا۔ اس نے حالات کی نزاکت سے مجھے آگاہ کیا اور میری بیگم اور بیٹی کے پرمٹ کے سلسلے میں کارروائی شروع کردی۔ میں نے ساحر صاحب کو معذرت کا خط لکھا اور پرمٹ حاصل ہونے کے بعد اورنگ آباد بھیج دیا۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں کچھ عزیزوں کے ساتھ میری بیگم بحری جہاز سے پاکستان آ گئیں (اِن واقعات کا ذکر ''آئینہ در آئینہ'' میں بھی ہے)

۱۹۵۵ء میں حیدرآباد سندھ میں ریڈیو اسٹیشن کھلا تو میں نے اپنا تبادلہ وہاں کرالیا اور باضابطہ زندگی شروع کردی، میں لطیف آباد کے ایک کوارٹر میں رہتا تھا۔ میرے تین بچے تھے اور چوتھے کی آمد آمد تھی، تنخواہ صرف دوسو روپے ماہانہ۔ مشاعروں سے تھوڑی بہت آمدنی ہوجاتی مگر برائے نام، اسی زمانے میں، میں نے اپنے شاعر دوست عبدالعزیز خالد (انکم ٹیکس افسر) کی اعانت سے دوماہی رسالہ ''شعور'' جاری کیا اور کسی طرح اپنا پہلا مجموعہ کلام ''آگ میں پھول'' بھی چھپوا دیا۔ کچھ ماہ بعد کراچی سے فلم ڈائریکٹر رفیق چمن کا فون آیا۔ وہ اس کتاب کی ایک نظم ''غمِ رائیگاں'' کے کچھ اشعار اپنی فلم ''بہن بھائی'' میں نغمے کی صورت میں استعمال کرنا

چاہتے تھے۔ میں کراچی گیا، بہت تپاک سے ملے' میں نے ان کی مرضی کے مطابق اشعار کو نغمے کی صورت دے دی۔ انہوں نے نہایت سلیقے اور محبت کے ساتھ مجھے ایک لفافہ بھی پیش کیا جس میں دوسو روپے رکھے ہوئے تھے۔ میں یوں خوش تھا کہ یہ میرے مہینے بھر کی تنخواہ تھی جو مجھے صرف ایک گانے کے عوض ملی تھی۔ ان کی گفتگو سے امید بندھی تھی کہ شاید دیگر گانے بھی وہ مجھی سے لکھوائیں مگر وہ فلم کاغذی تیاری سے آگے نہ بڑھ سکی۔

ریڈیو پاکستان کراچی میں ایک بہت پڑھے لکھے میوزک ڈائریکٹر تھے۔ مہدی ظہیر، لکھنو کے بہت اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے کراچی کے قیام کے زمانے میں مرزا ظفرالحسن کی نگرانی میں مجھ سے ایک غنائیہ بھی لکھوایا تھا ''کلفٹن کی ایک شام'' جس کے لیے ہم نے کلفٹن کی سیر بھی کی تھی۔ اس غنائیے میں سنجیدہ گیتوں کے علاوہ کچھ تفریحی نغمات بھی تھے۔ مثلاً بندر نچانے والے کا گیت اور ایک ٹھیلے پر چنے پکوڑی بیچنے والے کا نغمہ وغیرہ۔ مہدی ظہیر نے بڑی خوبصورت دھنیں بنائی تھیں۔ ایک سنجیدہ نغمہ خود بھی گایا تھا ؎

ایک دلِ ویراں کا سہارا
ساگر ترا کنارا

دوسرے سنجیدہ اور مزاحیہ گیت مختلف گلوکاروں اور احمد رشدی سے گوائے تھے۔ بندر نچانے والے کے گیت کا مکھڑا تھا ؎

ناچ چھنا چھن ناچ
کہ ناچے سارا جگ سنسار
چھنا چھن ناچ

اور دوسرے گانے کے بول تھے ؎

چنے پکوڑی دہی بڑے جو میرے کھا کر جائے
زمانہ گیت اُسی کے گائے

یہ غنائیہ لوگوں کو اتنا پسند آیا کہ دو تین بار نشر کیا گیا۔ حیدرآباد ریڈیو پر بھی میں نے کئی غنائیے لکھے تھے جن میں ایک ''تحریک پاکستان'' سے متعلق بھی تھا اس کے گیتوں کی دھنیں مہدی

ظہیر کے اسسٹنٹ خلیل احمد نے بنائی تھیں۔ یہ غنائیہ ''نویدِ انقلاب'' کے عنوان سے نشر ہوا تھا (جو منصور عاقل کے رسالہ ''الاقربا'' اسلام آباد کے اپریل تا جون ۲۰۰۲ء میں اور 'کلفٹن کی ایک شام' سالنامہ جنوری ۲۰۰۵ء میں بھی شائع ہو چکے ہیں) مہدی ظہیر نے لکھنؤ یونی ورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا تھا اور خلیل احمد نے گورکھپور یونی ورسٹی سے ادبیات میں، ہم تینوں ریڈیو پاکستان کراچی میں ملے اور پھر زندگی بھر ایک دوسرے کے ساتھ رہے (اب دونوں اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں) خلیل احمد کی آرزو تھی کہ اسے کسی فلم کی میوزک دینے کا چانس مل جائے۔ ایک دن حیدرآباد میں یکا یک اُس کا فون آیا ''میں تمہاری مشہور نظم ''اَن کہی'' کو ایک فلم میں استعمال کر رہا ہوں۔ اجازت ہے؟''

''لاحول ولاقوۃ، اجازت کی کیا ضرورت ہے، میرا سارا کلام تمہارا ہے'' اُسے فلم ''آنچل'' میں میوزک دینے کا چانس مل گیا تھا، کہانی ابراہیم جلیس نے لکھی تھی اور ڈائریکٹر الحامد تھے، دونوں حیدرآبادی۔ پروڈیوسر البتہ دہلی کے ایک بہت ہی شریف آدمی فرید احمد تھے۔ وہ غائبانہ ہم سب کے عاشق تھے۔ ''اَن کہی'' اکثر مشاعروں میں سن چکے تھے ؎

تجھ کو معلوم نہیں، تجھ کو بھلا کیا معلوم

خلیل احمد نے ''اَن کہی'' کے بعض اشعار کے ساتھ میری ایک اور نظم ''پرتو'' کے کچھ اشعار ملائے اور ایک نغمہ تیار کیا اور لاہور جا کر ایورنیو اسٹوڈیو میں سلیم رضا کی آواز میں ریکارڈ کروایا، دھن اتنی اچھی تھی کہ ہر طرف دھوم مچ گئی۔ فرید صاحب نے سارے گانے مجھی سے لکھوائے۔ اس دوران احمد رشدی بھی ہماری ٹیم میں شامل ہو گیا تھا وہ بھی حیدرآبادی تھا، ایک دن اس نے ایک دکنی لوک (عوامی) گیت سنایا ؎

کھٹی کڑی میں مکھی پڑی اگے میری اماں

فرید صاحب پھڑک اٹھے، جلیس اور الحامد نے بھی اصرار کیا کہ اس کو فلم میں شامل کر لیا جائے مگر مسئلہ یہ تھا اس کے اکثر بول دکنی تھے جو یہاں کسی کی سمجھ میں نہ آ سکتے تھے۔ ابراہیم جلیس نے مجھ سے کہا کہ تم اسے ''مشرف بہ اردو'' کر دو۔

'میں مزاحیہ نہ لکھ سکوں گا'۔ میں نے معذرت چاہی

'تم سب کچھ کر سکتے ہو یار، ریڈیو پر بندر نچوا سکتے ہو، چنے پکوڑی بکوا سکتے ہو۔ ایک دکنی گیت کو اردو کا ''جوکر'' نہیں بنا سکتے ؟'' فرید صاحب کی بھی یہی خواہش تھی، انہوں نے مجھ سے کہا ''آدمی کو ہر کام کی مہارت ہونی چاہیے ، دیکھو! میں فلم وادب کی الف ب نہیں جانتا اور آپ ایسے ادیبوں اور شاعروں کو لے کر فلم بنا رہا ہوں، ہم سب کا یہ پہلا تجربہ ہوگا اور انشااللہ کامیاب ہوگا'' ابراہیم جلیس، الحامد اور احمد رشدی نے بھی جب اصرار کیا تو میں آمادہ ہو گیا اور میں نے اردو محاوروں کی مدد سے ایک مزاحیہ ''دوگانا'' لکھ دیا۔ محاورے تھے ۔

کام کا نہ کاج کا ڈھائی سیر اناج کا
چھوٹا منہ اور بات بڑی یا باتیں بنانا بڑی بڑی
اور عقل بڑی یا بھینس بڑی۔۔ وغیرہ وغیرہ

یہ دوگانا احمد رشدی اور آئرن پروین نے گایا تھا اور لہری اور پنّا پر فلمایا گیا۔ گانا اتنا مقبول ہوا کہ آج تک لوگوں کو یاد ہے اور میری جان یوں مصیبت میں رہی کہ ''بعض لوگوں کے اشارے پر'' اکثر مشاعروں میں بھی اس کی فرمائش کر دی جاتی تھی، بڑی مشکل سے جان چھڑاتا تھا۔ ان دنوں کراچی میں ایک آرٹ فلم ''اور بھی غم ہیں'' بن رہی تھی۔ اس میں میرے بچپن کا دوست اسد جعفری (فلم جرنلسٹ) ہیرو تھا اور ایک باغی شاعر کا کردار ادا کر رہا تھا۔ فلم کے مصنف دانش دیروی اور ہدایت کار اے ایچ صدیقی کی فرمائش پر میں نے اس کا تھیم سانگ ایک نظم کی صورت میں لکھا اور میوزک ڈائریکٹر استاد نتھو خاں اور اسد جعفری کی فرمائش پر اپنے 'ترنم' میں اسے ریکارڈ کروا دیا جو اسد جعفری پر فلمایا گیا تھا ''اور بھی غم ہیں'' ۱۵ اگست ۱۹۶۰ء کو ریلیز ہوئی اور اس فلم کو پاکستان میں پہلا ''صدارتی ایوارڈ'' دیا گیا۔

آنچل میں ایک اور تجربہ بھی کیا گیا، احمد رشدی سے جو عموماً شوخ اور مزاحیہ گانوں کے لیے مشہور تھا، ایک سنجیدہ نغمہ گوایا گیا ۔

کسی چمن میں رہو تم 'بہار بن کے رہو

''آنچل'' کے سبھی گانے مقبول ہوئے تھے مگر یہ گانا سپر ہٹ تھا اور اُسی پر مجھے ۶۲ء کا ''نگار ایوارڈ''

عطا ہوا۔ پہلی ہی فلم پر بہترین نغمہ نگاری کا ایوارڈ! حاسدین کے سینے پر سانپ لوٹنے کے مترادف تھا چنانچہ ہفت روزہ ''کردار'' اور ''نگار'' میں میرے خلاف مسلسل مراسلے چھپنے لگے۔ ایک بحث چھڑ گئی جو تین ماہ تک جاری رہی۔ یہ تمام بحثیں ایک کتابچے ''کسی چمن میں رہو'' کے نام سے ۱۹۶۴ میں شائع ہو چکی ہے۔ ہمارے ادب میں ایسی مثالیں عام ہیں اور میرے ساتھ میرے ''رقیبانِ روسیاہ نے'' بڑے بڑے تماشے کیے ہیں اگر کوئی صاحب ایسی کتابیں پڑھنے کا شوق رکھتے ہوں تو حسبِ ذیل کتابیں پڑھ لیں۔

۱۔ چراغ بکف — مرتب: حمایت علی شاعر (۱۹۸۴ء)
۲۔ احوال واقعی — مرتب: پروفیسر مرزا سلیم بیگ (۱۹۹۴ء)
۳۔ بارشِ سنگ سے بارشِ گل تک — مرتب: پروفیسر رعنا اقبال (۲۰۰۲ء)
۴۔ تثلیث یا ثلاثی — مرتب: پروفیسر رعنا اقبال (۲۰۰۵ء)

میرے مقالات اور مباحث کے مجموعے ''شخص و عکس'' ۱۹۸۴ء میں بھی ''تزکیہ'' کے عنوان سے میرے جوابی مضامین پڑھے جاسکتے ہیں۔ محولہ بالا کتابوں میں تمام متنازعہ تحریریں تاریخ وار اشاعتی حوالوں کے ساتھ جمع کر دی گئی ہیں۔ یہ تحریریں ہمارے ماحول کی ذہنیت کا آئینہ دکھاتی ہیں۔ 1962ء میں، میں نے ریڈیو کی ملازمت چھوڑ دی۔ ۱۹۶۳ء میں سنتوش کمار اور صبیحہ کی فلم ''دامن'' ریلیز ہوگئی۔ اسکے نغمے بھی بہت مقبول ہوئے اور فلم بھی، مجھے اسکے نغمے ۔

نہ چھڑا سکو گے دامن نہ نظر بچا سکو گے

پر بھی ۱۹۶۳ء کا بہترین نغمہ نگار کا ''نگار ایوارڈ'' ملا اور ۱۹۶۴ء میں ''کنیز'' کے ایک دوگانے ۔

جب رات ڈھلی تم یاد آئے
ہم دور نکل آئے ،اس یاد کے سائے سائے

پر ''مصور ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ ان اعزازات کا ردِ عمل تو ہونا ہی تھا۔ ''ہماری برادری'' نے خوب خوب اپنے ''ظرف'' کا مظاہرہ کیا اور میری شہرت کو داغدار کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اللہ کے فضل و کرم سے میرا اور خلیل احمد کا نام فلمی دنیا میں اتنا معتبر ہو چکا تھا کہ ہمارے نام پر ہی فلم کا سودا ہو جاتا

کرتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۶۴ء میں، میں نے بحیثیت فلم ساز اپنی ذاتی فلم ''لوری'' کا اعلان کر دیا۔ اس کے ڈائریکٹر سید سلیمان تھے، کہانی ذاکر حسین کی تھی اور مکالمے احمد ندیم قاسمی نے لکھے تھے۔ فلم کے سبھی گانے ہٹ ہوئے اور فلم بھی سپر ہٹ ہوئی۔ میرا نام بحیثیت فلم ساز بھی اہم ہوگیا۔ اب نہ سرمائے کی کمی تھی نہ مقبولیت کی، میں گانے بھی لکھتا تھا، مکالمے اور اسکرین پلے بھی۔ معاوضہ ہزاروں میں ملنے لگا اور ''لوری'' کی کامیابی نے تو قسمت ہی بدل دی تھی۔ لیکن ملک کے ''سیاست داں'' بھی اپنا ہنر دکھا رہے تھے۔ ۶۵ میں ہندوستان سے جنگ ہوئی جو سترہ دن چلی۔ حاصل کچھ نہ ہوا۔ کشمیر اپنی جگہ رہا اور ہم 'اپنی دانست میں' فتح مند و کامراں۔ سڑکیں اور شاہراہیں شہیدوں کے نام سے منسوب ہوگئیں۔ فیلڈ مارشل ایوب خان کے بعد جنرل یحییٰ خان آگئے۔ ۷۱ء میں مشرقی پاکستان پر ہماری فوج نے چڑھائی کردی، ہندوستان نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ۱۹۷۲ء میں ''بنگلہ دیش'' بن گیا۔

ملک ٹوٹ جانے کے بعد مارکیٹ بھی آدھی رہ گئی تھی، فلمسازی مشکل ہوگئی۔ ٹی وی پر انڈیا کی فلموں نے یلغار کر دی۔ اس کے مقابلے کے لیے کلر فلمیں بننے لگیں جو نا کام ہوتیں تو فلم ساز کے ساتھ ڈسٹری بیوٹر کو بھی لے بیٹھتیں۔ میں نے ''چھوٹی مارکیٹ'' کے خیال سے بلیک اینڈ وائٹ فلم بنانے کا فیصلہ کیا اور بحیثیت فلم ساز اور ہدایت کار پہلے ''منزل ہے کہاں تیری'' کے نام سے ایک فلم لاہور میں شروع کی مگر چند دوستوں کے 'کرم' کی بنا پر وہ ادھوری رہ گئی، میں کراچی آ گیا پھر ''گڑیا'' کی ابتدا کی۔ اس کی تکمیل تک فلم بینوں کو کلر فلموں کا چسکہ لگ چکا تھا اور ٹی وی بھی رنگین ہوگیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میری فلم کا سودا ہونے کے باوجود سینما ہال ملنے مشکل ہوگئے کوئی ڈسٹری بیوٹر سینما کرائے پر لے کر فلم چلانے پر آمادہ نہ تھا۔ اس میں یک طرفہ نقصان کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ یہ خطرہ مول نہ لیا جاسکا اور فلم ریلیز نہ ہوسکی۔ میں بھی اس ماحول سے دل برداشتہ ہو چکا تھا، فلم سازی کے سبب نغمہ نگاری بھی کم ہوگئی تھی اور سب سے بڑا پہلو جو نہایت سنجیدگی سے ہمارے زیر غور تھا یہ کہ بچے بڑے ہو چکے تھے۔ وہ کالج اور یونی ورسٹی میں پڑھ رہے تھے۔ ایک دن بیوی نے کہا۔ ''آپ نے تو فلمی دنیا میں رہتے ہوئے اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کر لی، کیا ہمارے بچے یہ کام کر سکیں گے۔؟''

۱۹۶۴ء میں جب میں ''لوری'' بنا رہا تھا تو میں نے سندھ یونی ورسٹی سے نہ صرف ایم اے کیا بلکہ پی ایچ ڈی کے لیے بھی خود کو رجسٹر کروا لیا تھا۔ یہ اور بات کہ فلمی مصروفیات ہی نے مجھے پابند نہ رہنے دیا اور میں ''ڈاکٹریٹ'' مکمل نہ کرسکا۔ دس سال گزر گئے۔

۷۴ء میں، میں نے فلم انڈسٹری چھوڑ دی اور کٹی پتنگ ہوکر رہ گیا، بس ایک ہی آرزو تھی کہ بچے اعلیٰ تعلیم پا لیں۔ ہمارا فلمی ماحول ایسا نہیں کہ اگر کوئی بیٹا یا بیٹی اس میں دلچسپی لینے لگے تو معاشرے کے لیے قابل قبول ہو سکے۔ اکثر فلم اسٹاروں نے اپنے بچوں کو فلمی دنیا سے دور رکھا ہے۔ دوسری بات یہ کہ فلمی دنیا میں تعلیم کا فقدان ہے۔ چند ایک پڑھے لکھے لوگ تھے بھی تو وہ اپنی ذات میں سمٹ کر رہ گئے تھے۔ یہاں انڈیا جیسا ماحول نہیں ہے۔ میری بیگم نے ان سب مسائل پر نظر رکھتے ہوئے بہت دور تک سوچا اور مجھے آگے جانے سے روک دیا میں نے بھی اسٹوڈیو کی بجائے یونی ورسٹی کی راہ لی اور سندھ یونی ورسٹی میں پڑھانے لگا۔

آج خدا کا فضل ہے میرے آٹھوں بچے (چار بیٹے اور چار بیٹیاں) سبھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ میری بیگم نے سب کو منزل پر پہنچا دیا، سب اپنے اپنے گھر کے ہوگئے اور میری رفیق حیات معراج نسیم ۔۔۔ ۲۱ نومبر ۲۰۰۲ء کو جگر کے کینسر کے سبب ٹورنٹو (کینیڈا) میں انتقال کر گئیں۔ میرے بچوں نے اپنی بساط سے زیادہ کوشش کی، علاج کے لیے امریکہ اور کینیڈا لے گئے مگر وہی ہوا جو خدا کو منظور تھا۔ ٹورانٹو کے پکرنگ کے قبرستان میں اُن کی تدفین عمل میں آئی۔

آسماں اُس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اِس گھر کی نگہبانی کرے

میں نے مجموعی طور پر دس، پندرہ سال فلم انڈسٹری میں گزارے، بے شمار فلمی نغمات لکھے مگر انہیں محفوظ نہیں رکھ سکا، ریڈیو کی ملازمت کے دوران بھی بے شمار گیت اور قومی نغمے لکھے۔ کئی غنائیے اور منظوم ڈرامے تحریر کیے۔ نثر میں بھی اسٹیج اور ریڈیو کے کئی ڈرامے لکھے جن میں (فلم میں جانے سے پہلے) محمد علی اور مصطفیٰ قریشی کے علاوہ کئی شاعروں اور ادیبوں نے بحیثیت اداکار بھی کام کیا۔ یہ تخلیقات رسائل میں بھی بہت کم شائع ہوئیں۔ مجھے اتنا وقت ہی نہیں ملا کہ میں ان پر نظر

ثانی کرتا۔ مجھے ہمیشہ یہ خیال رہا کہ کسی وقت اطمینان سے بیٹھ کر اپنی تخلیقات پر تنقیدی نظر ڈالوں گا اور ضروری ترمیم و تنسیخ کے بعد اشاعت کے لیے دوں گا، دیکھتے دیکھتے نصف صدی گزر گئی۔ اب ہر چیز توجہ سے دیکھی ہے تو اندازہ ہوا ہے کہ میری پچاس فیصد سے زیادہ تحریریں غیر مطبوعہ ہیں۔ اس دوران پروفیسر رعنا اقبال نے کراچی یونیورسٹی سے مجھ پر پی ایچ ڈی کا پروگرام بنالیا اور جو چیزیں منتشر تھیں انہیں یکجا کرنے لگیں۔ اِن فلمی نغمات کی یکجائی میں بھی اُن کی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔ میرے کئی دوستوں نے اُن کا ہاتھ بٹایا۔ اس کتاب کے مرتب انور جبیں قریشی نے میرے داماد شفیق الزماں کی نگرانی میں ۱۰۰ نغمات کا انتخاب کیا اور ۲۰۰۳ء میں ’تجھ کو معلوم نہیں‘ کے نام سے شائع کر دیا۔

’کلیاتِ شاعر‘ میں صرف وہ نغمے منتخب کیے گئے ہیں جو بہت مشہور ہوئے اِن میں بعض قومی نغمات بھی ہیں جو مختلف فلموں کے لیے لکھے گئے تھے۔ میرے دیگر گیتوں اور قومی نغمات کے مجموعے ’سرگم‘ اور ’اپنے پرچم تلے‘ زیر طبع ہیں۔ میں نے اپنی گیتوں بھری کہانیاں بھی مرتب کر رکھی ہے، انشاءاللہ وہ بھی جلد شائع ہو جائی گی۔

یہ کتاب میری نغمہ نگاری کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس لیے میں نے اپنی کلیات میں اسی پر اکتفا کیا ہے۔ شاید آپ کو بھی مجھ سے اتفاق ہو۔

حمایت علی شاعر

نعتؐ

اے حبیبِ کبریا، اے رحمت للعالمینؐ
آپ کے در کے سوا میرا یہاں کوئی نہیں
اے حبیبِ کبریا، اے رحمت للعالمینؐ

میری کشتی کی خدارا، ناخدائی کیجیے
راستہ بھولے ہوؤں کی رہنمائی کیجیے
آپ کے ہوتے مری دنیا نہ مٹ جائے کہیں
اے حبیبِ کبریا، اے رحمت للعالمینؐ

آپ کو حضرت حسینؓ، ابن علیؓ کا واسطہ
ہر شہیدِ کربلا کی بے کسی کا واسطہ
میری مشکل کیجیے آساں شہہِ دنیا و دیں
اے حبیب کبریا، اے رحمت للعالمینؐ

آپ کا سایہ ملے تو روشنی مل جائے گی
آپ چاہیں تو مجھے پھر زندگی مل جائے گی
آپ چاہیں تو مری مشکل کوئی مشکل نہیں
اے حبیب کبریا، اے رحمت للعالمینؐ

(آواز۔ نور جہاں o موسیقی۔ خلیل احمد o فلم۔ دامن)

نظم

محفلیں اور بھی ہیں حسن کی محفل کے سوا
منزلیں اور بھی ہیں عشق کی منزل کے سوا
اور بھی غم ہیں زمانے میں غمِ دل کے سوا
آنکھ رکھتے ہو تو آؤ یہ تماشہ دیکھو
آدمیت کا سسکتا ہوا لاشہ دیکھو

نیلے آکاش تلے خاک میں پلتے ہوئے لوگ
اونچے محلوں کی گھنی چھاؤں میں جلتے ہوئے لوگ
بھوک کی آگ میں چپ چاپ پگھلتے ہوئے لوگ
بھوک کی گود میں افلاس کے گہوارے میں
روشنی ڈھونڈتے ہیں جہل کے اندھیارے میں

سوچتے چہروں پہ جمتی ہوئی حالات کی دھول
جسم سوکھے ہوئے جیسے کوئی ویران ببول
میلے دامن میں سمیٹے ہوئے مسلے ہوئے پھول
موت کے ہاتھ سے جینے کا صلہ پاتے ہیں
اپنی ناکردہ گناہوں کی سزا پاتے ہیں

یہ وہ راہی ہیں کہ جن کی نہیں منزل کوئی
یہ وہ موجیں ہیں کہ جن کا نہیں ساحل کوئی
یہ وہ لاشیں ہیں کہ جن کا نہیں قاتل کوئی
کتنے نادان ہیں مرمر کے جئے جاتے ہیں
زہر کو شہد سمجھتے ہیں پئے جاتے ہیں

علم کے نور سے جو دل ہیں ازل سے محروم
جہل کی گود میں پروان چڑھے جو معصوم
زندگی کیا ہے خدا کیا ہے انہیں کیا معلوم
ان کے سینوں کی بجھی آگ جو روشن ہو جائے
یہ جہاں ایک مہکتا ہوا گلشن ہو جائے

(ترنم۔حمایت علی شاعرo فلم۔اور بھی ہیں غم)

نغمہ

(۱۹۶۲ء کا نگار ایوارڈ یافتہ بہترین نغمہ)

کسی چمن میں رہو تم، بہار بن کے رہو
خدا کرے کسی دل کا قرار بن کے رہو
ہم اپنے پیار کو دل سے لگا کے جی لیں گے
یہ زہر تم نے دیا ہے تو ہنس کے پی لیں گے
زمانہ دے نہ تمہیں بے وفائی کا الزام
زمانے بھر میں وفا کا وقار بن کے رہو
خدا کرے کسی دل کا قرار بن کے رہو
کسی چمن میں رہو تم، بہار بن کے رہو

کسی کے ساتھ رہو تم، تمہارے ساتھ ہیں ہم
تمہارا غم ہے سلامت تو پھر ہمیں کیا غم
تمہاری راہ چمکتی رہے ستاروں سے
دیارِ حسن میں، حسنِ دیار بن کے رہو
خدا کرے کسی دل کا قرار بن کے رہو
کسی چمن میں رہو تم، بہار بن کے رہو

(آواز۔احمد رشدی o موسیقی۔خلیل احمد o فلم۔آنچل)

نغمہ

(۱۹۶۳ء کا نگار ایوارڈ یافتہ بہترین نغمہ)

نہ چھڑا سکو گے دامن نہ نظر بچا سکو گے
جو میں دل کی بات کہہ دوں تو کہیں نہ جا سکو گے
نہ چھڑا سکو گے دامن . . . .

وہ حسین سا تصور جسے تم نے زندگی دی
اسے بھول کر بھی شاید نہ کبھی بھلا سکوگے
نہ چھڑا سکو گے دامن . . . .

یہ نظر جھکی جھکی سی، یہ قدم رکے رکے سے
میرا دل یہ کہہ رہا ہے، کہیں تم نہ جا سکو گے
نہ چھڑا سکو گے دامن . . . .

میرے ہم نشین تمہیں ہو، میرے ہم سفر تمہیں ہو
میری کون سی ہے منزل، یہ تمہیں بتا سکو گے
نہ چھڑا سکو گے دامن . . . .

(۲)

جو چراغ جل رہا ہے میرے دل کے انجمن میں
نہ کوئی بجھا سکا ہے نہ ہی تم بجھا سکو گے
نہ چھڑا سکو گے دامن . . . .

[(آواز۔نورجہاں ○ موسیقی۔خلیل احمد ○ فلم -دامن)

دوگانا

لڑکا جب رات ڈھلی تم یاد آئے
ہم دور نکل آئے، اس یاد کے سائے سائے
جب رات ڈھلی......................

لڑکی جو بات چلی تم یاد آئے
اور پاس چلے آئے، اس یاد کے سائے سائے
جب رات ڈھلی ....

لڑکا اپنوں نے دیا جو غم، اس غم کی شکایت کیا
کیا جانے یہاں کوئی، اس غم میں ہے راحت کیا
لڑکی ڈر ہے کہ یہ غم دل کا، ناسور نہ بن جائے
لڑکا جب رات ڈھلی...................... .

لڑکی تم چاہو تو یہ آنسو، بن جائیں شرارے بھی
تم چاہو تو مل جائیں، طوفاں میں کنارے بھی
لڑکا ڈر ہے یہ کنارا بھی ، طوفاں ہی نہ بن جائے
لڑکی جب رات ڈھلی..................................

(آواز۔مالا، احمد رشدی ○ موسیقی۔خلیل احمد ○ فلم۔کنیز)

نظم

تجھ کو معلوم نہیں، تجھ کو بھلا کیا معلوم
تیری زلفیں، تری آنکھیں، ترے عارض، ترے ہونٹ
کیسی انجانی سی معصوم خطا کرتے ہیں
تجھ کو معلوم نہیں تجھ کو بھلا کیا معلوم

تیرے قامت کا لچکتا ہوا مغرور تناؤ
جیسے پھولوں سے لدی شاخ ہوا میں لہرائے
وہ چھلکتے ہوئے ساغر سی جوانی وہ بدن
جیسے شعلہ سا نگاہوں میں لپک کر رہ جائے
تجھ کو معلوم نہیں تجھ کو بھلا کیا معلوم

اتنا مانوس ہے تیرا ہر اِک انداز کہ دل
تیری ہر بات کا افسانہ بنا لیتا ہے
تیرے ترشے ہوئے پیکر سے چرا کر کچھ رنگ
اپنے خوابوں کا صنم خانہ سجا لیتا ہے
تجھ کو معلوم نہیں تجھ کو بھلا کیا معلوم

جانے اِس حسنِ تصور کی حقیقت کیا ہے
جانے ان خوابوں کی قسمت میں سحر ہے کہ نہیں
جانے تو کون ہے میں نے تجھے سمجھا کیا ہے
جانے تجھ کو بھی مرے دل کی خبر ہے کہ نہیں
تجھ کو معلوم نہیں تجھ کو بھلا کیا معلوم

(آواز۔سلیم رضا o موسیقی۔خلیل احمد o فلم۔آنچل)

غزل

خداوندا یہ کیسی آگ سی جلتی ہے سینے میں
تمنا جو نہ پوری ہو وہ کیوں پلتی ہے سینے میں

نہ جانے یہ شبِ غم صبح تک کیا رنگ لائے گی
نفس کے ساتھ اک تلوار سی چلتی ہے سینے میں

کسے معلوم تھا یارب کہ ہوگی دشمنِ جاں میں
وہ حسرت خونِ دل پی پی کے جو پلتی ہے سینے میں

خداوندا یہ کیسی آگ سی جلتی ہے سینے میں
تمنا جو نہ پوری ہو وہ کیوں پلتی ہے سینے میں

(آواز۔مہدی حسن o موسیقی۔خلیل احمد o فلم۔لوری)

غزل

ہر قدم پر نت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ
دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں لوگ

کس لیے کیجئے کسی گم گشتہ جنت کی تلاش
جب کہ مٹی کے کھلونوں سے بہل جاتے ہیں لوگ

شمع کی مانند اہلِ انجمن سے بے نیاز
اکثر اپنی آگ میں چپ چاپ جل جاتے ہیں لوگ

شاعر اُن کی دوستی کا اب بھی دم بھرتے ہیں آپ
ٹھوکریں کھا کر تو سنتے ہیں سنبھل جاتے ہیں لوگ

(آواز۔نورجہاں o موسیقی۔خلیل احمد o فلم۔میرے محبوب)

غزل

اُس کے غم کو غمِ ہستی تو میرے دل نہ بنا
زیست مشکل ہے اُسے اور بھی مشکل نہ بنا

تو بھی محدود نہ ہو مجھ کو بھی محدود نہ کر
اپنے نقشِ کفِ پا کو میری منزل نہ بنا

دل کے ہر کھیل میں ہوتا ہے بہت جاں کا زیاں
عشق کو عشق سمجھ مشغلۂ دل نہ بنا

پھر میری آس بندھا کر مجھے مایوس نہ کر
حاصلِ غم کو خدارا غمِ حاصل نہ بنا

(آواز۔مہدی حسن o موسیقی۔سہیل رعنا o فلم۔گڑیا)

گیت

یہ دنیا میت رے .....راہ گزر ہے .... اور
ہم بھی مسافر، تم بھی مسافر، کون کسی کا ہو وے
کاہے چپ چپ رووے
کوئی ساتھ دے کہ نہ ساتھ دے
یہ سفر اکیلے ہی کاٹ لے
ہم بھی مسافر، تم بھی مسافر، کون کسی کا ہووے

جس نے بھی یاں پیار کیا ہے اس نے سب کچھ کھویا
پہلے کیا کیا سپنے دیکھے آخر میں کیا رویا
پیار کا حاصل آنسو ہیں تو چھوڑ یہ پیار کی بات
کوئی ساتھ دے کہ نہ ساتھ دے یہ سفر اکیلے ہی کاٹ لے
ہم بھی مسافر، تم بھی مسافر ....

اس دنیا میں سب ہیں اکیلے، تن سے جدا ہیں سائے
کوئی کسی کو پا کر کھوئے، کوئی کھو کر پائے
پلک جھپکتے چھوٹ جاتا ہے برس برس کا ساتھ
کوئی ساتھ دے کہ نہ ساتھ دے یہ سفر اکیلے ہی کاٹ لے
ہم بھی مسافر، تم بھی مسافر، کون کسی کا ہووے

(آواز۔مسعود رانا o موسیقی۔دیبو بھٹاچاریہ o فلم۔بدنام)

گیت

محبت تیری بِک جائے گی دولت مند کے ہاتھوں
سپاہی لوٹ کر آجا . . . .
میں نے تو پریت نبھائی ۔۔۔سانوریا رے، نکلا تو ہرجائی

آگ لگائی ایسی غم نے ۔۔۔مشکل ہو گئے آنسو تھمنے
تیری قسم تری یاد میں ہم نے ۔۔۔راتوں کی نیند گنوائی
سانوریا رے، نکلا تو ہرجائی . . . .

تیرے وعدے تیری قسمیں ۔۔۔بیری ہو گئیں جگ کی رسمیں
پیار چلا ہے غیر کے بس میں ۔۔۔ہونے کو ہوں میں پرائی
سانوریا رے، نکلا تو ہرجائی . . . .

بیری ہو گئے اپنے ہی سائے ۔۔۔آنے کو ہیں لوگ پرائے
آجا کہ دنیا اجڑ نہ جائے ۔۔۔دیتی ہوں تیری دُہائی
سانوریا رے، نکلا تو ہرجائی. . . . .

(آواز۔مالا ٥ موسیقی۔خلیل احمد ٥ فلم۔خاموش رہو)

نغمہ

نوازش، کرم، شکریہ، مہربانی
مجھے بخش دی آپ نے زندگانی
نوازش، کرم، شکریہ، مہربانی........................

جوانی کی جلتی ہوئی دوپہر میں
یہ زلفوں کے سائے گھنیرے گھنیرے
عجب دھوپ چھاؤں کا عالم ہے طاری
مہکتا اجالا، چمکتے اندھیرے
زمیں کی فضا ہو گئی آسمانی
نوازش، کرم، شکریہ، مہربانی........................

لبوں کی یہ کلیاں کِھلی ادھ کِھلی سی
یہ مخمور آنکھیں گلابی گلابی
بدن کا یہ کندن سنہرا سنہرا
قد ہے کہ چھوٹی ہوئی ماہتابی
ہمیشہ سلامت رہے یہ جوانی
نوازش، کرم، شکریہ، مہربانی........................

(آواز۔مہدی حسن ٥ موسیقی۔اے حمید ٥ فلم۔میں وہ نہیں)

غزل

سامنے رشکِ قمر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں
کوئی محبوبِ نظر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں
سامنے رشکِ قمر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں

چاند کی طرح ستاروں میں جوانی گزرے
کہکشاں راہ گزر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں
سامنے رشکِ قمر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں

گل کی آغوش میں سوئی ہوئی خوشبو کی طرح
زندگی اپنی بسر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں
سامنے رشکِ قمر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں

عارض و لب کے چمن زار ہوں، پہلو میں کِھلے
ایسے ہر شب کی سحر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں
سامنے رشکِ قمر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں
کوئی محبوبِ نظر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں
سامنے رشکِ قمر ہو . . . .

(آواز۔مسعود رانا o موسیقی۔خلیل احمد o فلم۔میرے محبوب)

دوگانا

عورت　دور ویرانے میں اِک شمع ہے روشن کب سے
کوئی پروانہ ادھر آئے تو کچھ بات بنے

مرد　میں ترے پاس تو آ جاؤں مگر تو ہی بتا
ترا انداز ملاقات عجب ہے کہ نہیں
دیکھتے ہی مجھے کترا کے گزرنا تیرا
مجھ کو بیگانہ سمجھنے کا سبب ہے کہ نہیں
دل کی الجھن یہ سلجھ جائے تو کچھ بات بنے
کوئی دیوانہ ادھر آئے تو کچھ بات بنے

عورت　یہ حسیں رات یہ شبنم میں نہائی ہوئی رات
آ کہ اس رات کی آغوش میں کھو کر رہ جائیں
وہ فسانہ جسے اب تک کوئی عنواں نہ ملا
لب نہ کہہ پائیں تو آنکھوں کی زبانی کہہ جائیں

مرد — اب یہ حسرت بھی نکل جائے تو کچھ بات بنے

عورت — کوئی پروانہ ادھر آئے تو کچھ بات بنے
دل میں ارمان ہیں کیا کیا کوئی دل سے پوچھے
عمر بھر کاش نہ یہ چاند نہ یہ رات ڈھلے

مرد — چاند کے پاس ستارہ ہے میرے پاس ہے تو
کاش ایسے میں ہوا بھی ذرا لہرا کے چلے
زلف شانوں پہ بکھر جائے تو کچھ بات بنے

(آواز۔مالا۔مسعود رانا o موسیقی۔ماسٹر عنایت حسین o فلم۔ نائلہ)

نغمہ

واللہ سر سے پاؤں تلک موجِ نور ہو
قدرت کا شاہکار ہو تم رشکِ حور ہو واللہ

یہ حسن یہ نکھار یہ شوخی حیا کے ساتھ
یہ شرم سے جھکی ہوئی پلکیں ادا کے ساتھ
کیوں کر نہ اپنے حسن پہ تم کو غرور ہے
قدرت کا شاہکار ہو تم رشک حور ہو ......واللہ

زلفیں اڑیں تو چاند پہ بدلی بکھر گئی
نظریں اٹھیں تو دل پہ قیامت گزر گئی
دل کی خطا ہو تم کہ نظر کا قصور ہو
قدرت کا شاہکار ہو تم رشکِ حور ہو ......واللہ

سوچو دبی زبان سے کیا کہہ رہی ہے رات
آؤ کہ آج دل میں نہ رہ جائے دل کی بات
نزدیک آ چکی ہو تو کیوں دور دور ہو
قدرت کا شاہکار ہو تم رشکِ حور ہو ......واللہ

(آواز۔احمد رشدی o موسیقی۔خلیل احمد o فلم۔دامن)

نغمہ

(۱)

اے جان وفا دل میں تیری یاد رہے گی
دنیائے محبت میری آباد رہے گی
اے جان وفا

ہر دم تیری تصویر نگاہوں میں ہے روشن
ہاتھوں سے نہ چھوٹے گا تیرے پیار کا دامن
آنکھوں میں ترے ہجر کی روداد رہے گی
اے جان وفا

تنہا سہی، ویراں سہی، میں سب کی نظر میں
آباد ہے تو اب بھی اس اجڑے ہوئے گھر میں
اس دل میں ہمیشہ تو ہی آباد رہے گی
اے جان وفا

ہر لمحہ مرے دل میں دھڑکتا ہے ترا دل
تو ہی میری تقدیر ہے تو ہی مرا حاصل
تیرے لئے دنیا میری برباد رہے گی
اے جان وفا

(۲)

تصویر کی صورت تری محفل میں ہیں ہم بھی
لیکن نہ پڑی ہم پہ تری چشمِ کرم کبھی
کب تک یہ جفا اے دلِ ناشاد رہے گی
اے جان وفا

(آواز۔مہدی حسن ○ موسیقی۔خلیل احمد ○ فلم۔تصویر)

نغمہ

ہوا نے چپکے سے کہہ دیا کیا؟
کہ پھول لہرا کے ہنس پڑے ہیں
یہ کیسی دل میں امنگ جاگی
کہ ہم بھی شرما کے ہنس پڑے ہیں
ہوا نے چپکے سے کہہ دیا کیا ....

وہ لمحہ کتنا عجیب ہوگا، نظر سے جب کچھ نظر کہے گی
دلوں کی دھڑکن لجا کے اپنا.......فسانۂ مختصر کہے گی
گلے لگا لیں گے آج ان کو
جو ہم کو تڑپا کے ہنس پڑے ہیں
ہوا نے چپکے سے کہہ دیا کیا ....

وہ شب خیالوں میں جاگتی ہے کہ جب دلوں کا سنگھار ہوگا
ہر ایک دھڑکن میں پیار ہوگا، ہر ایک پل بے قرار ہوگا
ابھی سے آنکھوں میں سارے لمحے
جھلک سی دکھلا کے ہنس پڑے ہیں
ہوا نے چپکے سے کہہ دیا کیا ....

(آواز۔مالا ○ موسیقی۔خلیل احمد ○ فلم۔لوری)

دوگانا

لڑکا
کلی مسکرائی جو گھونگھٹ اٹھا کے
خدا کی قسم تم بہت یاد آئے

لڑکی
ہوا لے گئی جب بھی آنچل اڑا کے
خدا کی قسم تم بہت یاد آئے

لڑکا
کھلا کوئی غنچہ تو گھنگھرو سا چھنکا
لگا ناچنے بوٹا بوٹا چمن کا
کوئی شاخ جھومی جو مستی میں آ کے
خدا کی قسم تم بہت یاد آئے
کلی مسکرائی

لڑکی — کسی پھول پر کوئی جو بھنورا جو آیا
مرے ہونٹ کانپے 'بدن تھرتھرایا
نگاہیں جھکالیں جو میں نے لجا کے
خدا کی قسم تم بہت یاد آئے
لڑکا — کلی مسکرائی

لڑکی — کبھی چاند کے پاس دیکھا جو تارا
لڑکا — مچل کے میرے دل نے تم کو پکارا

دونوں — چھپے جب وہ بدلی کی چلمن گرا کے
خدا کی قسم تم بہت یاد آئے
کلی مسکرائی

(آواز۔نور جہاں۔مسعود رانا o موسیقی۔خلیل احمد o فلم۔میرے محبوب)

نغمہ

تو حسیں ترا جہاں حسیں
کھو گیا ہے دل یہیں کہیں
مرے صنم، تری قسم
میں جس کو ڈھونڈتا ہوں تو ہی تو نہیں
تو حسیں ترا جہاں حسیں......................

یہ مست آنکھیں، یہ بے قرار زلفیں
یہ بھولپن یہ بانکپن یہ پھول سا بدن
یہ چاند سی جبیں، یہ حسنِ مرمریں
.... کہیں نہیں
تو حسیں ترا جہاں حسیں......................

انہی اداؤں نے دل چرا لیا ہے
یہ مستیاں، یہ شوخیاں یہ دل ربائیاں
ذرا سنبھل سنبھل، نہ یوں بہک کے چل
......................او نازنیں
(آواز۔احمد رشدی o موسیقی۔سہیل رعنا o فلم۔جب سے دیکھا ہے تمہیں)

نغمہ

تم سا حسین، کوئی نہیں، کائنات میں
ناز و ادا، شرم و حیا، بات بات میں
تم سا حسیں کوئی نہیں ....

آئی ہو زندگی میں مری ایسی شان سے
اتری ہو جیسے حور کوئی آسمان سے
یا جیسے آفتاب نکل آئے رات میں
.... کائنات میں
تم سا حسیں کوئی نہیں ....

سورج مکھی سا روپ یہ ابرو ہلال سے
دل میں ہے روشنی سی تمہارے جمال سے
ہاں اک جہانِ حسن ہو تم اپنی ذات میں
.... کائنات میں
تم سا حسیں کوئی نہیں ....

دیکھو ذرا ادھر کہ نظر سے نظر ملے
چن لوں لبوں کے پھول تو دل کی کلی کھلے
آ جائے اک بہار سی باغِ حیات میں
.... کائنات میں
تم سا حسیں، کوئی نہیں، کائنات میں
ناز و ادا، شرم و حیا، بات بات میں
ارے تم سا حسیں کوئی نہیں ....

(آواز۔مسعود رانا o موسیقی۔خلیل احمد o فلم۔کھلونا)

نغمہ

گل کہوں، خوشبو کہوں، ساغر کہوں، صہبا کہوں
اے سراپا رنگ و بوٗ میں تجھ کو آخر کیا کہوں
گل کہوں، خوشبو کہوں، . . . .

تو محبت کے سنہرے خواب کی تعبیر ہے
جو تصور میں تھی روشن تو وہی تصویر ہے
اب بھی میں تجھ کو حقیقت یا کہ افسانہ کہوں
اے سراپا رنگ و بو میں تجھ کو آخر کیا کہوں
گل کہوں خوشبو کہوں ساغر کہوں صہبا کہوں
اے سراپا رنگ و بوٗ میں تجھ کو آخر کیا کہوں

تو زمیں کا چاند ہے یا آسماں کی حور ہے
یا مری دنیائے دل میں کہکشاں کا نور ہے
تیرے پیکر کو بتا کس حسن کا جلوہ کہوں
اے سراپا رنگ و بوٗ میں تجھ کو آخر کیا کہوں
گل کہوں، خوشبو کہوں، ساغر کہوں، صہبا کہوں
اے سراپا رنگ و بوٗ میں تجھ کو آخر کیا کہوں
گل کہوں، خوشبو کہوں . . . .

(آواز۔احمد رشدی o موسیقی۔خلیل احمد o فلم۔کھلونا)

نغمہ

جب سے دیکھا ہے تمہیں دل کا عجب عالم ہے
جانے ان نظروں میں کیا ہے کہ نظر ملتے ہی
دل کے تاروں پہ کوئی گیت سا لہرانے لگا
ایک انجانی سی مسرت سے فضا جھوم اٹھی
اپنے اطراف کی ہر چیز پہ پیار آنے لگا
جب سے دیکھا ہے تمہیں دل کا عجب عالم ہے

تم سے پہلے بھی میرے سینے میں دل تھا لیکن
آج تک دل کبھی اس طرح سے دھڑکا ہی نہ تھا
آج جس آگ میں جلتا ہوں میں چپکے چپکے
ایسا شعلہ تو مری روح میں بھڑکا ہی نہ تھا
جب سے دیکھا ہے تمہیں دل کا عجب عالم ہے
جب سے دیکھا ہے تمہیں . . . .

(آواز۔سلیم رضا o موسیقی۔سہیل رعنا o فلم ۔جب سے دیکھا ہے تمہیں)

نغمہ

زندگی کی ہر مسرت آپ کے پہلو میں ہے
کیا بتاؤں کیسی راحت آپ کے پہلو میں ہے

آپ ہیں تو یہ زمیں ہے، آسماں میرے لئے
آپ کے نقش قدم ہیں کہکشاں میرے لئے
سچ تو یہ ہے میری جنت آپ کے پہلو میں ہے

آپ نے اپنالیا سارا زمانہ مل گیا
جس کو پا کر کھو دیا تھا وہ خزانہ مل گیا
چاہتا تھا دل جو دولت، آپ کے پہلو میں ہے
زندگی کی ہر مسرت آپ کے پہلو میں ہے

اب یہ حسرت ہے کہ ان باہوں میں کھو جاؤں کہیں
خواب بن کر ان حسیں آنکھوں میں سو جاؤں کہیں
مری دنیائے محبت آپ کے پہلو میں ہے
زندگی کی ہر مسرت . . . .

(آواز۔نورجہاں ٥ موسیقی۔خلیل احمد ٥ فلم۔تصویر)

نغمہ

میں خوشی سے کیوں نہ گاؤں، میرا دل بھی گا رہا ہے
یہ فضا حسیں ہے اتنی کہ نشہ سا چھا رہا ہے
میں خوشی سے کیوں نہ گاؤں

میرے ہم نشیں مبارک، تجھے پیار کی یہ منزل
تجھے مل گئی وہ دولت جو ہے زندگی کا حاصل
وہ گماں تھا اک حقیقت یہ یقین آ رہا ہے
میں خوشی سے کیوں نہ گاؤں

یہ خوشی بھی کیا خوشی ہے کہ نکل پڑے ہیں آنسو
کہیں دل نہ بیٹھ جائے کہ نہیں ہے دل پہ قابو
تجھے نذر دوں تو کیا دوں، میرے پاس کیا رہا ہے
میں خوشی سے کیوں نہ گاؤں میرا دل بھی گا رہا ہے
یہ فضا حسیں ہے اتنی کہ نشہ سا چھا رہا ہے
میں خوشی سے کیوں نہ گاؤں

(آواز۔مجیب عالم ٥ موسیقی۔خلیل احمد ٥ فلم۔لوری)

گیت

لاج کرو نہ مورے بالم، نجریا ہم سے ملاؤ

میری ان آنکھوں کو جامِ شراب کہتے ہیں
مرے لبوں کو مہکتا گلاب کہتے ہیں
مرے شباب کو سب لاجواب کہتے ہیں
پیار سے ہاتھ بڑھاؤ، پیار سے ہاتھ بڑھاؤ
لاج کرو نہ مورے بالم، نجریا ہم سے ملاؤ

یہ بزمِ رقص ہے، گردش میں لاؤ پیمانے
ہر ایک گیت میں پنہاں ہیں لاکھ میخانے
جو ہے سو آج ہے کل کی خبر خدا جانے
جی بھر کے عیش اڑاؤ ......جی بھر کے عیش اڑاؤ
لاج کرو نہ مورے بالم، نجریا ہم سے ملاؤ

(آواز۔نسیمہ شاہین o موسیقی۔خلیل احمد o فلم۔تصویر)

نغمہ

مانا کہ حضور آپ ہزاروں میں حسیں ہیں
ہم بھی تو جناب آپ سے کچھ کم تو نہیں ہیں
مانا کہ حضور آپ ہزاروں میں حسیں ہیں

جنت میں اگر ہوتیں تو حور آپ ہی ہوتیں
کوثر کے کنارے کہیں آرام سے سوتیں
دنیا میں مگر آپ کے حقدار ہمیں ہیں
مانا کہ حضور آپ ....

آنکھوں میں ہے کیا بات‘ سمجھتے ہیں یہ ہم بھی
ہر راز کہے دیتی ہے ہونٹوں کی خموشی
لوگ ایسے ہمارے سوا دنیا میں کہیں ہیں؟
مانا کہ حضور آپ . . . .

ہم ہیں کہ بڑھے جاتے ہیں ہر دم سوئے منزل
اور آپ کے سینے میں دھڑکتا ہی نہیں دل
پتھر کی طرح آپ جہاں کل تھیں وہیں ہیں
مانا کہ حضور آپ ہزاروں میں حسیں ہیں
ہم بھی تو جناب آپ سے‘ کچھ کم تو نہیں ہیں
مانا کہ حضور آپ . . . .

(آواز۔احمد رشدی o موسیقی۔خلیل احمد o فلم۔لوری)

دوگانا

لڑکا
ہم نے تو تمہیں دل دے ہی دیا
اب تم یہ بتاؤ کیا دو گے

لڑکی
اس دل میں بسی ہے اک دنیا
اب تم یہ بتاؤ کیا لو گے

دونوں
ہم نے تو تمہیں دل دے ہی دیا

لڑکی
ان آنکھوں نے ہم کو چپکے سے
اک راز کی بات بتائی ہے
وہ بات جسے سن کر اکثر
دل دھڑکا‘ نظر شرمائی ہے
اس بات پر تن من وار دیا
اب تم یہ بتاؤ کیا دو گے
ہم نے تو تمہیں دل دے ہی دیا

لڑکا
دل پیش کروں' جاں پیش کروں
ان قدموں میں کیا پیش کروں
سرکار اگر فرمائیں تو
میں دل کی دنیا پیش کروں
سب کچھ ہے تمہارا جان وفا
اب تم یہ بتاؤ کیا لو گے
ہم نے تو تمہیں دل دے ہی دیا

لڑکی
اک چیز ہے جس کو دل والے
تن من کی دولت کہتے ہیں

لڑکا
ہم جان گئے' پہچان گئے
لوگ اس کو محبت کہتے ہیں
سودا تو کیا ہم نے دل کا
اب تم یہ بتاؤ کیا دو گے

دونوں
ہم نے تو تمہیں دل دے ہی دیا

(آوازسلیم رضا۔مالاo موسیقی۔رشیدعطرے o فلم۔پائل کی جھنکار)

نغمہ

کوئی میرے محبوب سا دنیا میں نہیں ہے
پھر کیوں نہ ہو دل اس کی محبت میں دوانہ
کوئی میرے محبوب سا دنیا میں نہیں ہے
وہ شوخ نگاہوں میں چھلکتا ہوا جادو
الجھے ہوئے بالوں سے نکلتی ہوئی خوشبو
ہنستے ہوئے ہونٹوں پہ وفاؤں کا فسانہ
پھر کیوں نہ ہو دل اس کی محبت میں جادو
کوئی مرے محبوب سا . . . .

وہ دولت دنیا کا پرستار نہیں ہے
ان کاغذی پھولوں کا خریدار نہیں ہے
اس یوسف ثانی کے ہے قدموں میں زمانہ
پھر کیوں نہ ہو دل اس کی محبت میں دوانہ
کوئی مرے محبوب سا . . . .

جب اس کا خیال آتا ہے، جھک جاتی ہیں نظریں
یوں اس کے تصور ہی سے شرماتی ہیں نظریں
جیسے یہ تصور ہے محبت کا بہانہ
پھر کیوں نہ ہو دل اس کی محبت میں دوانہ
کوئی مرے محبوب سا دنیا میں نہیں ہے

(آواز۔نورجہاں ٥ موسیقی۔خلیل احمد ٥ فلم۔میرے محبوب)

نغمہ

یہ خوشی عجب خوشی ہے اسے جانے کیا زمانہ
ابھی زندگی حقیقت، ابھی زندگی فسانہ
یہ خوشی عجب خوشی ہے

ہوئی ان سے آج روشن تیری زندگی کی محفل
جنہیں اہل دل نے چاہا جو ہیں اہل دل کے قابل
یہ خوشی عجب خوشی ہے

تری خوش نصیبیوں پر مجھے کیوں نہ رشک آئے
کہ جو پھول تو نے مانگے وہ ہی تیرے ہاتھ آئے
یہ خوشی عجب خوشی ہے

یہ خوشی عجب خوشی ہے اسے جانے کیا زمانہ
ابھی زندگی حقیقت، ابھی زندگی فسانہ
یہ خوشی عجب خوشی ہے

(آواز۔احمد رشدی ٥ موسیقی۔سہیل رعنا ٥ فلم۔جب سے دیکھا ہے تمہیں)

نغمہ

میرے محبوب تجھے یاد کروں یا نہ کروں
دل پکارے بھی تو فریاد کروں یا نہ کروں

جب سے چھوٹا ہے ترے پیار کا دامن مجھ سے
زندگی ایک جہنم کے سوا کچھ بھی نہیں
دل جو ٹوٹا تو ہر اک خواب حسیں ٹوٹ گیا
اب مرے پاس ترے غم کے سوا کچھ بھی نہیں
دل کو اس غم سے بھی آباد کروں یا نہ کروں
میرے محبوب

رات ہنس ہنس کے مجھے آئینہ دکھلاتی ہے
اشک بن بن کے ہراک یاد امڈ آتی ہے
دیکھتے دیکھتے یوں دل کا چمن راکھ ہوا
اپنی برباد محبت پہ ہنسی آتی ہے
کچھ علاج دل برباد کروں یا نہ کروں
میرے محبوب

(آواز۔نورجہاں o موسیقی۔اے حمید o فلم۔میں وہ نہیں)

دوگانا

لڑکا میری نظر میں کیا ہو تم
لڑکی کیا ہوں میں
لڑکا میری نظر سے پوچھ لو
میرے دل حزیں میں تم ، اس طرح جلوہ بار ہو
جیسے خزاں کے دور میں ، آئی ہوئی بہار ہو
میرا یقیں نہ آئے تو، شمش و قمر سے پوچھ لو

لڑکی میری نظر میں کیا ہو تم
لڑکا کیا ہوں میں
لڑکی میری نظر سے پوچھ لو
میری وفا کی آبرو ، میری حسین آرزو
دل میں بسے ہو ایسے تم،.پھولوں میں جیسے رنگ وبو
میرا یقیں نہ آئے تو قلب و نظر سے پوچھ لو

لڑکا میری نظر میں کیا ہو تم
لڑکی کیا ہوں میں
لڑکا میری نظر سے پوچھ لو
اتنی حسیں حیات ہے ہاتھوں میں تیرا ہاتھ ہے
لڑکی تم ہو مرے قریب تو سارا جہان ساتھ ہے
میرا یقیں نہ آئے تو شام و سحر سے پوچھ لو
لڑکا میری نظر میں کیا ہو تم
لڑکی کیا ہوں میں
لڑکا میری نظر سے پوچھ لو

(آواز۔احمد رشدی، آئرن پروین o موسیقی۔مصلح الدین o فلم۔دل نے تجھے مان لیا)

نغمہ

چاند سے چاندنی جدا ہو سکتی ہے
جدا میں تم سے ہو جاؤں بھلا یہ کیسے ممکن ہے
یہ ممکن ہے، چکوری چاند سے ہو جائے بیگانہ
چمن سے ختم ہو جائے گل و بلبل کا افسانہ
الگ ہو دھوپ سے چھاؤں، بھلا یہ کیسے ممکن ہے
چاند سے چاندنی جدا ہو سکتی ہے

کنارے اور ندی کا ساتھ چھوٹا ہے نہ چھوٹے گا
یہ رشتہ پیار کا رشتہ ہے ٹوٹا ہے نہ ٹوٹے گا
میں اس رشتے سے باز آؤں، بھلا یہ کیسے ممکن ہے
چاند سے چاندنی جدا ہو سکتی ہے
جدا میں تم سے ہو جاؤں، بھلا یہ کیسے ممکن ہے

(آواز۔احمد رشدی o موسیقی۔خلیل احمد o فلم۔کھلونا)

دوگانا

لڑکا لیے چلا ہے دل کہاں، عجیب ہے سماں
نہ کوئی دکھ، نہ کوئی غم، بس ایک تم اور ایک ہم
تم اور ہم ، تم اور ہم

لڑکی لیے چلا ہے دل کہاں . . . .

لڑکا یہ جاگتی فضا، سماں یہ دل نشیں
یہ جھومتا فلک، یہ ناچتی زمیں

لڑکی جدھر نظر کروں، دکھائی دو تمہیں
جہاں رہو گے تم، رہے گا دل وہیں
بس ایک تم اور ایک ہم
تم اور ہم ، تم اور ہم
لیے چلا ہے دل کہاں . . . .
ملے جو تم مجھے، زمانہ مل گیا
نئی حیات کا، بہانہ مل گیا

لڑکا لب خموش کو، ترانہ مل گیا
دلوں کو پیار کا، خزانہ مل گیا
بس ایک تم اور ایک ہم

دونوں تم اور ہم ، تم اور ہم

لڑکی لیے چلا ہے دل کہاں، عجیب ہے سماں
نہ کوئی دکھ نہ کوئی غم، بس ایک تم اور ایک ہم

دونوں تم اور ہم ، تم اور ہم
تم اور ہم ، تم اور ہم

(آواز۔مالا۔احمد رشدی o موسیقی۔خلیل احمد o فلم۔کھلونا)

کورس

ساتھی میرے، شام سویرے، محنت اپنا کام
کام تو پورا، دام ادھورا، پھر بھی ہم بدنام

جلتا سورج، تپتی دھرتی گود میں ہم کو پالے
خون پسینہ ایک کریں تو پائیں ہاتھ کے چھالے
ہونٹوں پہ مسکان ہے لیکن سینے میں کہرام

بہے پسنیہ بن کے جوانی، جلتا جائے خون
تپتے تپتے انگاروں میں ڈھلتا جائے خون
خون کا شعلہ بھڑک اٹھے تو دنیا دے الزام

دولت کی شطرنج کے مُہرے بن کے جئیں ہم لوگ
امرت جان کے ہنستے گاتے زہر پئیں ہم لوگ
جیتے جی اس موت کو سمجھیں قسمت کا انعام

دھرتی گھومے موسم بدلے بدلیں نہ اپنے بھاگ
اپنے تن پہ دھول جمی ہے پیٹ میں بھڑکے آگ
مٹی سے آغاز ہوا ہے مٹی ہے انجام

سمجھے کیسے پتھر دنیا ہم بھی ہیں انسان
ہم بھی ہیں آدم کے بیٹے ہم کو بھی پہچان
کرنا ہوگا اور ہی کچھ اب، لے کے خدا کا نام

ساتھی میرے، شام سویرے، محنت اپنا کام
کام تو پورا، دام ادھورا، پھر بھی ہم بدنام

(آواز۔مسعود رانا اور ہمنواo موسیقی۔سہیل رعناo فلم۔شہر اور سائے)

کورس

رائت الصبیحاً علیٰ قصرِاً
متفضلاً بدرُاً و ہِلالاً
فقلتُ ما اسمُکَ
فقالاُ ـــ لولو
فقلت ـ لی لی
فقالا ـــ لا لا

آج نہ پھر کل آئے گا سوچ ذرا نادان
آج اٹھا لے جی بھر کے دل کا ہر اک احسان
کوئی نہ جانے، دل کے فسانے، سب ہیں دوانے

رائت الصبیحاً علی قصراً
جام ترا گر خالی ہے آنکھوں سے تو پی لے
غم کی ماری دنیا میں ہنستے ہوئے جی لے
ہاتھ بڑھا لے، جام اُٹھا لے، رات سجا لے
رائت الصبیحاً علی قصراً

(آواز۔رشدی۔نجمہ،ناہید نیازی اور ہمنواo موسیقی۔مصلح الدینo فلم۔دل نے تجھے مان لیا)

قوالی

یہ مکھڑے پہ آنچل کہ چندا پہ بادل، یہ قد ہے کہ بجلی سی لہرا رہی ہے
لجائے لجائے وہ یوں آرہے ہیں کہ جیسے قیامت چلی آرہی ہے
کیسا جلوہ ہے کہ آنکھوں میں سماتا ہی نہیں
اتنی روشن ہے نظر، کچھ نظر آتا ہی نہیں
نظر آفتابی، جبیں ماہتابی، جوانی ہے جیسے چھلکتی گلابی
میں دل کو سنبھالوں کہ خود کو سنبھالوں ارے میری دنیا لٹی جارہی ہے
ہائے یہ رات یہ جنت سے اتاری ہوئی رات
رنگ اور نور سے دھو دھو کے نکھاری ہوئی رات
ادائے حیا سے، نگاہیں اٹھا کے، مری سمت دیکھو ذرا مسکرا کے
ذرا سوچو سوچو، کہ یہ رات کیا کیا، اشاروں اشاروں میں سمجھا رہی ہے
یہ مکھڑے پہ آنچل کہ چندا پہ بادل، یہ قد ہے کہ بجلی سی لہرا رہی ہے

(آوازیں۔مسعود رانا، بشیر احمد قوال، نسیمہ شاہینo موسیقی۔مصلح الدینo فلم۔دل نے تجھے مان لیا)

شادی کا گیت

بھولی دلہنیا کا جیا لہرائے
موتین والی کو پیا یاد آئے
پیا گھر جانا سجن گھر جانا
بابل کی گلیوں میں کچھ نہ سُہائے

چمکے ہے ماتھے پہ ٹیکہ سنہرا
گورے گورے مکھڑے پہ لڑیوں کا پہرہ
ہائے کہیں نا نظر لگ جائے
بھولی دلہنیا کا جیا لہرائے

چہرہ گلابی تو آنچل ہے دھانی
شرمائے جلووں سے کرنوں کی رانی
چندا بھی دیکھے تو چھپ چھپ جائے
بھولی دلہنیا کا جیا لہرائے

مستی میں ڈوبی ہوئی ہے جوانی
بن جائے گی دو دلوں کی کہانی
بلما جو گوری کا گھونگھٹ اٹھائے
بھولی دلہنیا کا جیا لہرائے
موتین والی کو پیا یاد آئے
پیا گھر جانا سجن گھر جانا
بابل کی گلیوں میں کچھ نہ سُہائے

(آواز۔نسیمہ شاہین اور ہمنوا o موسیقی۔خلیل احمد o فلم۔آنچل)

شادی کا گیت

لال بنی میری موتین والی
لال بنی میری کنگن والی
لال بنی نازوں کی پلی ہے
کھلتی ہوئی جوہی کی کلی ہے
لال بنی مصری کی ڈلی ہے
گائیں سکھیاں مبارک بادی
لال بنی میری موتین والی
ساس نند جٹھانی دیور
تجھ پہ کریں گے جان نچھاور
راج کرے گی سارے گھر پر
گائیں سکھیاں مبارک بادی
لال بنی میری موتین والی
آج ہوئی تو پرائی بہنا
تجھ کو مبارک جوڑا گہنا
جم جم نت سسرال میں رہنا
گائیں سکھیاں مبارک بادی
لال بنی میری موتین والی

(آواز۔نسیمہ شاہین اور ہمنوا o موسیقی۔خلیل احمد o فلم۔میرے محبوب)

لوری

چھن چھن چھنانانا چھن
چندا کے ہنڈولے میں۔اڑن کھٹولے میں
امی کا دلارا ۔ ابو جی کا پیارا سوئے
نندیا جھلائے تجھے جھولنا

دھیرے دھیرے نندیا تو انکھیوں میں آنا
میٹھے میٹھے 'پیارے پیارے سپنے دکھانا
پریوں کی نگری کی سیر کرانا
چندا کے ہنڈولے میں۔اڑن کھٹولے میں

جب تک میرا منا سوئے، تارو تم نا سونا
مہکے ہمیشہ یوں ہی پھولوں کا بچھونا
کھیلے کودے جُگ جُگ میرا سلونا
چندا کے ہنڈولے میں۔اڑن کھٹولے میں
امی کا دلارا ۔ابو جی کا پیارا سوئے
نندیا جھلائے تجھے جھولنا
چھن چھن چھنانانا چھن

(آواز۔ثریا حیدرآبادی o موسیقی۔خلیل احمد o فلم۔لوری)

لوری

سو جا میری گڑیا' تو کیوں ٹُک ٹُک جاگے
اپنا دکھڑا کیسے روئے' ممتا تیرے آگے
سوجا میری گڑیا

تو کیا جانے اس جگ میں ہیں کیسے کیسے لوگ
پیار جتا کے دے جاتے ہیں جیون بھر کا روگ
تیرا میرا دل ہے ایک کھلونا جن کے آگے
سوجا میری گڑیا

کوئی نہ جانے دل کیوں روئے' نین کریں کیوں بین
نیند کے بدلے کیوں آنکھوں میں آنسو ہیں بے چین
جس نے دیا ہے یہ دکھ ہم کو، اس کو نہ یہ دکھ لاگے
سوجا میری گڑیا' تو کیوں ٹُک ٹُک جاگے
اپنا دکھڑا کیسے روئے ممتا تیرے آگے
سوجا میری گڑیا

(آواز۔نور جہاں o موسیقی۔سہیل رعنا o فلم گڑیا)

لوری

اللہ اللہ اللہ اللہ
سو جا میری آنکھوں کے تارے' سوجا راج دلارے
اللہ اللہ اللہ اللہ

چندا سے چھپ کے چپکے چپکے نندیا رانی آجا
نیند کی آس میں ٹُک ٹُک جاگے میرا مُنّا راجہ
اپنی آنکھوں کا ہر سپنا ممتا تجھ پر وارے
اللہ اللہ اللہ اللہ

میرے آنسو موتی بن کے تیرا روپ نکھاریں
اپنے ابو کے سائے میں تجھ پر آئیں بہاریں
جھولے کی ہر پینگ بڑھائے تیری عمریا پیارے
اللہ اللہ 'اللہ اللہ

(آواز۔نگہت سیما o موسیقی۔خلیل احمد o فلم تصویر)

نغمہ

پیار میں ہم اۓ جان تمنا
جان سے جائیں تو مانو گے
چاک گریبان گلیوں گلیوں
خاک اڑائیں تو مانو گے
پیار میں ہم اۓ جان تمنا

ہم نے تم سے پیار کیا ہے، کیوں نہ تمہارے ناز اٹھائیں
تم جو کہو تو ان قدموں میں دل رکھ دیں دامن پھیلائیں
ہاتھ کو جوڑ کے منت کرکے تم کو منائیں تو مانو گے
پیار میں ہم اۓ جان تمنا
جان سے جائیں تو مانو گے

ہائے یہ تیکھے تیور، ہائے یہ پیشانی پہ بل
ہائے غصیلی آنکھوں میں ہلکا سا چمکیلا کاجل
اس عالم میں بھی ہم تم کو آج ہنسائیں تو مانو گے
پیار میں ہم اۓ جان تمنا
جان سے جائیں تو مانو گے

آئی ہنسی وہ آئی لبوں پر رخساروں کے پھول کھلے
ڈوب گئے آنکھوں کی چمک میں پیار کے سارے شکوے گلے
لو اب ہم نے توبہ کرلی اب نہ ستائیں تو مانو گے
پیار میں ہم اۓ جان تمنا
جان سے جائیں تو مانو گے

(آواز۔احمد رشدی o موسیقی۔خلیل احمد o فلم۔کنیز)

نغمہ

دونوں طرف ہے آج برابر ٹھنی ہوئی
اور مجھ غریب جان کے اوپر بنی ہوئی
دونوں طرف ہے آج برابر ٹھنی ہوئی

اُن کا کہا جو مانیں تو یہ روٹھ جائیں گے
اِن کو اگر منائیں تو وہ منہ پھلائیں گے
دل ہے مرا اِدھر تو مری جان ہے اُدھر
دل کو اگر سنبھالیں تو ہم جاں سے جائیں گے
دونوں طرف ہے آج برابر ٹھنی ہوئی

کتنے حسین دونوں ہیں صورت تو دیکھئے
اور میرے دل میں ان کی محبت تو دیکھئے
یہ چندے آفتاب ہیں، وہ چندے ماہتاب
دونوں کے درمیاں مری حالت تو دیکھئے
دونوں طرف ہے آج برابر ٹھنی ہوئی
اور مجھ غریب جاں کے اوپر بنی ہوئی
دونوں طرف ہے آج برابر ٹھنی ہوئی

(آواز۔احمد رشدی ○ موسیقی۔خلیل احمد ○ فلم۔کنیز)

دوگانا

لڑکی — کیوں حضور کیوں، یہ غرور کیوں
جب دل نے تجھے مان لیا
لڑکا — تیرے پیار کا، اعتبار کیا
اے حسن تجھے جان لیا
کیوں حضور کیوں، یہ غرور کیوں

لڑکی — ایسے آنکھیں پھاڑ کے دیکھا نہ کرو
لڑکا — دیکھیں گے ہم، جو کرنا ہے کیا کرو
لڑکی — آہا، یہ منہ اور یہ باتیں، کس دل سے جی
لڑکا — تم کیا جانو، تم کیا سمجھو، اس دل سے جی
لڑکی — کیا ہے تیرے دل میں ہم نے تیری نظر سے جان لیا

لڑکا سن اے نازنین۔ ایسے ہم نہیں
کب ہم نے تیرا احسان لیا
کیوں حضور کیوں، یہ غرور کیوں

لڑکا کالی زلفوں والوں کا ہے دل بھی کالا

لڑکی پھر کیوں ہم پہ مرتے ہو جناب والا

لڑکا پہلے کتنے ڈورے ڈالے ان آنکھوں سے

لڑکی ہم کو کس نے بہکایا میٹھی باتوں سے

لڑکا کوئی نہ تم سا دیکھا ہم نے سارا زمانہ چھان لیا

لڑکی اے جناب من، چھوڑو یہ چلن
اب میں نے تمہیں پہچان لیا

لڑکا کیوں حضور کیوں
اب میں نے تجھے مان لیا؟

(آواز۔احمد رشدی۔ناہید نیازی o موسیقی۔مصلح الدین o فلم۔دل نے تجھے مان لیا)

نغمہ

ماہ لقا... محبوبہ..... ماہ لقا... محبوبہ
عشق کیا، کوئی شوق نہیں
عاشق ہم بد ذوق نہیں.... ماہ لقا...... محبوبہ
خلوت یعنی تنہائی
کھینچ کے ہم کو لے آئی
آپ عبا و قبا پہ نہ جائیں
ہم سے محبت تو فرمائیں
ماہ لقا....... محبوبہ... ماہ لقا..... محبوبہ
غیض وغضب یہ رہنے دیں
دل کی بات تو کہنے دیں
قصہ ہے یہ مختصراً
نیک بہت ہیں ہم عملاً
ماہ لقا....... محبوبہ

عرض دل پر غور کریں
فیصلہ اب فی الفور کریں
ہم کو نہ غرق یاس کریں
ریشِ دراز کا پاس کریں
ماہ لقا...... محبوبہ
(آواز۔احمد رشدی o موسیقی۔خلیل احمد o فلم۔میرے محبوب)

کورس

لڑکے عشق والوں کا سدا، برا نجام ہوا
ہم تو بدنام ہوئے، حسن کا نام ہوا
ان کے نخرے جو سہے، وہ کہیں کا نہ رہے

لڑکیاں عشق والوں سے کہو، مفت آہیں نہ بھرو
عشق سے پہلے ذرا، آئینہ دیکھ تو لو
صبح بستر سے اٹھے، عشق کرنے کو چلے
لڑکے حسن کی رت ہے آنی جانی
عشق کی دنیا ہے لافانی
لڑکیاں دنیا ہمارے دم سے حسیں ہے
ہم جو نہیں تو کچھ بھی نہیں ہے
لڑکے حُسن کا جادو، حُسن کے جلوے
عشق نہ ہو تو، دو کوڑی کے
لڑکیاں پھر بھی حُسن کے پیچھے آگے
عشق پھرے ہے بھاگے بھاگے

لڑکے عشق دیوانہ سہی، عشق کے دم سے رہی، حسن کی بادشہی
لڑکیاں عشق والوں کا سدا، برا انجام ہوا
لڑکے ہم تو بدنام ہوئے، حُسن کا نام ہوا
ان کے نخرے جو سہے، وہ کہیں کا نہ رہے
لڑکے تاج محل ہے کس کی نشانی
لڑکیاں پوچھو انار کلی کی زبانی
لڑکے مچھلی تل کے کس نے کھلائی
لڑکیاں کچّے گھڑے پہ کون تھی آئی
لڑکے دودھ کی نہر نکالی کس نے
لڑکیاں عشق کی لاج بچالی کس نے
لڑکے یاد کرو مجنوں کا فسانہ
لڑکیاں چھوڑ بھی یہ راگ پرانا
لڑکیاں اب تو جو ہم پہ مرے، پہلے کچھ کام کرے، ٹھنڈی آہیں نہ بھرے
سب آؤ مل جل کے رہیں ختم جھگڑا یہ کریں

(آوازیں۔رشدی۔نسیمہ شاہین اور ہمنوا ○ موسیقی سہیل رعنا ○ فلم ۔جب سے دیکھا ہے تمہیں)

دوگانا

لڑکا کھٹی کڑی میں مکّھی پڑی، ہائے مری امّاں
لڑکی کیسے اناڑی کے پالے پڑی، ہائے مری امّاں
لڑکا آنکھیں دکھا نا بڑی بڑی ہائے مری امّاں
کھٹی کڑی میں مکھی پڑی ....
لڑکی موّا یہ نگوڑا کسی کام کا نہ کاج کا، دشمن ہے بس ڈھائی سیر اناج کا
باتیں بنائے بڑی بڑی، ہائے مری امّاں
لڑکا سن لے میری رات کی رانی، تجھ پہ صدقے میری نانی
تو جو کہے تو آج لٹا دوں، اپنی یہ انمول جوانی
روٹھ نہ جا یوں گھڑی گھڑی، ہائے مری امّاں
لڑکی میں نے مانگی لپ کی اسٹک، موّا ہاکی اسٹک لایا
میں نے مانگی نیل کی پالش موّا بوٹ کی پالش لایا
اُلٹی ہے کیا تری کھوپڑی، ہائے مری امّاں
لڑکا عقل کہاں سے لاؤں پیاری، وہ تو میں نے تجھ پر واری
لڑکی بھینس کے آگے بین بجائی، ہائے رے دیّا میں تو ہاری
لڑکا عقل بڑی یا بھینس بڑی، ہائے مری امّاں
لڑکی کیسے اناڑی کے پالے پڑی، ہائے مری امّاں
دونوں کھٹی کڑی میں مکّھی پڑی، ہائے مری امّاں

(آواز۔احمد رشدی۔آئرن پروین ٥ موسیقی۔خلیل احمد ٥ فلم۔آنچل)

کورس

سب تالی بجے بھئی تالی بجے
لڑکی مُنّا ہمارا دودھوں نہائے پوتوں پھلے
تالی بجے بھئی تالی بجے
لڑکا منّے میاں ہوں اتنے بڑے، تاروں کو چھولیں کھڑے کھڑے
ایک لڑکی منّے کے ماموں چوسیں انگوٹھا
بچہ پھوپو ہماری دودھو پیئے
سب تالی بجے بھئی تالی بجے
لڑکا منّے کی آنٹی، کھٹ مٹھی گولی
ایک لڑکی چکھّو تو نکلے، کڑوی نبولی
دوسری لڑکی منّے کے ماموں تھالی کے بیگن
ایک لڑکی بیگن نہیں جی، چکنے گھڑے
سب تالی بجے بھئی تالی بجے
ایک لڑکی منّے میاں تو دولھا بنے
دوسری لڑکی منّے کے ماموں گھوڑا بنے
لڑکا منّے کی پھوپی کھینچے لگام
بچہ ماموں رُکے تو ڈنڈے پڑے
سب تالی بجے بھئی تالی بجے
منّا ہمارا دودھو نہائے پوتوں پھلے
تالی بجے بھئی تالی بجے

(آوازیں۔آئرن پروین۔شکیل۔نگہت سیما اور دوسرے ٥ موسیقی۔خلیل احمد ٥ فلم۔لوری)

کورس

ایک تارا گگّو تارا، دو تارا گگّو تارا
جیے میرا منّا، جیے میرا پیارا

منّے نے اک بلّی پالی، بلّی نے اک چوہا
چوہے نے اک کُتا پالا، کُتے نے اک گھوڑا
گھوڑے نے جب لات چلائی منا بولا وہ مارا
ایک تارا گگّو تارا، دو تارا گگّو تارا

گاڑی پہنچی اسٹیشن پر اُس میں سے نکلا بھالو
جو کوّے کا ماموں ہے اور مرغی کا ہے خالو
بندر بولا ککڑوں کوں اور مرغی نے چمکارا
ایک تارا گگّو تارا، دو تارا گگّو تارا

بوجھورے منّے
ایک پرندہ ایسا دیکھا جس کا سر نا پیرَ
اس کو پانی میں ڈالو تو وہ جاتا ہے تیرَ
اچھا۔۔۔ہاں ہاں
کھاتا ہے وہ گیس ہوا، ارے بوجھو منّے کیا ہے؟
ارے بوجھو منّے ....غُبّارا
ایک تارا گگّو تارا، دو تارا گگّو تارا
جیے میرا منّا، جیے میرا پیارا

(آوازیں۔آئرین پروین اور ہمنواo موسیقی۔خلیل احمدo فلم۔کنیز)

نغمہ

ہمت سے ہر قدم اٹھانا تو ہے پاکستانی
تجھ سے ہی ملک بنے گا دنیا میں لاثانی

چندا کی گودی میں تارا میری گود میں تو
اپنا وطن ہے اک پھلواری تو اس کی خوشبو
اس خوشبو سے مہکے دنیا، تجھ سے جینا سیکھے دنیا
تیرا رکھوالا ہے اللہ، بگڑے کام بنائے مولا
بولو بیٹا، اللہ اللہ

بادل تیرے، دریا تیرے، تیری ہر وادی
ہر قیمت پر باقی رکھنا اپنی آزادی
آزادی کی خاطر جینا، آزادی کی خاطر مرنا
تیرا رکھوالا ہے اللہ، بگڑے کام بنائے مولا
بولو بیٹا اللہ اللہ
ہمت سے ہر قدم اٹھانا تو ہے پاکستانی

(آواز۔احمد رشدی o موسیقی۔سہیل رعنا o فلم۔جب سے دیکھا ہے تمہیں)

ترانہ

اپنے پرچم تلے، ہر سپاہی چلے
ہاں سپاہی ہیں ہم، یوں بڑھائیں قدم
جیسے تاروں کے جھرمٹ میں چندا چلے

پھول سے ہیں مگر ہم شرارے بھی ہیں
نرم لہریں بھی، طوفان کے دھارے بھی ہیں
وقت آئے تو بن جائیں گے تیر ہم
اپنے ہر خواب کی خود ہیں تعبیر ہم
حق کی خاطر کٹا دیں گے اپنے گلے
اپنے پرچم تلے

پاک ہے یہ زمیں، پاک ہے آسماں
کوئی غدّار رہنے نہ پائے یہاں
دل میں ایمان، ہاتھوں میں قرآن ہے
ہم میں ہر ایک سچا مسلمان ہے
ہم بُرے سے بُرے ہیں بَھلے سے بَھلے
اپنے پرچم تلے

اپنے پیارے وطن کو سجائیں گے ہم
ذرّے ذرّے کو سورج بنائیں گے ہم
کوئی دشمن جو روکے ہمارے قدم
بڑھ کے اُس کا ہی تختہ الٹ دیں گے ہم
اپنے پرچم تلے، ہر سپاہی چلے

(آواز۔ مالا اور ہمنوا o موسیقی۔ ماسٹر عنایت حسین o فلم۔ اک تیرا سہارا)

گیت

آوازیں — بڑھے چلو، بڑھے چلو
لڑکی — جارے جارے میرے ڈھول سپاہی
تیرا اللہ نگہباں ہو
راہوں کے صدقے یہ غم کی ماری
میری خوشی تیری خوشیوں پہ واری
تیری بلائیں مجھے لگ جائیں ساری
میری دعائیں تیرے ساتھ ہیں راہی
تیرا اللہ نگہباں ہو
آوازیں — بڑھے چلو، بڑھے چلو
لڑکی — جارے جارے میرے ڈھول سپاہی
تیرا اللہ نگہباں ہو

سینے سے تیرا پیار لگائے
بیٹھی رہوں گی یوں ہی نین بچھائے
لوٹ کے جب تک تو آ نہ جائے
پل پل دے گا میرے غم کی گواہی
تیرا اللہ نگہباں ہو

آوازیں — بڑھے چلو، بڑھے چلو
لڑکی — جارے جارے میرے ڈھول سپاہی
تیرا اللہ نگہباں ہو

(آواز۔نسیمہ شاہین ٥ موسیقی۔خلیق احمد ٥ فلم۔خاموش رہو)

گیت

میرے بہادر بھیا تجھ پر ناز کرے تری بہنا
سینہ سپر رہنا

جب جنگ کی خبریں آئیں، مرے دل سے نکلیں دعائیں
مرا شان سے سرتن جائے، تری دور سے لوں میں بلائیں
بھیا --- آگے بڑھتے رہنا، سینہ سپر رہنا

جب توپ دہانہ کڑکے، مرے دل میں آگ سی بھڑکے
جی چاہے میں بھی رَن میں، دشمن سے لڑوں بڑھ بڑھ کے
بھیا---زخموں کو سمجھوں گہنا، سینہ سپر رہنا

جو تیرے مقابل آئے، اللہ کرے مر جائے
تو سارے وطن کا نگہباں، تجھے عمر مری لگ جائے
بھیا---پاؤں جمائے رہنا، سینہ سپر رہنا
میرے بہادر بھیا، تجھ پر ناز کرے تری بہنا
سینہ سپر رہنا

(آواز،مہناز ٥ موسیقی۔خلیل احمد ٥ فلم۔جہاد)

ساتھیو، مجاہدو
جاگ اُٹھا ہے سارا وطن ساتھیو مجاہدو

جو بھی رستے میں آئے گا کٹ جائے گا
رَن کا میدان لاشوں سے پٹ جائے گا
آج دشمن کا تختہ الٹ جائے گا
ساتھ ہیں مرد و زن، سر سے باندھے کفن
ساتھیو...... مجاہدو

آج مظلوم، ظالم سے ٹکرائیں گے
اپنی طاقت زمانے سے مَنوائیں گے
سامراجی خداؤں پہ چھا جائیں گے
ہر جری صف شکن، ہر جواں تیغ وزن
ساتھیو ...... مجاہدو

دل میں قرآن، ہونٹوں پہ تکبیر ہے
جوش عباس ہے، عزم شبیر ہے
ہر مسلمان حیدر کی شمشیر ہے
سر پہ سایہ فگن، دستِ خیبر شکن
ساتھیو...... مجاہدو
(آواز۔مسعود رانا اور ہمنوا ٥ موسیقی۔خلیل احمد ٥ فلم۔مجاہد)

چاند کی دھوپ

میں سچ تو بولتا ہوں مگر اے خدائے حرف
تو جس میں سوچتا ہے، مجھے وہ زبان دے
(حمایت علی شاعر)

اپنے استاد اور دوست

سیّد اختر الزماں ناصر کے نام

بصد احترام

میں سچ تو بولتا ہوں مگر اے خدائے حرف

تو جس میں سوچتا ہے مجھے وہ زبان دے

(حمایت علی شاعر)

ترتیب

شہرِ علم ۸۰۶
بابِ علم ۸۰۷
کربلا ۸۰۸
میں سو رہا تھا اور کوئی بیدار مجھ میں تھا ۸۱۰
در پردہ اپنے عہد کی تقدیر دیکھ لی ۸۱۱
میں کون ہوں، کیا ہوں مری تحریر کہے گی ۸۱۲
اب شاعری شعور کا پَرتَو نہیں رہی ۸۱۳
صبح سے شام ہوئی آج اسی انجمن میں ۸۱۴
اِک وقت اس کے عشق میں دیوانہ میں بھی تھا ۸۱۵
جب بھی اُسے دیکھوں، وہ نیا ہی نظر آئے ۸۱۶
وہ میری آنکھوں میں یوں بسا ہے کہ صبح دیکھوں نہ شام دیکھوں ۸۱۷
تم ہو بے گھر اور ہم ہیں اپنے گھر میں اجنبی ۸۱۹
متفرق اشعار ۸۲۰
آئینہ در آئینہ ۸۲۲
پتھر ۸۲۴
ہوا پہ اختیار کیا ۸۲۸
درونِ ذات ۸۳۰
تسلسل ۸۳۱

نروان کے بعد	۸۳۳
قدرِ مشترک	۸۳۵
من تو شدم	۸۳۶
تو من شدی	۸۳۷
عہدِ وفا	۸۳۹
ضرورت	۸۴۱
غور طلب	۸۴۲
اب وقت بہت کم ہے	۸۴۳
خوفِ ہمسایہ	۸۴۵
پڑوسی	۸۴۷
غیرت	۸۴۸
اسے کیا کہیے	۸۴۹
دل ہی تو ہے	۸۵۰
دوسرا پہلو	۸۵۱
اُس نے کہا تھا	۸۵۲
واپسی	۸۵۴
کرامت	۸۵۹
’شجرِ ممنوعہ‘ کے سائے میں	۸۶۰
الارض اللہ	۸۶۱
سیاست	۸۶۳
صنعتی شہر	۸۶۴
کراچی	۸۶۵
وطن کی فکر کر ناداں۔۔۔	۸۶۷
دعا	۸۷۱

پیغامِ افغانی	۸۷۲
کشمیر	۸۷۳
موجد کا سرورق	۸۷۵
پاک ہند مشاعرہ	۸۷۶
پاک ہند دوستی	۸۷۷
ہم اردو کے شاعر	۸۷۸
ایک شاعر کے نام	۸۷۹
متفرق اشعار	۸۸۱
غمِ رفتگاں	
آج فراق بھی گئے	۸۸۲
ضمیر کی موت	۸۸۳
سکندر علی وجد	۸۸۴
عزیز قیسی	۸۸۸
بینش سلیمی	۸۹۰
ماتمِ یک شہرِ آرزو	۸۹۱
غمِ معراج (نظمیں)	۸۹۳ تا ۹۵۲

شہرِ علم

وہ ذات، شہرِ علم، تو ہم طالبانِ علم
ہم ذرہ ہائے خاک ہیں، وہ آسمانِ علم

ہم کیا ہیں ۔۔۔ ایک لفظ ۔۔۔ معانی سے بے خبر
ہم کیا سمجھ سکیں گے رموزِ جہانِ علم

سوچو تو ہم ہیں کب سے اساطیر کے اسیر
کب سے ہے اپنے جہل پہ ہم کو گمانِ علم

قرآں ہے، اس کے نطق کا اِک زندہ معجزہ
اقرأ سے تا بہ آیتِ آخر، زبانِ علم

اسرارِ کائنات کا عقدہ کشا وہی
وہ راز دانِ وسعتِ کون و مکانِ علم

ہم جستجوئے حق میں رواں اس کے سائے سائے
ہم کو اُسی کے نقشِ کفِ پا، نشانِ علم

بابِ علم

بے اماں زمین پر، سایۂ اماں تھا وہ
ایک اور آسماں، زیرِ آسماں تھا وہ

آئینہ در آئینہ، اس کا عکس دیکھنا
سوچنا کہ فرد تھا کہ ایک کارواں تھا وہ

وہم اور گماں کی، گھپ سیاہ رات میں
مشعلِ یقیں تھا وہ، صبح کی اذاں تھا وہ

حرف و لب کے درمیان جب بھی فاصلے بڑھے
خامشی گواہ ہے، عہد کی زباں تھا وہ

وہ جسے کہا گیا، باب شہر علم کا
اپنے لفظ میں علم کا جہاں تھا وہ

دیکھیے تو آدمی، سوچیے تو اور کچھ
یعنی ایک بوند میں، بحرِ بیکراں تھا وہ

کربلا

کربلا تیرے شہیدوں کا لہو بہہ تو گیا
اس لہو سے زندگی کا اِک نیا جوہر کھلا
آدمی جو پیکرِ خاکی تھا، اِک ذرّہ ہی تھا
اپنے خوں میں تپ کے ہر اِک ذرّہ سورج بن گیا
اب یہ سورج ہے زمیں کا رہنما اے کربلا

ظالم و مظلوم کی جب بھی چھڑی دنیا میں جنگ
کربلا کے اِن شہیدوں کا لہو لایا ہے رنگ
مقتلوں میں زندگی کی اس طرح جاگی امنگ
آئینوں کی حیرتوں پر ہو گئے پتھر بھی دنگ
حق پرستوں کو ہے یہ تیری عطا اے کربلا

کربلا میں، دین کے سردار نے سر تو دیا
ماں نے بیٹا، بھائی نے اپنا برادر تو دیا
بہرِ ناموسِ وفا، بیوی نے شوہر تو دیا
ظالموں نے خوں کے رشتوں کو جدا کر تو دیا
تو نے ان رشتوں کو محکم کر دیا اے کربلا

کربلا تو زندگی کی اِک نئی تصویر ہے
آدمیت کے سنہرے خواب کی تعبیر ہے
بندگی کی سر بلندی، عشق کی تقدیر ہے
تو زمیں پر آسماں کی وہ امٹ تحریر ہے
جس کو دل کے خون سے لکھا گیا اے کربلا

○

میں سو رہا تھا اور کوئی بیدار مجھ میں تھا
شاید ابھی تلک مرا پندار مجھ میں تھا

وہ کج ادا سہی، مری پہچان بھی تھا وہ
اپنے نشے میں مست جو فن کار مجھ میں تھا

میں خود کو بھولتا بھی تو کس طرح بھولتا
اک شخص تھا کہ آئینہ بردار مجھ میں تھا

اپنے خلاف ہو کہ کسی کے خلاف ہو
میرا وجود برسرِ پیکار مجھ میں تھا

شاید اسی سبب سے توازن سا مجھ میں ہے
اک محتسب لیے ہوئے تلوار مجھ میں تھا

اپنے کسی عمل پہ ندامت نہیں مجھے
تھا نیک دل بہت جو گنہگار مجھ میں تھا

○

در پردہ اپنے عہد کی تقدیر دیکھ لی
آیات میں چھپی ہوئی زنجیر دیکھ لی

معنی کے در پہ لفظ بھی ہیں قفل کی طرح
اے کاتبِ ازل، تری تحریر دیکھ لی

تھے دامنِ سراب میں صحرا بجھے ہوئے
خوش فہمیوں کے خواب کی تعبیر دیکھ لی

زنداں ہیں اور بھی پسِ زنداں بنے ہوئے
اِس سر زمیں پہ خوبیٔ تعمیر دیکھ لی

اچھا کیا کہ آپ نے قشقہ لگا لیا
اپنی نجات ہم نے بھی اے میرؔ دیکھ لی

O

میں کون ہوں، کیا ہوں مری تحریر کہے گی
خاموش رہوں تو مری تصویر کہے گی

کیوں سرخ ہیں نقشِ کفِ پا، راہِ طلب میں
کوئی نہ کہے، پاؤں کی زنجیر کہے گی

ہم کو تو سدا نیند میں چلنے کا مرض ہے
پہنچیں گے کہاں، خواب کی تعبیر کہے گی

الفاظ کی محتاج نہیں دل کی حکایت
خاموشی میں پنہاں ہے جو تقریر کہے گی

کیا راز ہے پوشیدہ پسِ پردۂ تقدیر
اس دور کے انسان کی تدبیر کہے گی

O

اب شاعری شعور کا پَرتَو نہیں رہی
جو دل کو زندہ رکھتی تھی، وہ ضو نہیں رہی

کاغذ، کفن کی طرح ہے لفظوں کی لاش پر
معنی میں روحِ آگہیِ نو نہیں رہی

کہنے کو آدمی ہیں مگر بت کی طرح چپ
زندہ ہیں، زندگی کی تگ و دو نہیں رہی

گرمِ ستیز رکھے جو دہقان کا لہو
نانِ جویں میں وہ تپشِ جو نہیں رہی

ڈوبا ہے جب سے ایک نظریے کا آفتاب
سینے میں روشنی کی قلمرو نہیں رہی

O

صبح سے شام ہوئی آج اسی الجھن میں
میرے ایک دوست کی صورت تھی مرے دشمن میں

سوچتا تھا کہ بھری دھوپ میں سایہ دے گا
میں نے ایک پیڑ لگایا تھا کھلے آنگن میں

آئینہ خانۂ حالات ہیں میرے اشعار
میرا ہر دور نظر آئے گا میرے فن میں

آج احساس ہوا شاخ، ثمردار بھی ہے
ایک پتھر جو گرا آ کے مرے آنگن میں

شعر پردہ بھی ہے، کردار کا آئینہ بھی
دیکھنا ہو تو مجھے دیکھ لو میرے فن میں

O

اِک وقت اس کے عشق میں دیوانہ میں بھی تھا
وہ شمعِ بزمِ شعر تھی، پروانہ میں بھی تھا

اب وہ ہے بے نیاز تو شکوہ نہیں مجھے
اپنی انا کے ساتھ تو روزانہ میں بھی تھا

اُس شوخ نوجواں کو نصیحت میں کیا کروں
برسوں کسی کی تاک میں دُزدانہ میں بھی تھا

لکھتا کوئی تو دیکھتا کردار بھی مرا
عنوان کے بغیر اِک افسانہ میں بھی تھا

ٹوٹے ہزار بت تو بنا خانۂ خدا
میں بھی ہوں پاش پاش، صنم خانہ میں بھی تھا

O

جب بھی اُسے دیکھوں، وہ نیا ہی نظر آئے
ہر شخص سے وہ شخص جدا ہی نظر آئے

ہاں ایک نظر تم بھی اُسے دیکھو تو شاید
تم کو مری ناکردہ گناہی نظر آئے

مرمر سے بدن پر وہ قبا آبِ رواں سی
وہ حسن کہ آپ اپنی گواہی نظر آئے

جلوت میں گزر جاتی ہے جس دل پہ قیامت
خلوت میں اُسے کیوں نہ تباہی نظر آئے

معلوم ہوا جب سے کہ یہ شہر ہے اس کا
یہ شہر مجھے 'شہرِ سبا' ہی نظر آئے

O

وہ میری آنکھوں میں یوں بسا ہے کہ صبح دیکھوں نہ شام دیکھوں
اُسی کی باتیں کروں ہمیشہ، اُسی کا چہرہ مدام دیکھوں

وہ اپنے تکیے پر سر ٹکائے مرے تصور میں گم ہو شاید
میں اپنے سینے پہ اُس کی سانسوں کا لہلہاتا خرام دیکھوں

وہ اپنی سج دھج میں اپنے ذوقِ جمال کا آئینہ ہے لیکن
میں اُس کی آرائشوں میں اپنی نگاہ کا التزام دیکھوں

کبھی کبھی ایسا خواب دیکھوں جو حد سے آگے نکل گیا ہو
تو اس کے کردار کے مقابل، میں اپنا کردار خام دیکھوں

کھلے سمندر میں ڈوب کر بھی، عجیب عالم ہے تشنگی کا
میں خود کو بھی تشنہ کام پاؤں اور اس کو بھی تشنہ کام دیکھوں

وہ اپنے گھر کے حسین آنگن میں اپنے بچوں کے درمیاں گم
میں ایسے عالم میں جب بھی دیکھوں اسے بصد احترام دیکھوں

O

تم ہو بے گھر اور ہم ہیں اپنے گھر میں اجنبی
اِس جہاں میں سب ہیں حرفِ مختصر میں اجنبی

خواب بن کر جس کی آنکھوں میں رہے ہوں عمر بھر
آج ٹھہرے اُس کی چشمِ معتبر میں اجنبی

ہم وطن، ہم مدرسہ، ہم عمر اب ملتے ہیں یوں
مل رہے ہوں جس طرح راہِ سفر میں اجنبی

ہجرتی تم بھی وہاں ہو، ہجرتی ہم بھی یہاں
سوچیے تو سب ہیں ہم اپنی نظر میں اجنبی

متفرق اشعار

ہوا چلی تھی مجھے کچھ گماں ہوا ایسا
ہلے ہوں برگ، ابھی تک کہاں ہوا ایسا

حضورِ شاہ کھلے جھوٹ پر جو چیخ اٹھے
ہمارے شہر میں کوئی جواں ہوا ایسا؟

کھلے ہیں شاخ پہ گل، جیسے دار پر لاشیں
بھری بہار میں گلشن خزاں ہوا ایسا؟

O

ہمارے شہر میں اب آنکھ پیراہن پہ رہتی ہے
کسی دستِ زلیخا پر نہیں دامن پہ رہتی ہے

وہ اعجازِ کلیمی ہو کہ سحر سامری کچھ ہو
عصاء جب ناگ بنتا ہے نظر ناگن پہ رہتی ہے

آئینہ در آئینہ

(منظوم سوانح حیات کی محرک ایک نظم)

اِس بار وہ ملا تو عجب اُس کا رنگ تھا
الفاظ میں ترنگ نہ لہجہ دبنگ تھا
اِک سوچ تھی کہ بکھری ہوئی خال وخد میں تھی
اِک درد تھا کہ جس کا شہید انگ انگ تھا
اِک آگ تھی کہ راکھ میں پوشیدہ تھی کہیں
اِک جسم تھا کہ روح سے مصروفِ جنگ تھا

میں نے کہا کہ یار تجھے کیا ہوا ہے یہ
اُس نے کہا کہ عمرِ رواں کی عطا ہے یہ
میں نے کہا کہ عمر، رواں تو سبھی کی ہے
اُس نے کہا کہ فکر و نظر کی سزا ہے یہ
میں نے کہا کہ سوچتا رہتا تو میں بھی ہوں
اُس نے کہا کہ آئینہ رکھا ہوا ہے یہ

دیکھا تو میرا اپنا ہی عکس جلی تھا وہ
وہ شخص میں تھا اور حمایت علی تھا وہ

(میری منظوم خودنوشت سوانحِ حیات ’آئینہ در آئینہ‘ تین ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل ہے جو کتاب کی صورت میں ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی۔شاعرؔ)

پتھر

یہ آدمی کا رفیقِ اوّل
یہ اوّلیں پاسبانِ آدم
امینِ خواب وخیالِ آدم
ازل سے انساں کا ہمسفر ہے
یہ سنگ۔۔۔
ہاں اس حقیر پتھر کے کتنے احساں ہیں آدمی پر

جب اس وسیع وعریض دنیا میں
آدم اپنی حسین حوّا کے ساتھ
تنہا تھا اور بے بس
نہ تن پہ کپڑا۔۔۔ نہ پیٹ روٹی
نہ اس کا امکاں نہ اس کی کوئی سبیل۔۔۔ لیکن۔۔۔

کبھی پہاڑوں کے غار۔۔۔ مامن
کبھی درختوں کی چھاؤں۔۔۔ ڈیرا
وہیں بسیرا
کبھی درختوں کے پھل۔۔۔ غذائیں
رسائی جب ہو سکی نہ اُن تک
تو صرف پتھر ہی کام آیا
کبھی کسی جانور سے بچنا ہو۔۔۔
جاں بچانی ہو اپنی یا اپنی ہمسفر کی
تو صرف پتھر ہی کام آیا
یہ سنگ۔۔۔
ہاں اس حقیر پتھر کے کتنے احساں ہیں آدمی پر

اسی نے گھر کا شعور بخشا
اسی نے انسان کو عطا کی۔۔۔
وہ آگ جس نے جہاں کو پرنور کر دیا ہے
وہ لمحہ جب آدمی نے سوچا۔۔۔
(جب اس کے اظہار کو 'زباں' بھی نہ تھی میسر)

نہ 'حرف' حاصل ---نہ 'علم' حاصل
وہ دور جب آدمی ہر اِک شے کو
صرف شکلوں میں دیکھتا تھا
وہ جب بھی کچھ سوچتا
تو شکلوں میں سوچتا تھا
(اور اپنی صورت بھی صرف پانی میں دیکھتا تھا)
اسے خبر بھی نہ تھی---وہ کیا ہے؟
کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا یہاں سے؟
بنائی کس نے یہ آب وگل کی حسین دنیا؟
حسیں پرندوں، حسیں دشت وجبل کا خالق ہے کون آخر؟
کہاں وہ رب ہے؟

یہ سوچ جب جب بھی محورِ فکر بن گئی ہے
تو پتھروں میں اتر کے محفوظ ہوگئی ہے
ہزار ہا سال تک یہ پتھر
دماغ ودل کا امیں رہا ہے
خدا کے پیکر میں ڈھل کے---

ہر آدمی کے دل میں مکیں رہا ہے
یہ سنگ---
وہ آئینہ ہے جس میں
خدا کا ہر عکس ہے منور

یہ سنگ---
ہاں اس حقیر پتھر کے کتنے احساں ہیں آدمی پر
یہ ایک پتھر
یہ آدمی کا رفیقِ اوّل
ازل سے انساں کا ہمسفر ہے
ابد تلک ہمسفر رہے گا

ہوا پہ اختیار کیا

اِسی ہوا کے لمس سے کھلے تھے پھول چارسو
اِسی ہوا کی زد میں بجھ گیا چراغِ آرزو
ہوا سے کس طرح کہوں کہ میری زندگی ہے تو

ہوا کا روپ ایک ہے مگر چلن جدا بھی ہے
نگاہ میں نہیں مگر نگاہ آشنا بھی ہے
کبھی ہے نزدِ جاں بہت، کبھی گریز پا بھی ہے

میں خوش گماں کہ سانس کی طرح وہ میرے ساتھ ہے
مجھے یقیں کہ میرے ہاتھ میں بھی اُس کا ہاتھ ہے
مگر مجھے خبر نہ تھی، ہوا خدا صفات ہے

خدا بھی دلنواز ہے، ہوا بھی دلنواز ہے
خدا بھی بے نیاز ہے، ہوا بھی بے نیاز ہے
خدا بھی ایک راز ہے، ہوا بھی ایک راز ہے

خدا پہ اختیار کیا
ہوا پہ اختیار کیا

درونِ ذات

مرے دل میں ایک خیال تھا
مرے دل میں ایک خیال ہے
وہ کسی کا عکسِ جمال تھا
وہ کسی کا عکس جمال ہے
اُسے ایک نکہتِ گُل کہوں
کہ اپنی رفعتِ گُل کہوں
وہ جو ماہتاب مثال تھا
وہ جو ماہتاب مثال ہے
اُسے پانا کل بھی محال تھا
اُسے پانا اب بھی محال ہے

تسلسل

تم رابعہ بصری ہو کہ میرا ہو کہ مریم
مجھ کو نہیں معلوم کہ تم کون ہو کیا ہو
تم نے مری آیاتِ سخن میں مجھے دیکھا
اور تم وہ حقیقت کہ جو افسانہ نما ہو

ہر دور میں ہم تم تھے، محبت کی علامت
رادھا کی طرح تم، تو کرشنا کی طرح میں
ہم میں وہی رشتہ ہے، جو ہے ارض و سما میں
تم پاربتی ٥ جیسی ہو، شیوا ٥ کی طرح میں

٥ زرخیزی کی دیوی اور تسلسلِ حیات کا دیوتا

ہم آئینہ و عکس کے مانند ہیں لیکن
میں دیدۂ بیدار ہوں اور خواب صفت تم
دو دل ہیں اور اِک عالم ہجراں کی مسافت
خورشید صفت میں ہوں تو مہتاب صفت تم

اک موجِ نسیمِ سحری ہے کہ رواں ہے
جو آنکھ سے اوجھل سہی، نزدِ رگِ جاں ہے

نروان کے بعد

یہ سب اُس وقت کی باتیں ہیں
جب کرشن اور رادھا کی کہانی
اِک حقیقت تھی
مجھے بھی ایک عورت سے محبت تھی

وہ جب مرلی کی دھن پر رقص کرتی تھی
تو اس کے جسم کا ہر زاویہ، ہر قوس، ہر انداز
اس کے رقص کا ہر دائرہ، ہر روپ
رنگ و نور کی بارش سے
اِس دھرتی کو اک گلزار کر دیتا
مجھے سرشار کر دیتا

وہ جب لہرا کے رادھا کی طرح
سینے سے لگ جاتی

تو اُس کا لمس
نشہ بن کے رگ رگ میں اتر جاتا
لہو کو آگ کر جاتا

وہ جب خوشبو میں رچ کر
بسترِ گل پر بکھر جاتی
تو بِندرابن میں جیسے
جنتِ گم گشتہ کی تصویر اتر آتی
زمیں پر آدم و حوا کی چاہت کو
نیا عنوان مل جاتا
نیا پیمان مل جاتا

مگر اب کرشن ہے کوئی نہ رادھا ہے
میں اک پتھر کا بت ہوں اور مشتِ خاک ہے وہ بھی
میں اپنے گیان میں کھویا ہوا سڑکوں پہ آوارہ
اور اپنے گھر میں، اک چولہے کی ٹھنڈی راکھ ہے وہ بھی
میں گوتم ۔۔۔ وہ یشودھا ہے

قدرِ مشترک

میں بھی تنہا ہوں، تم بھی تنہا ہو
میں بھی چاہوں کہ کوئی اپنا ہو
ایسا اپنا کہ جب یہ تنہائی
زندگی کا عذاب بن جائے
میری آنکھوں میں اُس کا سپنا ہو
اور شاید اسی لیے میں نے
تم کو اپنا لیا ۔۔۔ خدا کی طرح

من تو شدم

عجیب بات ہے، ہم دور دور رہ کر بھی
نگاہ و دل میں کوئی فاصلہ نہیں رکھتے
مثالِ آئینہ و عکس رو برو ہیں سدا
گواہ بھی کوئی اپنے سوا نہیں رکھتے

بس ایک لفظ، جو میں نے کہا، نہ تم نے سنا
ہمارے دل میں ہے، روشن کسی وحی کی طرح
وہ کیفیت جو فرشتوں کو بھی نصیب نہیں
ہمیں ملی ہے، خدا کے کسی نبی کی طرح

یہ دل کا راز ہے، دل میں رہے تو اچھا ہے
نظر کی بات، نظر ہی کہے تو اچھا ہے

تو من شدی

اِس بار تو کچھ یوں ہے کہ دن ہے نہ کوئی رات
قابو ہی میں آتے نہیں اُڑتے ہوئے لمحات

اِک عالمِ افسوں ہے کہ یہ خواب کی دنیا
کس طرح سے بدلی دلِ بے تاب کی دنیا

اِک کاہکشاں سی ہے کہ رقصاں ہے نظر میں
منزل یہ عجب آئی محبت کے سفر میں

پہلو میں ہو تم یا ملکوتی کوئی پیکر
یا میرا تصور ہے، بصد رنگ مصوّر

o

اِک کیفیتِ نشہ ہے بیدار بدن میں
کھلتے ہوئے پھولوں کی ہے مہکار بدن میں

یہ حسن، جو آئینۂ جنت رہا برسوں
یہ جسم جو عنوانِ عبادت رہا برسوں

یوں مجھ پہ برس جائے گا سوچا بھی نہیں تھا
انگ انگ میں بس جائے گا سوچا بھی نہیں تھا

عہدِ وفا

کہا گیا ہے کہ میں اپنے دل کی فکر کروں
کہ اب یہ اور غمِ زندگی سہے نہ سہے
تھکا ہوا ہے بدن اور چل رہا ہوں میں
نہ جانے اب یہ مرا ہمسفر رہے نہ رہے

سفر میں چھوٹ بھی جاتے ہیں ہمسفر لیکن
وہ ایک شخص کہ جس کی یہ دل، امانت ہے
بچھڑ گیا تو میں کیا منہ دکھاؤں گا اس کو
جو ہے تو بس یہی اندیشۂ ندامت ہے

خدا کرے وہ سلامت رہے جہاں بھی رہے
میں خاک ہو بھی گیا تو فنا نہیں ہوں گا
ہوائیں کرتی ہیں جیسے سدا طوافِ حرم
میں اس کے پاس رہوں گا، جدا نہیں ہوں گا

کبھی میں خواب کی صورت رہوں گا آنکھوں میں
کبھی میں کوئی حسیں یاد بن کے آؤں گا
وہ اشک جو میرے غم میں کبھی اُمڈ آئیں
میں اُن میں 'عہدِ وفا' بن کے مسکراؤں گا

(ہرمن ہسپتال۔ ہیوسٹن، امریکہ میں کہی گئی)

ضرورت

کبھی کبھی مجھے ایسا گمان ہوتا ہے
کہ اپنا سچ بھی اسی 'جھوٹ' ہی کا حصہ ہے
جو اس زمین پہ دو اولیں دلوں نے کبھی
لب و نگاہ سے باہم کہا سنا ہو گا
اور اپنی اپنی ضرورت کو دے کے، پیار کا نام
بدن کی پیاس کو سیراب کر لیا ہو گا

غور طلب

سنا ہے اُس نے کسی اور کی طرف دیکھا
اُسی نگاہ سے جو مجھ پہ مہرباں تھی کبھی
یہ بات غور طلب ہے مگر میں سوچتا ہوں
وہ کون تھی جو مری رات میہمان رہی؟
تو پھر میں کس لیے اتنا ہوں بدگماں اُس سے!
یہ میری خود غرضی ہے کہ اس کی حق طلبی؟

اب وقت بہت کم ہے

اب وقت بہت کم ہے
ملنا ہے تو مل جاؤ

تم کو تو خبر ہوگی
ہم عمر کی کس منزل
کس موڑ پہ آ پہنچے
اس موڑ پہ اکثر دل
مل کر بھی نہیں ملتے
بس دیکھتے رہتے ہیں
اور سوچتے رہتے ہیں
پتھر کی طرح گم سم

اب وقت بہت کم ہے
ملنا ہے تو مل جاؤ
ایسا نہ ہو یہ موسم
یہ عالمِ بے خوابی
ہاتھوں سے نکل جائے
یہ شمع پگھل جائے
اور دیکھتے رہ جائیں
اور سوچتے رہ جائیں
پتھر کی طرح ہم تم

خوفِ ہمسایہ

آج کچھ دیر سے مرے دل میں
ایک خواہش مچل رہی ہے بہت
جسم میں ایک لہر ہے بیدار
اور خموشی بھی کھل رہی ہے بہت
ایک محبس کی ہے فضا گھر میں
سانس بھی تیز چل رہی ہے بہت
بھیگا بھیگا سا ہوں پسینے میں
دل میں اِک شئے پگھل رہی ہے بہت
کوئی بے نام بے کلی ہے کہیں
اپنی حد سے نکل رہی ہے بہت

جی میں آتا ہے جا کے سڑکوں پر
حدِ تہذیب سے نکل جاؤں
ایک نعرہ لگاؤں مستانہ
لڑکھڑاؤں کبھی سنبھل جاؤں

کان پر ہاتھ رکھ کے، کھینچوں تان
اور کبھی قہقہوں میں ڈھل جاؤں
چھوٹے بچوں کی طرح جا بے جا
بیٹھ جاؤں کہیں، اُچھل جاؤں
روح پر سے اُتار دوں ہر بوجھ
اوّلیں آدمی میں ڈھل جاؤں

یہ مگر کون دیکھتا ہے مجھے
کوئی سایہ سا ایستادہ ہے
کون ہے اُس طرف پسِ چلمن؟
کوئی انساں ہے یا لبادہ ہے
دل میں جو ہے مرے، ابھی تک وہ
ایک حسرت ہے اِک ارادہ ہے
ہے وہ تہذیب کے خلاف ضرور
کیا کروں میں، خمارِ بادہ ہے
دل میں خوفِ خدا بھی ہے لیکن
خوفِ ہمسایہ کچھ زیادہ ہے

پڑوسی

میں جانتا ہوں، گناہ کیا ہے، ثواب کیا ہے
گناہ کیجئے تو پھر خدا کا عتاب کیا ہے
مگر میں انساں ہوں، ابنِ آدم، مجھے خبر ہے
ازل سے میری سرشتِ خانہ خراب کیا ہے

گناہ ہوتے ہیں اب بھی سرزد، مگر یہ سوچو
کہ جب کبھی دل میں کوئی شیطان سر اٹھائے
تو ارتکابِ گناہ و خوفِ خدا سے پہلے
پڑوسیوں کے خیال سے جسم کانپ جائے

یہ سچ ہے، تہذیب کی عطا ہے مرا پڑوسی
مگر خدا سے بھی کیا بڑا ہے مرا پڑوسی؟

غیرت

ان کا قصور صرف یہی تھا کہ ان کے ساتھ
تا دور، راستے میں کوئی تیسرا نہ تھا
جب تیسرا ملا تو یہ چھوٹا سا واقعہ
یارانِ شہر کے لیے افسانہ بن گیا
اور آج یہ خبر کسی اخبار میں پڑھی
اِک نوجواں نے طیش میں اِک قتل کر دیا

اِسے کیا کہیے؟

وہ کہہ رہے تھے کہ سرکار یہ نئی سوغات
خدا نے ہم کو عطا کی ہے ایک ایسی رات
کہ جب ہمارے لبوں پر تھی اپنے پیار کی بات
کہ جب ہماری محبت کو مل رہا تھا ثبات
ہمارے سامنے موجود تھی خدا کی ذات

وہ کہہ رہے تھے ۔۔۔مگر کوئی مانتا ہی نہ تھا
خدا کو جیسے کوئی شخص جانتا ہی نہ تھا

دل ہی تو ہے

عمر کچھ ہو مگر یہ دل ۔۔۔ جاناں
وقت سے بے نیاز ہوتا ہے
لب پہ حرفِ سوال ہو کہ نہ ہو
دل کا دامن، دراز ہوتا ہے

آج ہی کہہ رہا تھا میں تم سے
تم کو مریم بنائے رکھوں گا
اک مقدس کتاب کے مانند
رحل پر ہی سجائے رکھوں گا

اور اب رحل بن گئی آغوش
اور اب ہم ہیں اور دلِ بے تاب
ہر تعین سے ہو کے بے پروا
میرے زیرِ مطالعہ ہے کتاب

دوسرا پہلو

جناب والا
گواہیاں چشم دید ہوں تو
گماں کا امکان ہی کہاں ہے
اور اِس گناہِ عظیم میں تو
ہماری تہذیب کا زیاں ہے
اِنہیں سزا دیجے باری باری
سزا ۔۔۔ سرِ عام سنگ ساری
مگر ۔۔۔ اجازت اگر عطا ہو
تو ایک نکتہ ہے، اِک گزارش
کسی کی خلوت میں چوری چوری
یہ تانکنے جھانکنے کی کوشش
ہماری تہذیب میں روا ہے؟
نہیں۔ تو پھر اس کی کیا سزا ہے؟
جناب والا

اُس نے کہا تھا

اُس نے کہا تھا
میرے بدن کو مت چھونا
جسم میں آگ بھری ہوتی ہے
میں نے کہا۔۔۔اس آگ میں جل کر
دل کی شاخ ہری ہوتی ہے

اُس نے کہا تھا
میرے خواب امانت ہیں
اُس میں خیانت ہو جائے تو؟
میں نے کہا۔۔۔اِک چور کے ہاتھوں
خواب حقیقت ہو جائے تو؟

اُس نے کہا تھا
بات نہ افسانہ ہو جائے
دل کی دل میں رہے تو اچھا
میں نے کہا۔۔۔ یہ راز ہمیشہ۔۔۔
آنکھ سے آنکھ کہے تو اچھا

اُس نے کہا تھا۔۔۔
اور پھر اس نے جو بھی کہا
میری آنکھوں میں رقصاں تھا
اور پھر دل کی شاخ ہری تھی
اور پھر کوئی راز کہاں تھا

واپسی

میں آج بے حد پیے ہوئے ہوں
شراب یا زہر۔۔۔جو بھی سمجھو
میں چاہتا ہوں کہ اُس جہنم کو سرد کر دوں
جو میرے دل میں دہک رہا ہے
مگر یہ ممکن نہیں ہے شاید
تمہارا چہرہ۔۔۔یہ مسکراتا حسین چہرہ
جو میرے ہاتھوں کے رحل میں اک کتاب کی طرح روبرو ہے
نگاہ سے دور ہو رہا ہے
میں اپنی آنکھوں کی شبنمی روشنی کا منظر کسے دکھاؤں
مجھے کچھ ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے برسوں
کتابِ رخ کی تمام آیات

خال و خط کے تمام اعراب
کہکشاں کی طرح فضا میں بکھر رہے ہیں
میں اک خلا میں اتر رہا ہوں
میں آج تم سے بچھڑ رہا ہوں

میں جا رہا ہوں
کچھ اتنا تنہا کہ میرا سایہ تلک مرا ہم سفر نہیں ہے
اِسے بھی میں اُس حسین خلوت میں چھوڑ آیا
جہاں ہمارے دل ایک ہو کر بھی
ایک حدِ وفا کی تکریم کر رہے تھے
سپردگی کے نشے میں ڈوبے ہوئے تھے لیکن
بدن کی تعظیم کر رہے تھے

عجیب عالم تھا قلب و جاں کا
عجیب تھی کیفیت دلوں کی
طواف کرتے رہے مگر آرزوئے جنت نہ کی ذرا بھی
کچھ ایسی بے لاگ تھی عبادت کہ محو حیرت رہا خدا بھی

عجیب تھی یہ اکائی جس میں دوئی کی تائید ہو رہی تھی
وصال کی سرحدوں میں ہم آغوشیوں کی تردید ہو رہی تھی
تمہیں خبر ہے
میں اُس حسیں گوشہ محبت میں ۔۔۔ آخر شب
جب اپنا سایہ بچھا کے تنہا ہی سو گیا تھا
تو اپنے خوابِ وصال پر آپ اک حسیں طنز ہو گیا تھا
وہ خواب جس کے فراق میں بے قرار آنکھیں
ہزار سنگین مرحلوں سے گزر کے پتھر کی ہو گئی تھیں
ہزار چہروں میں ایک چہرہ تلاش کرتی
نہ جانے کتنے برس سے در در کی ہو گئی تھیں

وہ ایک چہرہ ۔۔۔ وہ ایک آوارۂ محبت کا خوابِ آخر
جو میری آنکھوں کا گم شدہ خوابِ اولیں تھا
جو میرے دل میں خدا کے مانند جاگزیں تھا
مجھے ملا بھی تو یوں کہ جیسے
زمیں سے آکاش مل رہا ہو

تم اے محبت بھرے دلوں کی حسین دیوی
(تم اے خدائے جمال) اب تک
نہ جانے مجھ ایسے کتنے بندوں کی سجدہ گاہِ وفا رہی ہو
نہ جانے وہ کون ہو گا جس کو
کرشن کی طرح تم نے چاہا
مجھے کسی کی خبر نہیں ہے
میں چاہتا بھی نہیں کہ جانوں
کسی کو اپنے سوا بھی مانوں

تم اے محبت بھرے دلوں کی حسین دیوی
تم اپنے مندر میں ایک پتھر کی مورتی بن کے مطمئن ہو؟
پجاریوں کے بھجن تمہاری انا کو تسکین دے رہے ہوں
تو اپنے مندر میں گونجتی خوش گماں نوائیں تمہیں مبارک

میں جا رہا ہوں
کچھ اتنا تنہا کہ میرا سایہ بھی اب مرا ہم سفر نہیں ہے
میں اپنا سایہ تمہارے قدموں میں چھوڑ آیا

جہاں بھی جاؤ
جہاں رہو تم
تمہارے قدموں میں میرا سایہ بچھا رہے گا
تمہارے سائے سے میرا سایہ ملا رہے گا

کرامت

آؤ تمہیں اعجاز دکھائیں
جسم سے جسم ملے تو کیسے
رات چراغاں ہو جاتی ہے
آگ میں کود پڑیں تو اب بھی
آگ گلستاں ہو جاتی ہے
آؤ تمہیں یہ راز بتائیں
ایک عصا کی ضرب سے کیسے
دریا میں رستہ بنتا ہے
پرزے پرزے ہو کر کیسے
کاغذ گلدستہ بنتا ہے
آؤ تمہارے ناز اٹھائیں
سوئی رہو تم، ہم جاگیں گے
خواب میں جب کوئی آتا ہے
دھڑکن تیز تو ہو جاتی ہے
لیکن وقت ٹھہر جاتا ہے

'شجرِ ممنوعہ' کے سائے میں

ہم اُس آدم کے بیٹے ہیں
جو اپنی ایک حوا کے لیے جنت کو چھوڑ آئے
خدا کا ہر غم و غصہ سہا
ہر اک سزا کاٹی
مگر حوا کو دل کے پاس رکھا
اور پھر اس کی رفاقت میں
یہ دنیا۔۔۔
یہ پہاڑوں اور دریاؤں
درندوں اور پرندوں
دشت و صحرا اور سمندر سے بھری دنیا
جہاں زہریلے وحشی جانور بھی تھے
جہاں ہر ہر قدم پر موت کا خطرہ تھا
اُس کو۔۔۔اپنی حوا کے لیے
جنت بنا ڈالا
ہم اُس آدم کے بیٹے ہیں

الارض الاللّٰہ

(ساری زمین خدا کی ہے)

ہر ملک میرا ملک ہے ० ہر شہر میرا شہر
میرے خدا کا ملک ہے، میرے خدا کا شہر
میں آدمی ہوں کہتے ہیں، آدم کی نسل ہوں
جنت کی گود میں جو پلی ہے، وہ فصل ہوں
میری زمیں کی طرح میرا آسماں بھی ہے
اور مجھ پہ جو خدا کی طرح مہرباں بھی ہے
ہے کون میری طرح حسیں کائنات میں
اللہ کا جمال ہے میری صفات میں
میرے لیے ہیں سارے جہانوں کے خشک و تر
'بعد از خدا عظیم ہوں 'میں'، قصہ مختصر'

جب یہ سند ہے پاس تو ویزا کی فکر کیا
اللہ کی زمین پہ 'پیزا' کی فکر کیا
زحمتِ سفر اٹھایئے، لے کر خدا کا نام
جس جا ملے گی چھاؤں، کریں گے وہیں قیام
امریکہ ہو کہ روس ہو یورپ ہو یا عرب
پوچھے کوئی تو ساتھ ہے یہ شجرۂ نسب
آدم کے جانشیں ہیں، شریکِ خدائی ہیں
دنیا میں جتنے لوگ ہیں، سب بھائی بھائی ہیں
مذہب جدا جدا سہی، اللہ ایک ہے
منزل کی سمت جاتی ہے جو راہ، ایک ہے

لیکن یہ کیا، یہ کس نے کہا ہے جواب میں
'ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں'
(غالب)

○ہر ملک ملکِ ماست ملکِ خدائے ماست (اقبال)

سیاست

یہ سیاست بھی کیا عجب شے ہے
میں سمجھتا ہوں تم بھی حق پر ہو
تم سمجھتے ہو میں بھی حق پر ہوں
میں تمہیں مار دوں تو تم ہو شہید
تم مجھے مار دو تو میں ہوں شہید
میں ہوں یا تم، یہاں بہ فضلِ خدا
سب شہیدوں کی صف میں شامل ہیں
سب یزیدوں کی صف میں شامل ہیں

صنعتی شہر

دوسرے فٹ پاتھ پر تھا ایستادہ میرا یار
میں نے ہنس کر کچھ کہا اور اس نے ہنس کر کچھ کہا
راہ میں کاریں رواں تھیں، یوں قطار اندر قطار

دیر تک ہم اپنے ہاتھوں کو ہلاتے رہ گئے
دور ہی سے دیکھتے اور مسکراتے رہ گئے

کراچی

عجیب شہر ہے — خدا کا قہر ہے
ہر ایک آدمی — متاعِ زندگی
لٹا رہا ہے یوں — کہ جیسے اسکا خوں
بدن کا بوجھ ہے — وطن کا بوجھ ہے

عجیب دور ہے — فضا ہی اور ہے
نگہ میں قہر ہے — دلوں میں زہر ہے
جو اہلِ دین ہیں — منافقین ہیں
جو خرقہ پوش ہیں — وہ دیں فروش ہیں

عجیب لوگ ہیں زمیں کا روگ ہیں
خدا کے نام پر جلا رہے ہیں گھر
کہ جیسے ہر مکاں ہے نقشِ رائیگاں
کہ جیسے یہ زمیں خدا کا گھر نہیں

عجیب رنگ ہے عجیب ڈھنگ ہے
کہیں تو کیا کہیں سنیں تو کیا سنیں
چراغ بجھ گئے دماغ بجھ گئے
نہ حرف وصوت ہے جو ہے سو موت ہے

خدا کہاں نہیں
مگر یہاں نہیں

وطن کی فکر کر ناداں۔۔۔

ابھی تو کچھ نہیں ہوا، ابھی تو ابتداء ہے یہ

اور اب وہ وقت آئے گا کہ ساری قوم روئے گی
اور اپنے دل کے داغ اپنے آنسوؤں سے دھوئے گی
یہ سرزمینِ پاک ہے کہ ارضِ کربلا ہے یہ
یہ لوٹ مار، قتل وخوں، ڈکیتیاں، تباہیاں
بموں کی زد پہ ہنستی گاتی جگمگاتی بستیاں
بہشت میں کہاں سے اِک جہنم آ گیا ہے یہ
یہ کس کی آبرو لٹی، یہ کس کا سینہ شق ہوا
یہ کون بھائی ہے کہ جس سے بھائی جاں بحق ہوا
بہن کی زندہ لاش کون یوں بھنبھوڑتا ہے یہ
یہ خودکشی کی مشق ہے کہ جنگِ خانہ ساز ہے
کہ غزنوی کمالِ فن بصورتِ ایاز ہے
جو ہم میں جاں بہ لب ہے وہ ضمیر پوچھتا ہے یہ

ہم اپنے ہاتھ سے ہی اپنا جسم کاٹتے بھی ہیں
پھر اپنی ہی زباں سے اپنا خون چاٹتے بھی ہیں
اگر ہے یہ جنون تو جنوں کی انتہا ہے یہ

سنا ہے اِس فساد میں پڑوسیوں کا ہاتھ ہے
ہماری اپنی آستیں میں دشمنوں کا ہاتھ ہے
خبر نہیں فسانہ ہے کہ امرِ واقعہ ہے یہ

دیارِ پاک میں سدا عجیب سلسلہ رہا
زبان و دل کے درمیاں ہمیشہ فاصلہ رہا
سیاستِ وطن کا اِک طویل سانحہ ہے یہ

خدا و دیں کے نام پر اگر یہ قوم ایک تھی
تمام امتوں کے درمیان سب سے نیک تھی
تو آج کیوں ہے بدترین، کیوں بہم جدا ہے یہ

سبھی ہیں اِس نفاق کے جواز کی تلاش میں
یہ راز ہے چھپا ہوا سیاستِ معاش میں
علاقہ واریت نہ قومیت کا مسئلہ ہے یہ

شناخت کی ہر ایک شکل معتبر سہی مگر
ثقافتوں کے نام پر یہ فاصلے بہم دگر
شکست خوردگی کا آئینہ ہے اور کیا ہے یہ

وطن میں رہ رہے ہیں اور وطن سے واسطہ نہیں
ہمارے گرد و پیش آج کوئی راستہ نہیں
زمین پر ہیں یوں قدم کہ زیر پا خلا ہے یہ

میں ایک نوجواں کی گفتگو یہاں رقم کروں
مری تو آنکھ نم ہے، آپ کی بھی آنکھ نم کروں
وہ کہہ رہا تھا آپ کے گناہ کی سزا ہے یہ

وہ قوم جو بکھر چکی، وہ کیا سمٹ سکے گی اب
یہ نفرتوں کی ہے خلیج، خاک پٹ سکے گی اب
کہ آپ ہی کے نقشِ پا کا ایک سلسلہ ہے یہ

بزرگ اپنے فیصلوں پہ شرمسار ہوں نہ ہوں
حقیقتوں سے ان کے خواب، ہم کنار ہوں نہ ہوں
ہمیں جو آپ نے دیا وہ کاسۂ گدا ہے یہ

کہا گیا تھا یہ وطن بنا ہے سب کے واسطے
تو ہم پہ آج کیوں ہیں بند زندگی کے راستے
یہ خانہ جنگیاں نہیں، جہادِ للبقا ہے یہ

میں سوچتا ہوں، ایسے نوجواں کو کیا جواب دوں
نظر سے گر چکے جو خواب اُن کو کیسے آب دوں
میں کس طرح کہوں اُسے، فنا کا راستہ ہے یہ

ادھر ہیں اقتدار کے نشے میں چور، حکمراں
ادھر عوام کا ہجوم، منتشر، شرر فشاں
اور ان کے درمیاں وطن کا بختِ نارسا ہے یہ
یہی تو کشمکش تھی جو ہمیں دونیم کر گئی
ہر ایک خواب چھین کر ہمیں یتیم کر گئی
اور اب وطن ہے کیا، ہوا کی زد پہ اک دِیا ہے یہ
خدا بچائے کس طرف مرا وطن چلا ہے یہ
ابھی تو کچھ نہیں ہوا، ابھی تو ابتدا ہے یہ

O

'وطن کی فکر کر ناداں' قیامت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
اقبال

دعا

مرے وطن مری ہر اک دعا ہے تیرے لیے
مرے خدا سے مری التجا ہے تیرے لیے
تجھے وہ غم نہ ملے جو مرے نصیب میں ہیں
مگر یہ بات کہ مجھ سے ہی تو عبارت ہے
مرے قلم کی طرح تو مری امانت ہے
بسا ہوا تو ہر اک شاعر و ادیب میں ہے
یہ ناخدا، جو خدا بن گئے بفضلِ خدا
جو چاہتے ہیں کہ ہو جاؤں میں بھی تجھ سے جدا
مگر وہ عہدِ وفا، جو مری صلیب میں ہے
مرے وطن، مرا سب کچھ تری نگاہ میں ہے
تجھے خبر ہے کہ جو درد میری چاہ میں ہے
نثار تجھ پہ وہ سب، جو دلِ غریب میں ہے

پیغامِ افغانی

خواب جو حضرت جمال الدین افغانی کا تھا
آئینہ ساماں ہے اپنی ترجمانی کے لیے
پین اسلام ازم کی تحریک، وحدت کی نقیب
بین الاسلامی رفاقت کی نشانی کے لیے
شاعرِ مشرق نے بھی چاہا یہی سوچا یہی
مومنوں کے ذہن و دل میں ضوفشانی کے لیے
نت نئی راہیں منور کیں بہ فکر نو بہ نو
پیکرِ الفاظ میں روحِ معانی کے لیے
شعر یہ اقبال کا پیغامِ افغانی بھی ہے
لکھ رہا ہوں اہلِ دل کی نکتہ دانی کے لیے
"نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے"

کشمیر

وہ سر زمیں جسے جنت نظیر کہتے ہیں
وہاں بھی رہتے ہیں اہلِ ضمیر کہتے ہیں
ہماری طرح ہیں وہ بھی غریب ابنِ غریب
مگر وہ دل کے ہیں بے حد امیر کہتے ہیں
ہے ان کے بخت پہ برصغیر بھی نازاں
غریب اہلِ نظر بھی، امیر بھی نازاں

جو قوم علم و عمل کی رہی ہو شیدائی
اسی نے سارے زمانے میں رفعتیں پائی
اسی کو دولت و عزت ملی ہے عظمت بھی
اسی کی سارے جہاں میں ہے آج دارائی
وہ اپنے وقت سے آگے بھی، ہم رکاب بھی ہے
زمیں پہ رہتے ہوئے مثلِ آفتاب بھی ہے

خدا کرے کہ یہ سورج سبھی کے سر چمکے
دیارِ پاک پہ برصغیر پر چمکے
پھر اِک مثال ہو کشمیریوں کی فنکاری
ہر ایک ملک میں کشمیر کا ہنر چمکے
تمام دہر میں عظمت کا اِک نشاں بن جائے
یہ سر زمین بھی اِک روز آسماں بن جائے

موجد کا سرورق

(چاند کی دھوپ)

'نظر لگے نہ کہیں تیرے دست و بازو کو'
کہ میری آنکھ تو حیراں ہے آئینے کی طرح
یہ رنگ رنگ منقش، خیال کی دنیا
جو عکس عکس نمایاں ہے آئینے کی طرح

یہ معجزہ ہے کہ حسنِ کمالِ فن کاری
میں کیا کہوں، مجھے الفاظ ہی نہیں ملتے
جو کر سکیں تری توصیف، شعر کی صورت
وہ شعر، وہ مرے ہم راز ہی نہیں ملتے

میں کب سے دیکھ رہا ہوں سرِورق اپنا
یہ رنگ و نور کا اعجاز ہے کہ شعر کا روپ
میں تجھ میں دیکھ رہا ہوں جو اپنی ذات کا عکس
یہ تیرے چاند کی ضو ہے کہ میرے 'چاند کی دھوپ'
ابھی تو میری نظر ہے حجابِ رنگ میں گم

پاک ہند مشاعرہ

جوش و فراق ہوں کہ وہ سردار و فیض ہوں
احمد ندیم قاسمی یا کیفی اعظمی
جذبی ہوں یا قتیل ہوں، آزاد یا فراز
انسانیت نواز ہے ان سب کی شاعری
فرزندِ ہند و پاک ہیں یہ شاعرانِ قوم
قائم ہے ان کے نام سے اک ربطِ باہمی
یہ شمع جو جلائی گئی ہے بصد خلوص
شمعِ مشاعرہ کہو یا شمعِ دوستی

یارب یہ شمع جلتی رہے ہند و پاک میں
اِک کہکشاں میں ڈھلتی رہے ہند و پاک میں

پاک ہند دوستی

آرزوئے ہند ہے یہ آرزوئے ارضِ پاک
آدمِ خاکی ہیں ہم اور ہے یہی توقیرِ خاک
مسئلہ کوئی ہو، مل جل کے کریں گے اس کو حل
’آ ملے ہیں سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک‘

ہم اردو کے شاعر

ہم کہ اردو زباں کے شاعر ہیں
ہم سے مت پوچھئے کہ ہم کیا ہیں
ہم زمیں پر ہیں آسماں کی طرح
یوں کہیں بھی نہیں پہ ہرجا ہیں

یوں تو کہنے کو ہم عوامی ہیں
اور مزاجاً سبھی ہیں درباری
طاق ہیں ہم قصیدہ گوئی میں
ایک ایک شعر میں ہے تہہ داری
(نامکمل)

ایک شاعر کے نام

(۱)

قصے بہت رقم تھے ثواب و عذاب کے
جب غور سے پڑھا تو ملے نقش آب کے

شیروں کے ساتھ رہتے تھے، قالین کے سہی
جرأت کے اور بھی ہیں کرشمے جناب کے

سر پر محیط ازل سے ہیں جو سات آسماں
اِس دور میں کھلا کہ ہیں گنبد حباب کے

کیا احترامِ علم ہے، پڑھتے ہوئے کبھی
اوراق بھی کٹے نہ پرانی کتاب کے

سب کو دِکھا چکے ہیں، ہتھیلی میں سبز باغ
یونہی نہیں ہے لوگ مرید آں جناب کے

(۲)

کیا ضروری ہے کہ ہر بات کو ہم شعر کریں
بات کہنے کی نہ ہو، پھر بھی رقم شعر کریں

مصرعۂ طرح کا فرمائیں وظیفہ ہر دم
پھر مریضانِ غمِ عشق پہ دم شعر کریں

اپنی حالت پہ لہو رونے لگی عقلِ سلیم
اب تو اپنی ہمہ دانی ہی کا غم شعر کریں

جن کے نزدیک ہے بس قافیہ پیمائی غزل
اپنی غزلوں سے بھلا کیسے وہ کم شعر کریں

متفرق اشعار

اب کیا اُسے کہیں کہ وہ ناداں بھی ہے بہت
انسان ہو نہ ہو پہ مسلماں بھی ہے بہت

o

شاعرِ نظامِ زر کا ہے پروردہ ذوقِ حسن
گیہوں سے بھی حسین ہیں سونے کی بالیاں

o

جب سے بنا ہوا ہے میرا یار مولوی
سر پر سوار رہتے ہیں دو چار مولوی

موسم تو آئے، پھر اُسے منبر پہ دیکھنا
کیا گل کھلائے گا یہ طرح دار مولوی

وہ وقت بھی عذابِ الٰہی سے کم نہیں
جب آدمی میں ہوتا ہے بیدار مولوی

غمِ رفتگاں

آج فراق بھی گئے

جوش کو رو رہے تھے ہم، آج فراق بھی گئے
خون رو اب اۓ چشم نم، آج فراق بھی گئے
نظم کا باغ لٹ گیا، بزمِ غزل اجڑ گئی
دے کے دلوں کو تازہ غم، آج فراق بھی گئے
جس کا ہر ایک شعر تھا اپنی صدی کا آئینہ
ساتھ لیے وہ جامِ جم، آج فراق بھی گئے
'شعلۂ ساز' بجھ گیا، سو گئی 'روحِ کائنات'
'روپ' سنوارے کیا صنم، آج فراق بھی گئے
جوش کے بعد کون ہے 'نغمہ نما' کہیں جسے
ایک فراق کا تھا دم، آج فراق بھی گئے

ضمیر کی موت

اِک پہاڑ ڈھ گیا
بگولے ناچ اُٹھے کہ خاک سر بلند ہو گئی
اِک جہاز غرق ہو کے رہ گیا
ہر ایک موج اچھل پڑی کہ فتح مند ہو گئی
ایک آفتاب شب کی ظلمتوں میں گہہ گیا
ستارے ہنس پڑے کہ روشنی دو چند ہو گئی
چھلک رہا ہے ظرف ظرف
آئینہ ہے حرف حرف
تماشا یہ بھی ہو رہا ہے شعر کی بساط پر
فراق اور جوش اور فیض کی وفات پر

سکندر علی وجد

(حیدرآباد دکن کے مقبول شاعر)

ایک شاعر کہ بہت خوب تھا مخدومؔ کے بعد
وجدؔ تھا اور مجھے محبوب تھا مخدومؔ کے بعد

وہ بھی اُس شہر کا شاعر تھا جہاں کے تھے ولیؔ
ہاں ولیؔ اور سراجؔ اور مرے داؤدؔ و صفیؔ

ہاں وہی شہر جسے کہتے ہیں اورنگ آباد
جہاں ایلورا، اجنتا کی رکھی ہے بنیاد

وہ ایلورا کہ اساطیر کا مخزن کہیے
وہ اجنتا جسے فردوس کا درپن کہیے

وہ جہاں مقبرۂ رابعہ دورانی ہے
ہاں وہی ہند کا جو 'تاج محل' ثانی ہے

وہ جہاں آج تلک ہے مرا بچپن آباد
وہ جہاں میرے بزرگوں کے ہیں مدفن آباد

O

وجدؔ۔۔۔ تا عمر رہا اپنی روایت کا امیں
نظم ہو یا کہ غزل، شعر وہ کہتا تھا حسیں

اُس نے ایلورا، اجنتا پہ لکھی جو نظمیں
اپنے فن کار کی پہچان بنیں وہ نظمیں

حیدرآباد ہو موضوع کہ اورنگ آباد
وجدؔ کے حق میں تھا ہر شہر خجستہ بنیاد

گولکنڈہ ہو کہ ہو قلعۂ دولت آباد
خلد آباد ۔۔۔ کہ دنیا میں ہے 'جنت آباد'

ہو قطبؔ شاہ کی یا بھاگ متی کی سوغات
ملک عنبر کا ہو اعجاز کہ ’لاری‘ کی صفات

چار مینار ہو یا جامعۂ عثمانیہ ہو
یا وہ آرام گہہ خواجۂ گلبرگہ ہو

اپنی تاریخ کا ہر نقش ابھارا اس نے
اپنی مٹی کا ہر اِک قرض اتارا اس نے

O

شادؔ و اقبالؔ ہوں، چکبستؔ و ولیؔ ہوں کہ نظیرؔ
اپنے اشعار میں کھینچی ہے سبھی کی تصویر

چاند بی بی ہو، محمد علی جوہرؔ کہ حُسین
فن بھی ملحوظ رکھا تیغ و قلم کے مابین

تھا وہ گاندھی کا پرستار تو مخدومؔ کا دوست
اشتراکی نہ تھا لیکن رہا مظلوم کا دوست

عدل و انصاف کا شیدائی شریفوں کا رفیق
صاحبِ علم، وطن دوست، رفیقوں کا رفیق

اس کے الفاظ میں ہر نقشِ کہن زندہ ہے
اس کے اشعار میں ہر صاحبِ فن زندہ ہے

عزیز قیسی

(تاریخ وفات ۔ ۳۰/ ستمبر ۱۹۹۲ء، بمبئی)

وہ دوست میرا، وہ یار میرا، عزیز قیسی
وہ شاعرِ طرح دار میرا، عزیز قیسی

وہ روپ بہروپ ہو کہ عکس و صدا کی دنیا
کہ حدِ ادراک سے پرے، ماورا کی دنیا
خیال تا حرف و رنگ، حسنِ ادا کی دنیا
وہ زندگی کے ہر ایک امکاں کا ترجماں تھا

خطابیہ ہو کہ خود کلامی، کوئی ہنر ہو
خواص کا فن ہو یا عوامی، کوئی ہنر ہو
ہر ایک نقش اُس کا تھا دوامی، کوئی ہنر ہو
ہر ایک صنفِ سخن میں اُس کا قلم رواں تھا

ہوئے ہیں ہر ایک دور میں غالبؔ و یگانہؔ
یہ بات الگ ہے کہ اُن کو سمجھا نہیں زمانہ
عزیز قیسی کو بھی حقیقت میں کس نے جانا
زمیں پہ رہ کر بھی اپنی دنیا کا آسماں تھا

وہ شاعرِ طرح دار میرا، عزیز قیسی
وہ دوست میرا، وہ یار میرا، عزیز قیسی

بینش سلیمی

(حیدرآباد سندھ کا ایک بڑا شاعر)

رفیق تھا، غمگسار تھا وہ
ایک آدمی دوست دار تھا وہ
حسین خوابوں کا وہ صنم گر
مصور و حسن کار تھا وہ
دلوں میں رہتا تھا شہر بھر کے
عجب غریب الدیار تھا وہ
بہت کم آمیز و کم سخن تھا
پہ شاعرِ طرح دار تھا وہ
ہر ایک صنفِ سخن کا شیدا
مگر غزل پر نثار تھا وہ
میں اُس کا افسانہ کیا سناؤں
یہی کہ بس میرا یار تھا وہ

ماتمِ یک شہرِ آرزو

نکہتؔ ہمارا یار تو ہم سے بچھڑ گیا
وہ یارِ دل نواز، رفاقت کی آبرو
وہ کیا چلا گیا ہے کہ سکھر اجڑ گیا

نکہتؔ تمہیں تو یاد ہیں وہ رت جگے تمام
وہ محفلیں، مشاعرے، یاروں کے جمگھٹے
سکھر میں ایک جشن سا رہتا تھا صبح و شام

ہم چند یار بیٹھے ہیں جو دلِ فگار سے
اب ہے حسنؔ حمیدی نہ وہ شوکتؔ عابدی
چپ چاپ وہ بھی چل دیے اپنے دیار سے

مظہرؔ جمیل o اور نہ آفاقؔ o ہے وہاں
خالدؔ علیگ o اور نہ مسلم شمیمؔ o ہیں
پنچھی تمام اُڑ گئے، سونا ہے آشیاں

اب گرد و پیش، رات کا ڈیرا ہے اور ہم
کچھ روشنی تھی دل میں تو شمسیؔ o کے نام سے
اب دور تک اجاڑ اندھیرا ہے اور ہم

سکھر کے اہلِ قلم

- o نکہت بریلوی، غزل کا ایک خوبصورت شاعر
- o حسن حمیدی، انقلابی شاعر
- o شوکت عابدی، ترقی پسند شاعر
- o مظہر جمیل، نقاد اور شاعر
- o آفاق صدیقی، سندھی ادب کا مورخ اور شاعر
- o خالد علیگ، انقلابی شاعر
- o مسلم شمیم، ترقی پسند شاعر
- o مہر الٰہی شمسی، ایڈیٹر، روزنامہ 'کلیم' سکھر

غمِ معراج

(اپنی رفیقِ حیات معراج نسیم کی یاد میں)

گرچہ آئینہ در آئینہ ہے ہر سو رُخِ دوست
ایسا تنہائی کا عالم ہے کہ جی جانتا ہے

حمایت علی شاعر

چاند کی دھوپ

معراجِ غم

(اپنی رفیقہ حیات معراج نسیم کی تدفین پر)

اے کینیڈا کی خاک ، امانت ہے تیرے پاس
میری متاعِ عشق، مری دولتِ ثبات
میری بہشتِ خواب، مری کائناتِ دل
میری تمام عمر، مرا حاصلِ حیات

آیا تھا میں یہاں کہ مسیحا نفس ہے تو
دنیائے معجزات تری دسترس میں ہے
اِک سرزمینِ علم ہے، مغرب کی ہر زمیں
’آبِ حیات‘ آج فقط تیرے بس میں ہے

لیکن وہ زندگی، جو مری زندگی بھی تھی
اس کو بچا سکی نہ مسیحائی بھی تری

سائنس کے تمام کرشموں کے باوجود
دیکھی ہے اپنی آنکھ سے پسپائی بھی تری

میری دعائیں بھی نہ کسی کام آ سکیں
یہ اعتقاد بھی فقط اک اعتقاد تھا
در پردہ اور ہی ہے کوئی ناخدائے وقت
بختِ رسا بھی میرا بہت کم سواد تھا

موت آئی اور لے گئی سب کچھ سمیٹ کر
میں دیکھتا ہی رہ گیا پتھر بنا ہوا
میرا تھا کیا قصور، جو یہ دی گئی سزا
کیوں ڈھا دیا خدا نے میرا گھر بنا ہوا

کہنے کو سقف و بام بھی، دیوار و در بھی ہیں
لیکن جسے مکان کہیں، وہ مکاں نہیں
ایسے میں زندگی کا تصور کروں تو کیا
اب وہ مری زمین نہیں، آسماں نہیں

تا دور اِک خلا ہے، اندھیرا نہ روشنی
ٹھہرا ہوا ہے وقت، نہ دن ہے نہ رات ہے
اِک چہرہ، غم میں ڈوبا ہوا، روبرو، خموش
اِک قبر کا نشان، متاعِ حیات ہے

میں اپنے دل کا حال بیاں کس طرح کروں
آنکھوں سے اشک ، لفظ سے معنی بچھڑ گئے
سب مجھ کو دیکھیں اور میں پکرنگ کی طرف
دو گز زمیں میں میرے سبھی خواب گڑ گئے

O

معراج، تیری قبر کی مٹی ہے میرے ساتھ
کیا جانے کب، کہاں میرا دل ساتھ چھوڑ دے
کیا جانے کب یہ خاک ملے میری خاک سے
کیا جانے کب یہ ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑ دے

۲۱/نومبر۲۰۰۲ء

(تاریخِ وفات)

۲۱ /نومبر ہے وہ تاریخ کہ جس دن
دنیائے محبت میری برباد ہوئی تھی
آباد مجھے دیکھ کے تقدیر کے ہاتھوں
مجھ پر کسی بے درد کی بیداد ہوئی تھی
دنیا کے دہکتے ہوئے دوزخ سے بچانے
مائل بہ کرم، جنتِ شداد ہوئی تھی

اِس عمر میں اُس شخص کو چھینا گیا مجھ سے
جو مجھ میں مری روح کی مانند مکیں تھا
جو اپنا جواب آپ تھا، جو اپنی مثال آپ
اُس جیسا تو کوئی بھی زمانے میں نہیں تھا
میں آئینہ اُس کا تھا، وہ آئینہ تھا میرا
میرے لیے قدرت کا وہ انعامِ حسیں تھا

معراج، وہ اِک نام، بلندی کی علامت
جس نام نے مجھ خاک نشیں کو کیا اعلیٰ
جو نور کی مانند فروزاں رہا مجھ میں
جس نے مجھے مایوس اندھیروں سے نکالا
اِک منزلِ بے نام کی جانب تھا رواں میں
نام اس کا رکھا اس نے محبت کا شوالہ

ائے قادرِ مطلق، تجھے معلوم ہے سب کچھ
اِس دہر میں کس کس طرح مرمر کے جیے ہم
اِس ملک خداداد میں کیا دکھ نہ اٹھائے
جوتو نے دیے، ہم نے وہ ہنس ہنس کے سہے غم
تجھ سے بھی کبھی بھیک نہ مانگی گئی ہم سے
اونچا ہی رکھا ہم نے ترے نام کا پرچم

تو نے جو صلہ ہم کو دیا، یاد رہے گا
وہ قرب، یہ دوری، یہ کرم ہے کہ ستم ہے
میں بھی یہاں تنہا ہوں، وہ پکرنگ ہ میں تنہا

اس کو بھی وہی غم ہے وہاں، جو مجھے غم ہے
جو اُس پہ گزرتی ہے، تجھے علم ہے اِس کا
تو دیکھ رہا ہے کہ میری آنکھ بھی نم ہے

٭ٹورانٹو (کینیڈا) کا قبرستان

زندگی کے آخری لمحات

(ٹورنٹو میں)

آج تم جاں کنی کے عالم میں
سانس لیتی تھیں اِک کراہ کے ساتھ
دیکھنا چاہتی تھیں ہر چہرہ
کتنی بے اختیار چاہ کے ساتھ

آنکھ کھلتی بھی تھی تو پل بھر کو
ہونٹ ہلتے، لرز کے رہ جاتے
دل میں جو بات مضطرب ہوتی
چند آنسو ڈھلک کے کہہ جاتے

جز مرے کوئی بھی نہ سن پاتا
دل سے دل تک جو بات آتی تھی
رُکتی چلتی ہر ایک سانس کے ساتھ
آس بندھتی تھی، ٹوٹ جاتی تھی

تم نے کس کرب سے گزارے تھے
زندگی کے وہ آخری لمحات
سوچتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں
کتنی بے بس ہے آدمی کی ذات

کاش یہ درد بانٹ سکتے ہم
کاش کچھ درد، میں بھی سہہ جاتا
کاش تنہا نہ میں یہاں آتا
کاش 'پکرنگ'○ ہی میں رہ جاتا

○ٹورانٹو (کینیڈا) کا قبرستان

تم

لوگ کہتے ہیں تم نہیں ہو یہاں
تم بہت دور جا چکی ہو اب
دور، اپنے خدا کے پاس کہیں
تم کہاں ہو یہاں، کہیں بھی نہیں

لوگ ناداں ہیں، کیا خبر اِن کو
جب خدا میرے دل میں رہتا ہے
تم بھلا کیوں وہاں نہیں ہو گی
کیسے مانوں، یہاں نہیں ہو گی

میرے نزدیک، میرے گرد و پیش
میرے خوابوں، میرے تصور میں
میرے دل میں، مری نگاہوں میں
میرے ہونٹوں پہ، میری بانہوں میں

تم خدا کی طرح ہو میرے پاس
تم، کہ میری طرح ہو میرے پاس

O

اِک پیکر جمال ابھی تک نظر میں ہے
محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے وہ گھر میں ہے

اِک روشنی سی پھیلی ہوئی ہے درونِ دل
اِک کہکشاں سی بکھری ہوئی چشمِ تر میں ہے

اِک عالم سکوت ہے ایسا کہ یوں لگے
اِک نغمگی سی جاگی ہوئی بام و در میں ہے

وہ تو چلی گئی مگر اس کے وجود کی
خوشبو بسی ہوئی مرے شام و سحر میں ہے

یہ واہمہ ہے یا کہ حقیقت، خبر نہیں
میں اس کا ہمسفر ہوں، وہ جس رہگزر میں ہے

گھوارہ

(ہمارے مکان کا نام)

معراج، تمہیں یاد ہے وہ گھر جسے ہم نے
برسوں میں بڑی چاہ سے تعمیر کیا تھا
پھر فخر سے بچوں کی طرف دیکھ کے اک دن
نام اس کا بڑے پیار سے ''گھوارہ'' رکھا تھا

اِس گھر میں اُسی پیار سے تم اب بھی ہو آباد
جس سمت بھی دیکھوں، نظر آتی ہو اُدھر تم
کمروں میں نشستہ کبھی، آنگن میں خراماں
نزدیک ہی رہتی ہو مرے آٹھ پہر، تم

جادے (۱) سے مخاطب، کبھی مونا (۲) سے کوئی بات
تسنیم (۳) سے، اَوجے (۴) سے بھی ہنس بول رہی ہو
روشن (۵) جو ذرا دیر سے گھر آئے تو گُم سُم
مجھ کو مرے شعروں میں کبھی تول رہی ہو

گڑیا (۶) ہو کہ روبی (۷) ہو، تمہیں فکر ہے سب کی
یاد آئے شجیعہ (۸) کبھی فرحین (۹) و ثمینہ (۱۰)
زُجّو (۱۱) کا تبسم، کبھی بِلّو (۱۲) کی شرارت
فیری (۱۳) کبھی زویا (۱۴) کبھی سارا (۱۵) کبھی بینا (۱۶)

عینی (۱۷) ہو کرن (۱۸) ہو کہ طلال (۱۹) اور ثناء (۲۰) ہو
ساحر (۲۱) ہو عدیل (۲۲)، آزر (۲۳) وخرم (۲۴) ہو کہ فواز (۲۵)
ہر بچہ فدا تم پہ ہے، تم اُن پہ فدا ہو
ہمراز ہو تم اُن کی، تمہارے ہیں وہ ہمراز

مسعود (۲۶) و شفیق (۲۷) اور وسیم (۲۸) اور کبھی انور (۲۹)
تم سب کے لیے رہتی ہو ہر لمحہ دُعاگو
احسان (۳۰) میں دل ہے تو محمد (۳۱) پہ نظر ہے
آنکھوں میں ہے، نیویارک، ونی پیگ وٹورنٹو

شاداب (۳۲) ہو ہانی (۳۳) ہو کہ نیہا (۳۴) ہو کہ جمنا (۳۵)
دن رات سبھی رہتے ہیں اطراف تمہارے

لیکن وہ فراز(۳۶)،اپنا وہ محبوب نواسہ
سچ پوچھو تو تم زندہ رہیں جس کے سہارے

جس کے لیے تم آج اِس گھر میں مکیں ہو
دیکھو مری آنکھوں سے، ہر اِک سمت تمھیں ہو
دیواروں پہ آویزاں ہے تصویریں تمہاری
پکرنگ میں گھر ہے، مگر آباد یہیں ہو

(اشاریہ)

۱۔جاوداں میر (بیٹی) ۲۔غزالاں حمایت (بیٹی) ۳۔تسنیم ہاجرہ (بہو) ۴۔اَوجِ کمال (بیٹا)
۵۔روشن خیال (بیٹا) ۶۔زرافشاں سید (بیٹی) ۷۔فروزاں علی (بیٹی) ۸۔شجیعہ اقبال (بہو)
۹۔فرحین جمال (بہو) ۱۰۔ثمینہ روشن (بہو) ۱۱۔ذوالجمال (بیٹا) ۱۲۔بلند اقبال (بیٹا)
۱۳۔فریال (پوتی) ۱۴۔زویا خان (نواسی) ۱۵۔سارا بانو (نواسی) ۱۶۔بینا مسعود (نواسی)
۱۷۔عینی شگفتہ (نواسی) ۱۸۔کرن الماس (نواسی) ۱۹۔طلال روشن (پوتا) ۲۰۔ثنائ مسعود (نواسی)
۲۱۔ساحر شفیق (نواسا) ۲۲۔عدیل الدین (نواسا) ۲۳۔آزر شفیق (نواسا)
۲۴۔علی الدین خرم (نواسا) ۲۵۔فواز مسعود (نواسا) ۲۶۔مسعود رضوی (داماد)
۲۷۔شفیق الزماں (داماد) ۲۸۔وسیم خان (داماد) ۲۹۔انورالدین (داماد)
۳۰۔احسان علی خان (نواس داماد) ۳۱۔محمد محی الدین (نواس داماد) ۳۲ شاداب کمال (پوتی)
۳۳۔ہانی کمال (پوتی) ۳۴۔نیہا کمال (پوتی) ۳۵۔منہ بولی بیٹی ۳۶۔فراز مسعود (نواسا)

معراج کے نام

سنو معراج، بلّو ؔ کا ابھی اِک فون آیا تھا
وہ کہتا تھا کہ اپنی ماں پہ کچھ اُس نے بھی لکھا ہے
کوئی مضمون، کچھ اشعار یا پھر کوئی افسانہ
جو اُس نے لکھ رکھا ہوگا تمھیں اندازہ اُس کا ہے؟
وہ کہتا تھا، تمہاری یاد کو محفوظ کر دوں میں
ہر اِک تحریر، ہر تصویر، گھر میں جو بھی رکھّا ہے
وہ آرائش کی سب چیزیں وہ کپڑے وہ کھلونے سب
جنھیں تم نے بہت ہی پیار سے گھر میں سجایا ہے
اِدھر جو بھی تمہاری یاد میں لکھا گیا اب تک
وہ آنسو بھی، جو سب روتی ہوئی آنکھوں سے ٹپکا ہے
تمہاری ایک اِک شے کی حفاظت چاہتا ہے وہ
تمھیں معلوم ہے، وہ تم سے کتنا پیار کرتا ہے
تمہاری آرزو تھی، ڈاکٹر بن جائے میرا لال

وہ اب ہے ڈاکٹر، لیکن بہت ہی نرم دل کا ہے
اُسے شعروادب سے بھی تمہاری طرح رغبت ہے
کبھی ہے فیضؔ نظروں میں، کبھی غالبؔ کو پڑھتا ہے
تمہیں معلوم ہے تم سے بچھڑ کر اُس پہ کیا بیتی
وہ پتھر کی طرح چپ ہے، نہ ہنستا ہے نہ روتا ہے
عجب سکتے کا عالم اُس پہ طاری ہے، مہینوں سے
مسلسل سوچتا رہتا ہے اور خاموش رہتا ہے
اب اُس کی خامشی ٹوٹی تو یہ اُس نے کہا مجھ سے
مرے ڈیڈی ، یہ گھر تو میری امی نے بنایا ہے
خبر ہے آپ کو بھی، اُن کو کتنا پیار تھا ہم سے
انھوں نے اپنے گھر کا نام ہی 'گہوارہ' رکھا ہے
یہ میری آرزو ہے، اِک کتاب ایسی مرتب ہو
جو میری ماں کی دنیا تھی، جو میری ماں کی دنیا ہے

○ڈاکٹر بلند اقبال (ہمارا سب سے چھوٹا بیٹا)

تمہارے بعد

آج میں سو سکا نہ ساری رات
آج تم رات بھر تھیں میرے ساتھ
تم مجھے دیکھتی تھیں، میں تم کو
ہم نے آپس میں کی نہ کوئی بات
دل میں جو کچھ تھا، ہم پہ روشن تھا
کس قدر تھے عجیب وہ لمحات

خامشی گفتگو سراپا تھی
دل کی دھڑکن میں ساز بجتے رہے
دور بجتی رہی تھی شہنائی
آنکھوں آنکھوں میں خواب سجتے رہے
روح میں ہو رہی تھی بارش سی
اور بادل کہیں گرجتے رہے

ایک اِک لمحہ بیتے جیون کا
آ کے بیٹھا ہوا تھا اپنے پاس
سارا ماضی تھا اپنی آنکھوں میں
زندگی آ گئی تھی کتنی راس
کس قدر مطمئن تھے ہم دونوں
ایک لمحہ بھی ہم رہے نہ اُداس

کس کو ایسی وفا ملی ہو گی
کون خوش بخت اس قدر ہو گا
کس کو معلوم تھا اُجڑ کے بھی
اتنا آباد اپنا گھر ہو گا
ساتھ چھوٹا نہیں بچھڑ کے بھی
کس کا پیار اتنا معتبر ہو گا

تم تو جا ہی چکی ہو دنیا سے
میں بھی کچھ دن میں آنے والا ہوں
مجھ پہ جو کچھ گزر رہی ہے یہاں
تم کو سب کچھ سنانے والا ہوں
زندگی کو تو آزما ہی چکا
موت کو آزمانے والا ہوں

لوگ کہتے ہیں

لوگ کہتے ہیں، حمایت وہ حمایت نہ رہا
اُس کا پہلا سا وہ اندازِ طبیعت نہ رہا
اُس کی باتوں میں جو بے نام کشش تھی ، نہ رہی
اُس کے الفاظ میں وہ حسنِ لطافت نہ رہا
نہ وہ بے ساختہ فقرے، نہ وہ ہنستا چہرہ
اُس کے اندر تھا جو اِک رنگِ ظرافت، نہ رہا
کوئی موضوع ہو، کہنے کی وہ بے لاگ روش
بے نیازانہ وہ اظہارِ صداقت، نہ رہا
نہ وہ بے باکیِ افکار، نہ آہنگِ بلند
اپنے ماحول سے وہ طرزِ بغاوت نہ رہا

نہ وہ یارانے رہے اُس کے، نہ وہ دوستیاں
ایسا لگتا ہے اُسے شوقِ رفاقت نہ رہا
لوگ کہتے ہیں کہ وہ ہو گیا دنیا بیزار
زندگی سے تھا جو اِک جذبۂ رغبت نہ رہا

ٹھیک کہتے ہیں سبھی، بات وہ اِک دَور کی تھی
مجھ میں جو کچھ بھی تھی خوبی، وہ کسی اور کی تھی

مراایوارڈ

مرے کمرے میں جو ایوارڈ رکھے ہیں
(جو اِک شوکیس میں تم نے سجائے تھے)
اُنہیں کے درمیاں میں نے
تمہاری اِک حسیں تصویر بھی رکھی تھی
تم کو یاد ہے نا؟
مرا سب سے بڑا ایوارڈ تو تم تھیں
مرا سب سے بڑا اعزاز تو تم تھیں
جو مجھ کو میرے اللہ نے دیا تھا
مگر اب تم نہیں ہو
مرا ایوارڈ واپس لے لیا میرے خدا نے
مرا سب سے بڑا اعزاز مجھ سے چھن گیا ہے
مگر تصویر......!
وہ تو میرے کمرے میں رکھی ہے

مجھے جو غم ملا ہے
وہ تو اِس تصویر کی صورت
مری آنکھوں میں، میرے دل میں بستا ہے
یہ غم میری محبت کی علامت ہے
مرا عہدِ رفاقت ہے
کوئی اِس غم کو مجھ سے چھین سکتا ہے؟
مرا سب سے بڑا ایوارڈ، یہ غم ہے
مرا سب سے بڑا اعزاز، یہ غم ہے

معراج سے کچھ باتیں

آؤ معراج آؤ، کیسی ہو؟
کیا وہاں بھی، یہاں کی جیسی ہو؟
تم تو اپنوں میں گھِر گئی ہو گی
کتنے سپنوں میں گھر گئی ہو گی
باوا حضرت، تمہاری امی جان
میری ناجی، وہ میری دادی جان
آپا جان اور تمہارے دولھا بھائی
(اور جس نے بھی وہ حیات اپنائی)
وہ سبھی ۔ جو یہاں رہے مہمان
ہاں وہ بیٹی، وہ اپنی ننھی جان
جس کا نام ’آسمان‘ رکھا تھا
کیا یقیں میں گمان رکھا تھا
کتنی جلد اُس کا اُٹھ گیا سایہ

میں اُسے دیکھ بھی نہیں پایا
میں یہاں تھا تو وہ تھی بھارت میں
دیکھو یہ بھی لکھا تھا قسمت میں
میری امّاں بھی ہیں وہاں معراج
تم نے دیکھا اُنہیں کہاں معراج!
مجھ کو بھی اُن کا چہرہ یاد نہیں
بچپنا بھی رہا ہے یاد کہیں؟
میں تو بس تین سال ہی کا تھا
کب سے دنیا میں ہوں اکیلا سا
اِک بہن تھی، دو ایک سال بڑی
وہ بھی اللہ کو ہو گئی پیاری
اب تو ابّا بھی جا چکے ہیں وہاں
اور میری وہ ’دوسری امّاں‘
تم تو اُن کی بہت چہیتی تھیں
تم تھیں زندہ، تو وہ بھی جیتی تھیں

اب تو وہ بھی وہاں ہیں، تم بھی وہاں
اُن کی خدمت کرو بہت ہی وہاں
جتنا آرام تم اُنہیں دو گی
میری امّاں کی بھی دُعا لو گی
میری امّاں، تمہاری 'پہلی ساس'
تم سے ہو گی بہت ہی اُن کو آس
تم بھی یہ بات دھیان میں رکھنا
اِک توازن اُڑان میں رکھنا
ساس وہ بھی ہیں، ساس یہ بھی ہیں
خاص وہ بھی ہیں ، خاص یہ بھی ہیں
فرق دونوں میں کچھ نہیں رکھنا
اُن سے برتاؤ دل نشیں رکھنا
'دونوں ساسوں' کے ساتھ سارے لوگ
میرے ہوں یا کہ وہ تمہارے لوگ
سب ہی تم سے وہاں ملے ہوں گے

سب کے دل پھول سے کِھلے ہوں گے
تم سے تو سب ہی پیار کرتے تھے
جان اپنی نثار کرتے تھے
کیا وہ سب منتظر تمہارے تھے؟
کچھ یہاں بھی تو اُن کے پیارے تھے
میں بھی تو اُن کو یاد کرتا ہوں
دل کو یادوں سے شاد کرتا ہوں
سب میں رہ کر بھی ہوں یہاں تنہا
ایسا ہو گا کوئی، کہاں تنہا!
کاش میرا بھی انتظار کریں
اور تم جیسا، مجھ سے پیار کریں

مبارک ہو

(معراج سے)

تمھیں مبارک، بہت مبارک
تمہارا بیٹا۔۔۔
تمہارا اَوجِ کمال۔۔۔
وہ منتوں، مُرادوں، دُعاؤں والا
وہ اپنے اللہ سے بڑی اِلتجاؤں والا
ہمارا بیٹا
اُسے بھی اللہ نے نوازا ہے
ایک بیٹے کا باپ اب وہ بھی بن گیا ہے
(اب اُس کی بھی تین بیٹیاں ہیں اور ایک بیٹا)

تمھیں وہ دن بھی ہیں یاد معراج
ہم بھی اکثر یہ سوچتے تھے

ہماری بھی تین بیٹیاں تھیں اور ایک بیٹا
ہمارا روشن خیال۔۔۔

اور ہم دعائیں کرتے تھے۔۔۔
ایک بیٹے سے اور اللہ نواز دے تو
ہم اُس سے کچھ بھی، کبھی نہ مانگیں گے زندگی بھر
(مگر یہ اُس کا کرم کہ اُس نے کچھ اور بچّوں سے بھی نوازا)

تمھیں تو معلوم ہے کہ میں بھی تھا اپنی امّاں کا ایک بیٹا
میں زندگی بھر رہا اکیلا
میں چاہتا تھا کہ میرے روشن خیال کی زندگی میں وہ دن کبھی نہ آئے
جو میری تقدیر بن گیا ہے

خدا نے میری دعائیں سن لیں
اور اپنے چھوٹے سے گھر میں اَوجِ کمال آیا
ہمارا 'گھوارہ' جگمگایا

ہمارے روشن خیال کا بھی ہے ایک بیٹا
طلال روشن ۔۔۔
ہماری یہ آرزو تھی ۔۔۔
تم بھی دُعا بہ لب تھیں
اُسے بھی مل جائے ایک بھائی
دُعا تمہاری قبول کر لی مرے خدا نے
ہمارے چھوٹے سے گھر میں عارج کمال آیا
ہمارا ’گہوارہ‘ جگمگایا

(تم اُس کو بھی کاش دیکھ پاتیں)
(تم اُس کو بھی کاش ۔۔۔) خیر! اب تم
دعا کرو کہ یہ دونوں بھائی ۔ طلال و عارج
ہمیشہ گہوارۂ محبت میں جسم و جاں کی طرح رہیں گے
ہمیشہ اِک دوسرے کا سایہ بنے رہیں گے

تصویروں سے باتیں

مرے کمرے کی دیواروں پہ تصویریں ہیں جتنی
سب تمہاری ہیں

اُنہیں میں اِک حسیں تصویر وہ بھی ہے
جو اِکاّون میں تم نے انڈیا سے مجھ کو پاکستان بھیجی تھی
وہی تصویر جب، تم دو برس کی ایک دلہن ۔۔۔ اِک بہو تھی
اور اِک بیٹی کی اماّں بھی
وہی تصویر اب انلارج کر کے میں نے کمرے میں لگا دی ہے

ہماری زندگی کی یادگار
اِک گُم شدہ ساعت کا عکسِ غیر فانی
نوجوانی کا وہ اِک لمحہ
بہت ہی خوبصورت لمحۂ ساکت
جو اپنے دامنِ رنگیں میں اٹھارہ برس کی ایک لڑکی کو
خدا کی اِک امانت کی طرح محفوظ رکھے
مجھ کو ماضی کی جھلک دکھلا رہا ہے

تم تو باوَن میں یہاں آئی تھیں
اور اِک جھونپڑی کو اپنی قسمت جان کر رہنے لگی تھیں
کہاں سے تم کو لا کر کس جگہ میں نے بسایا تھا!
اِسے قسمت کہو یا وقت کی بے اعتنائی
رہنماؤں کی سیاست یا کہ ہجرت کی عطا
کچھ بھی کہو۔۔۔
میں نے بہت ہی ظلم یہ تم پر کیا تھا
تم سے شرمندہ ہوں، ساری عمر شرمندہ رہوں گا

مرے کمرے میں اِک تصویر وہ بھی ہے
کہ جس میں گاؤں کی گوری نظر آتی تھیں تم مجھ کو
میں جب بھی چھیڑتا تم کو
تو کتنے فخر سے اپنا دوپٹہ سر پہ لے کر
اِک ادائے خاص سے تم مجھ سے کہتی تھیں
'میں اپنی اصلیت پر ہوں، مرے اندر مرا گاؤں
ابھی تک زندہ ہے، دیکھو'
اُسی دن ہم نے سوچا تھا کہ ہندوستان جائیں گے
اور اپنے گاؤں کو دوبارہ دیکھیں گے
تمہارا پاسپورٹ آیا تو اُس پر بھی وہی تصویر چسپاں تھی
اُسی تصویر کو انلارج کر کے میں نے کمرے میں لگایا ہے
'یہ میرے گاؤں کی گوری ہے'
اُس کے فریم میں میری بھی وہ تصویر ہے
جو تم نے میرے پہلے مجموعے کی خاطر منتخب کی تھی
اُسی کو دیکھ کر، کچھ سوچ کے تم نے کہا تھا
'آگ میں پھول'
'آپ کے مجموعے کا یہ نام کیسا ہے؟'

'بہت ہی خوب! اپنے عہد، اپنی زندگی کا ترجماں ہے یہ'
مرا مجموعہ سَن چھپّن میں آیا تھا
تمہیں تو یاد ہے نا؟

اِدھر دیکھو
یہ اِک تصویر۔۔۔تم کرسی پہ بیٹھی ہو
اُسی کو میں نے اپنے مختلف ایوارڈ
اعزازات اور تمغوں کے بیچ
اِس طرح رکھا ہے
کہ جیسے تم بھی اِک ایوارڈ ہو میرا
غلط بھی تو نہیں ہے یہ
مرا سب سے بڑا ایوارڈ تو تم تھیں
مرا سب سے بڑا اعزاز تو تم تھیں
(اِسی عنوان سے اِک نظم بھی اب میں نے لکھی ہے)
تم اِس کرسی پہ کتنی شان سے بیٹھی ہو
چہرے پر جو اِک سنجیدگی ہے، اک متانت ہے
تمہاری فتح مندی کی علامت ہے

مجھ ایسے آدمی کو تم نے اِک 'انساں' بنایا ہے۔۔۔
یہ کچھ کم کارنامہ ہے؟
تمہاری ہی رفاقت میں مجھے سب کچھ ملا ہے
علم، عزت اور شہرت۔۔۔
اور خوشحالی
ہمارے گھر کی بوڑھی عورتیں کہتی ہیں
بچّے مرد کی قسمت سے ہوتے ہیں مگر دولت۔۔۔
یہ دولت تو فقط بیوی کی قسمت سے ملا کرتی ہے شوہر کو
سو بیوی کا مقدّر رنگ لایا
میں نے جو اِک فلم کے نغمے لکھے تھے، ہٹ ہوئے ایسے
کہ میں اِک "فلمی شاعر" بن گیا اور ریڈیو کی نوکری تج دی
بہت مقبول جب ہونے لگے نغمے
تو میں نے ڈائیلاگ اور پردۂ سیمیں کے منظرنامے بھی لکھّے
میں فلمیں بھی بناتا اور ہدایت کار بھی ہوتا
کئی ایوارڈ مجھ کو مل چکے تھے
میری فلمیں بھی سُپر ہِٹ تھیں
تمہیں تو یاد ہے نا؟

آج جس کرسی پہ تم بیٹھی ہوئی ہو
یہ ہماری خوش نصیبی کی علامت ہے

اب اِس تصویر کو دیکھو
جو دروازے کے اُوپر ہے
یہ ہم دونوں کی وہ تصویر ہے جب ہم بہت ہی مطمئن تھے
اور 'اپنے گھر' میں رہتے تھے
یہ 'گہوارہ' جو ہم نے سَن چھیّتر میں بنایا تھا
ہماری محنتوں کا پھل ہے
میں نے فلمی دنیا چھوڑ دی تھی اور اپنی 'مادرِ علمی' کے
قدموں میں (نشستہ) طالبانِ علم کی تدریس میں
مصروف رہتا تھا
اِسے یوں کہیے، اپنی ذات کی تجدید، اپنے آپ کی تکمیل
میں مصروف رہتا تھا
ہماری بیٹیاں، بیٹے بھی اب تعلیم کے اعلیٰ مدارِج سے گزر کر
اپنے اپنے گھر کے ہوتے جا رہے تھے
ہم نے اپنا فرض پورا کر دیا

دیکھو، ہمارے چہرے اپنے دل کا آئینہ ہیں
دیکھو تو۔۔۔
تمہارے لب پہ کیسی پُر مسرّت فاتحانہ مسکراہٹ ہے
میں اب تنہا۔۔۔ اکیلا ہوں تو کیا

تم سے بچھڑ کر بھی تمہارے ساتھ رہتا ہوں
مرے کمرے کی دیواروں پہ تصویریں ہیں جتنی
سب تمہاری ہیں

ایک تصویر سے

تم ایک تصویر میں ہو مجھ سے خفا خفا سی
مری طرف سے نگاہ پھیرے
کچھ ایسے بیٹھی ہو جیسے مجھ سے کوئی شکایت ہے۔۔۔
میری کچھ عادتیں تو تم پر گراں گزرتی ہیں
(مجھ کو اندازہ ہو گیا ہے)
جو ہو سکے تو
بس ایک شاعر سمجھ کے مجھ کو معاف کر دو
میں تم سے شرمندہ ہوں۔۔۔کروں کیا!
کہ ہم سے شاعر
خدا کے ناکارہ کارخانے سے ڈھل کے نکلے ہیں
کتنی کمزوریاں ہیں ہم میں۔۔۔
کسی بھی شاعر کی زندگی کو کہیں سے دیکھو
سبھی میں میرا ہی عکس تم کو دکھائی دے گا

(مگر خدا اپنے خاص بندوں پہ کچھ زیادہ ہی مہرباں ہے)
تم ایسی بیوی مجھے عطا کی
سبھی کو ایسی ہی بیویاں اُس نے دی ہیں شاید
وہ کوئی غالبؔ ہو یا کہ اقبالؔ
فیضؔ ہو یا فرازؔ کوئی
خدا نے اُس مال سے نوازا ہے
جو الگ باندھ کر رکھا تھا
جو سب سے اچھا تھا۔۔۔سب سے پیارا

وہ آج جب کھو گیا ہے مجھ سے۔۔۔
تو اپنی قسمت کو رُو رہا ہوں
تمہیں دوبارہ تو وہ نہ بھیجے گا
(اُس کے بس میں ہی یہ نہیں ہے)
مگر وہ مجھ کو بلا تو سکتا ہے۔۔۔
مجھ کو اُس جا تو بھیج سکتا ہے

تم جہاں ہو
دُعا کرو، ہم وہاں پہ پھر ایک ساتھ رہنے لگیں ہمیشہ
یقین مانو
میں اب بہت کچھ بدل گیا ہوں

ردِّ عمل

تمہیں خبر ہے؟
تمہارے بیٹے، تمہارے 'روشن خیال' نے
کیا کیا ہے گھر میں؟
تمہاری اِک مسکراتی تصویر ایک دیوار پر لگا دی ہے
اور گھر کا ہر ایک منظر بدل دیا ہے
وہ گھر۔۔۔اُداس اور خموش سا گھر
اِس اِک تبسم سے کِھل اُٹھا ہے
جدھر بھی دیکھوں
ہر ایک شئے مسکرا رہی ہے
ہر ایک گوشے میں، ہر طرف جو سکوت طاری تھا
پھر سے کچھ بولنے لگا ہے
ہر ایک گلدان میں سبھی پھول

پھر سے محوِ سخن ہیں، آپس میں ہنس رہے ہیں
تمام اسٹیچو۔۔۔ ہر کھلونا مگن ہے اپنی شرارتوں میں
میں خود بھی ہنسنے لگا ہوں دیکھو
یہ آج کیا مجھ کو ہو گیا ہے؟
تمہاری آنکھوں میں جیسے میں بھی سمٹ گیا ہوں
میں اپنا غم بھول کر تمہاری نظر سے ہر شے کو دیکھتا ہوں
تمہاری تصویر
مسکراتی ہوئی یہ تصویر
زندگی کا پیام دینے لگی ہے مجھ کو
تمہارے ہونٹوں کا یہ تبسم
سبھی کو ہنسنا سکھا گیا ہے
خدا بھی شاید کہیں سے ہم سب کو دیکھ کر
مسکرا رہا ہے

فردوسِ گُم شدہ

میں تم کو ہر روز دیکھتا ہوں
تمہاری آنکھوں کو چومتا ہوں
تمہاری تصویر کے سہارے
میں اپنے ماضی میں گھومتا ہوں

وہ میرا ماضی جو حال بن کر
مری نگاہوں میں آ گیا ہے
جو لمحے لمحے میں بٹ کے میرے
نفس نفس میں سما گیا ہے

میں دیکھتا ہوں وہ رات اور میں
وہ حسنِ خوابیدہ ۔۔۔ چاندنی میں
وہ سحر تھا، معجزہ تھا، کیا تھا
وہ جنتِ دیدہ، چاندنی میں

وہ ایک پیکر، وہ پیکرِ گُل
جو اپنی خوشبو سے بے خبر تھا
وہ آسماں کی تھی حور کوئی
کہ چاند کوئی زمین پر تھا

تمھیں تو شاید خبر نہیں ہے
وہ رات مجھ میں ٹھہر گئی ہے
ہر ایک منظر کو ساتھ لے کر
مرے بدن میں اُتر گئی ہے

مرا بدن، جس میں ایک دل ہے
وہ دل، وہ تنہا، اُداس، ویراں
وہ دل جو تم کو قریب پا کر
بنا ہوا تھا، بہار ساماں

وہ دل وہ آئینہ جس میں تم نے
کیا تھا سِنگھار زندگی کا
وہ گھر کہ جس کا ہر ایک گوشہ
تھا آئینہ دار زندگی کا

وہ گھر وہ حرفِ وفا کا مخزن
وہ گھر وہ 'گہوارہ' دو دلوں کا
وہ گھر وہ تعبیرِ خوابِ فردا
بہشت خوابوں کے سلسلوں کا

وہ گھر، وہ فردوس، جو زمیں پر
ہوئی تھی آباد، کھو گئی ہے
وہ زندگی جو مِلی تھی تم سے
وہ مجھ سے پھر دُور ہو گئی ہے

معراج کے نام

میں کینیڈا سے کراچی میں آ گیا ہوں پھر
وہ شہر میری محبت کا جو امین بھی ہے
مری حیات، جو ہے محوِ خواب پکرنگ میں
مری حیات، مرے گھر میں جو مکین بھی ہے

میں اس کو دیکھتا رہتا ہوں صبح و شام یہاں
وہ اپنے بچوں میں دن رات ہے مگن کتنی
وہ کینیڈا ہو کہ امریکہ ہو کہ پاکستان
وہ ہر جگہ ہے مگر مجھ سے ہے لگن کتنی

یہاں بھی اس کے ہیں لختِ جگر وہاں بھی ہیں
وہ ایک ماں ہے، خدا کی طرح ہے ہر دل میں
وہ اپنی قبر میں آسودہ اپنے گھر کی طرح
چراغِ راہ ہے لیکن ہر ایک منزل میں

وہی تو ہے، جو مری ہم سفر ہے عمر تمام
وہی تو ہے، جو مری زیست سے عبارت ہے
جو سب میں ہو کے بھی تقسیم ’ایک‘ ہے اب تک
جو اپنی ذات میں ’توحید‘ کی علامت ہے

ایک نئی خوشخبری

(’معراج‘ کے نام)

تمہیں خبر ہے؟
تمہاری ہر آرزو کی تکمیل ہوگئی ہے
تمہیں یہ غم تھا
ہمارے گھر میں ’طلال‘ اکیلا ہے
سو اُسے بھی خدا نے اِک بھائی دے دیا ہے
ہمارا ’عارج‘
طلال کی طرح ایک بے حد ذہین لڑکا
تمہاری اِک آرزو تھی یہ بھی
ہماری ’گڑیا‘ بھی ایک بیٹے کی ماں بنے
لو۔۔۔تمہاری یہ آرزو بھی اللہ نے پوری کر دی
ہماری گڑیا کے گھر میں ننھا سا ایک گڈا بھی آ گیا ہے
وہ ہے ’معارج‘

○ گڑیا۔ زرافشاں سید

سبھی کو ’معراج‘ ہی سے نسبت ہے
وہ معارج ہو یا کہ عارج
یہ سب تمہاری ہی یادگاریں ہیں

اپنے بلو کے گھر بھی ننھا سا ایک بیٹا خدا نے بھیجا ہے
نام اس کا ’جزیر‘ رکھا ہے
کہہ رہا تھا ’بلند‘ مجھ سے
کہ لفظ ’ترکی‘ ہے
اس کے معنی ہیں ’اہلِ ہمت، دلیر، اعلیٰ ارادوں والا‘
پھر اس میں ایک اور بھی ہے خوبی
سنو تو ’انگلش‘ کا لفظ لگتا ہے
اس میں وہ ’غیریت‘ نہیں ہے
جو ہمارے ناموں سے جھانکتی ہے
وہاں یہ بچہ۔۔۔
’جزیر‘ اپنے وطن میں اور اپنی زمین پر اجنبی نہ ہوگا
زبان، تہذیب اور تاریخ اس کو اپنی اماں میں رکھے گی
ماں کی ممتا کی طرح اس پر نثار ہوگی

وعدہ خلافی

یہ تم نے کیا کیا معراج؟
اپنی آرزو پوری ہوئی تو
چپکے سے چل دیں!
ہمارے درمیاں اِک عہد یہ بھی تھا
کہ ہم تم ساتھ دنیا میں رہیں گے
ساتھ ہی دنیا سے جائیں گے
مگر تم مجھ کو تنہا چھوڑ کر چل دیں
بڑی وعدہ خلافی کی۔۔۔

میں اب کتنا اکیلا ہوں
تمہیں اندازہ ہے اس کا؟
یہ ننھے ننھے بچے جب اکیلا مجھ کو پاتے ہیں
تو کس حیرت سے تکتے ہیں
وہ کیا کچھ سوچتے ہوں گے
ان آنکھوں میں عجب سا اک تجسس ہے
وہ مجھ میں ڈھونڈتے ہیں تم کو
جیسے تم میرے اندر چھپی بیٹھی ہو
میں کیسے انہیں سمجھاؤں
تم مجھ میں یقیناً ہو
مگر تم مجھ سے باہر آ نہیں سکتیں

آخری حسرت

سنو معراج
اللہ نے تمہاری ہر دعا سن لی
تمہاری ہر تمنا آج پوری ہو گئی ہے
کاش یہ لمحات تم بھی دیکھ پاتیں
کاش کچھ دن اور جی سکتیں

مجھے وہ لمحہ یاد آتا ہے
جب تم نے عشاء کے بعد اللہ سے دعا کی تھی
مرے 'اوجے'۔۔۔مری 'گڑیا' کو تو نے
بیٹیوں سے تو نوازا ہے
انہیں ایک ایک بیٹا بھی عطا کر دے
مری یہ 'آخری حسرت' ہے
یہ سنتے ہی میں چلا کے بولا تھا
'یہ کیا کہتی ہو؟ حسرت 'آخری' کیسی؟

ہمارے اور بھی بیٹے ہیں
سب کے واسطے تم کو دعائیں مانگنی ہیں
ماں ہو آخر تم
ابھی تو شادیاں ان کی ہوئی ہیں۔۔۔'
اور پھر ہنستے ہوئے میں نے کہا تھا
ہاں۔۔۔مگر تم تو ہو 'شیخانی'
کسی 'سیّد' سے کرواؤ سفارش، تو خدا بھی مان جائے گا
یہ جملہ میں نے اِترا کر، بڑے ہی فخر سے تم کو ستانے کے لیے
بے سوچے سمجھے کہہ دیا تھا
یاد ہے نا؟
تم کو غصہ آ گیا تھا
تم بھی فوراً ایک 'شیخانی' کے لہجے میں جواباً بول اٹھیں
'کیا خدا بھی آپ جیسا ہے؟
خدا بھی رنگ و نسل و قومیت میں بٹ گیا ہے؟'
میں نے فوراً ہاتھ جوڑے
اور سوری (Sorry) کہہ کے بولا
'تم تو سنجیدہ ہو گئیں، میں نے مذاقاً کہہ دیا تھا'

کاش تم بھی آج ہوتیں
تم بھی یہ دن دیکھ پاتیں
کاش کچھ دن اور جی سکتیں
تمہارے بعد 'عارج' آ گیا
'کورین' آئی
پھر 'جزیرٔ' اور پھر 'معارج'
(تین بیٹے ۔۔۔ ایک بیٹی)
سب کا دامن بھر دیا اللہ تعالیٰ نے

جو تم ہوتیں تو سب کو پیار کرتیں
مرے کمرے میں سب بچوں کی تصویریں
تمہاری اک 'حسیں تصویر' کے ساتھ
اس طرح رکھی ہیں
جیسے سب تمہارے پاس بیٹھے ہیں

قطعات

اب یہ تنہائی تو ہے میرا مقدر یارب
پھر میں کیوں اتنا پریشان رہا کرتا ہوں
جب بھی جی چاہتا ہے اس سے کوئی بات کروں
اس کی تصویر سے وہ بات کہا کرتا ہوں

O

اپنی تصویر میں وہ دیکھ رہی ہے مجھ کو
اس کے ہونٹوں پہ ہے اک خاص تبسم بھی کہیں
وہ تبسم کہ جو آئینہ ہے اس کے دل کا
جیسے کچھ کہہ کے بھی ہونٹوں سے کہا کچھ بھی نہیں

وحدہٗ لاشریک

کتنی مشکل سے وقت کٹتا ہے
کچھ مرا دل ہی جانتا ہے اِسے
ایک دن اِک برس کی طرح طویل
اِک برس اِک صدی لگے اب تو
جب سے ہم بچھڑے زندگی کیا ہے
ایک بے معنی، اک فضول سی شے
اب تو جی چاہتا ہے، موت آ جائے
کتنی مشکل سے وقت کٹتا ہے

مجھ سے کہتے ہیں کچھ میرے ساتھی
کس لیے جی رہے ہو تم تنہا
زندگی ایک بار ملتی ہے
گھر بسا لو، کسی کو اپنا لو
لوگ تو چار چار کرتے ہیں
شادیاں بار بار کرتے ہیں
کوئی بیوہ ہی منتخب کر لو
مجھ سے کہتے ہیں کچھ میرے ساتھی

کاش وہ جانتے کہ میں کیا ہوں
جو بھی ہوں، میرا دل 'مسلماں' ہے
'شِرک' کیسے قبول ہو کہ مرا
'وحدہ لا شریک' --- ایماں ہے

ویب سائٹ

’بلند‘ کی آرزو تھی یہ بھی
کہ اس کی امی نظر سے اوجھل نہ ہونے پائیں
وہ جب بھی چاہے
وہ سامنے ہوں
وہ اپنی امی کو چلتا پھرتا ہمیشہ دیکھے
وہ اپنے بچوں سے بات کرتی
اور ان کی باتوں پہ مسکراتی
کبھی کبھی قہقہے لگاتی
ہمیشہ اس کو دکھائی دے
گھر کے لوگ دیکھیں تو سب یہ سمجھیں
وہ آج بھی سب کے درمیاں ہیں
وہ زندہ ہیں اور سدا رہیں گی

رو میں ہے رخشِ عمر

خاندانی نام	میر حمایت علی
ادبی نام	حمایت علی شاعر
والد	سید تراب علی صاحب (مرحوم)
والدہ	محترمہ لطف النساء بیگم (مرحومہ)
دوسری والدہ	محترمہ حور النساء بیگم (مرحومہ)
تاریخ ولادت	۱۴/جولائی ۱۹۲۶ء
مقام	اورنگ آباد دکن (انڈیا)
تعلیم	ایم اے (سندھ یونیورسٹی) پاکستان
شادی	۱۴/فروری ۱۹۴۹ء (حیدرآباد دکن)
شریکِ حیات	معراج النساء بیگم
ادبی نام	معراج نسیم

(ہفتہ وار ’پرواز‘ حیدرآباد دکن میں صفحہ خواتین کی انچارج رہیں اور برسوں افسانے بھی لکھے جو ہندوستان اور پاکستان کے رسائل میں چھپتے رہے۔ ان کا انتخاب پروفیسر جاوداں میر کی مرتبہ کتاب ’معراج نسیم‘ (ہماری امی جان) مطبوعہ ۲۰۰۳ء میں شامل ہے)

اولاد چار بیٹے، چار بیٹیاں اور ان کے رفقائے حیات
(کمانڈر، پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر اور بینکر)

جاوداں میر	محمد انور الدین صدیقی
روشن خیال	ثمینہ عزیز
فروزاں علی	سید مسعود احمد رضوی
غزالاں حمایت	شفیق الزماں
اوجِ کمال	تسنیم ہاجرہ

ذوالجمال — فرحین جمال

بلند اقبال — شجیعہ اقبال

زرافشاں سید — محمد وسیم خان

(ان کے بچے بھی اعلیٰ تعلیم سے سرفراز ہوتے جا رہے ہیں)

اعزازات

1۔ صدارتی ایوارڈ (مجموعۂ کلام) ’آگ میں پھول‘ 1959ء

2۔ نگار ایوارڈ (بہترین نغمہ نگار) فلم ’آنچل‘ 1962ء

3۔ نگار ایوارڈ (بہترین نغمہ نگار) فلم ’دامن‘ 1963ء

4۔ رائٹرز گلڈ آدم جی ادبی ایوارڈ (مجموعۂ کلام) ’مٹی کا قرض‘ 1974ء

5۔ عثمانیہ گولڈ میڈل (بہادر یار جنگ کلب) کراچی 1987ء

6۔ نقوش ایوارڈ۔ لاہور 1987ء

7۔ نگار ایوارڈ ’عقیدت کا سفر‘ (نعتیہ شاعری کا سات سو سالہ انتخاب) ٹی وی 1988ء

8۔ مخدوم محی الدین عالمی ایوارڈ (عالمی اردو کانفرنس، دہلی) خدمات کا اعتراف 1989ء

9۔ علامہ اقبال ایوارڈ (مجموعہ کلام) ’ہارون کی آواز‘ 1985ء

(پانچ برس کے ایوارڈز کا مجموعی اعلان 1991ء میں کیا گیا اور صدر پاکستان سردار فاروق احمد خان لغاری نے اکادمی ادبیات کے زیر اہتمام اہل قلم کانفرنس 1993ء میں متعلقہ حضرات کو ایوارڈز عنایت کئے)

10۔ ساہتیہ اکیڈیمی ایوارڈ (لکھنو) خدمات کا اعتراف 1991ء

11۔ ایوارڈ برائے اعلیٰ کارکردگی (ریڈیو پاکستان) 1993ء

12۔ موجد ’ثلاثی‘ ایوارڈ (انجمن طلباء قدیم جامعہ عثمانیہ) شکاگو 1993ء

13۔ وثیقہ اعتراف (ہمدرد فاؤنڈیشن) 1994ء

14۔ لائف لانگ لٹریری اچیومنٹ ایوارڈ (ایسٹرن آرٹ فورم) نیو جرسی 1994ء

Life Long Literary Acheivement Award By MAYAR Peter Canto. New Jersey (USA)
From "Eastern Art Forum"

15۔ امریکہ کی اعزازی شہریت (ادبی خدمات کے اعتراف میں) 1995ء

Honorary Citizenship of Boling Brook By MAYAR Roger.c. Clear. Chicago (USA)

16۔ بہترین ڈرامہ نگار ’شکست کی آواز‘ (منظوم یک کرداری تمثیل، چھ سو مصرعے)
ریڈیو پاکستان کراچی 1999ء

17۔ ٹاپ ٹین ایوارڈ 1999ء

Top Ten Award Orient International Hyderabad (Broadcaster, Poet, Author, Filmmaker and Director)

18۔ ’نشان اردو‘ (اردو سوسائٹی، آسٹریلیا) 2000ء

19۔ نیاز فتح پوری ایوارڈ (حلقہ نیاز و نگار پاکستان) 2000ء

20۔ نشانِ اعزاز (انجمن طلباء کے قدیم جامعہ عثمانیہ) پاکستان 2001ء

21۔ لائف اچیومنٹس ایوارڈ (ادبی مرکز، واشنگٹن) امریکہ 2001ء

Life Acheivement Award ADABI Markaz Washington, By: Dr. Maliha Lodhi, Ambassedor of Pakistan.

22۔ ایوارڈ آف ریکگنیشن (ینگ ترنگ ریڈیو، ہیوسٹن) امریکہ 2001ء

23۔ ایوارڈ آف ریکگنیشن (گورنمنٹ آف آنٹوریو) کینیڈا 2001ء

Award of Recognition (on behalf of Govt. of Ontorio) By: Mr. Frank-Klees and Mr. Jim Karygiannis. MPP (CANADA)

24۔ صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی 2001ء

Pride of Performance

(اس ایوارڈ کا اعلان 14 اگست 2001ء کو ہوا اور 23 مارچ 2002ء کو صدر پاکستان جناب پرویز مشرف نے ایوانِ صدر اسلام آباد میں عنایت کیا)

25۔ اُردو مرکز انٹرنیشنل ’فخر اُردو ایوارڈ‘ (لاس اینجلس) امریکہ 2002ء

تدریس

1۔ سچل سرمست کالج حیدرآباد 1963ء

2۔ سندھ یونیورسٹی 1977ء تا 1986ء

3۔ بیجنگ یونیورسٹی (عوامی جمہوریہ چین)

(مرکزی وزارت تعلیم پاکستان کی طرف سے تقرر مگر طبیعت کی خرابی کے سبب معذرت)

صحافت

روزنامہ ’جناح‘ اور روزنامہ ’ہمدرد‘ (حیدرآباد دکن) 1948ء تا 1950ء

ادارت

’سازِ نو‘ (حیدرآباد دکن) 1949ء

’شعور‘ (حیدرآباد سندھ) 1956ء

’صریرِ خامہ‘ (مجلّہ شعبہ اردو، سندھ یونیورسٹی)

(اقبال نمبر) 1977ء (نعت نمبر) 1978ء

ثقافت

(’ارژنگ‘ کے زیرِ اہتمام)

1۔ ’بنگال سے کوریا تک‘ (جنگ کے خلاف، عالمی امن کے موضوع پر اپنی طویل افسانوی نظم سندھ یونیورسٹی کے اسٹیج پر ٹیبلو کے انداز میں پیش کی) 1959ء

2۔ اندھیرے اجالے (اسٹیج ڈرامہ، تحریر و ہدایات، حمایت علی شاعر) 1959ء

(محمد علی اور مصطفیٰ قریشی نے پہلی بار اسی اسٹیج ڈرامے میں کام کیا اور فلم اسٹار بن گئے)

ریڈیو

دکن ریڈیو اور آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد دکن میں خدمات 1947ء تا 1950ء

ریڈیو پاکستان کراچی اور حیدرآباد سندھ میں خدمات 1951ء تا 1962ء

(ریڈیو پاکستان سے مختلف ادبی اور تحقیقی پروگرام اب بھی پیش کرتے رہتے ہیں)

ٹیلی ویژن

پی ٹی وی لاہور، کراچی اور اسلام آباد سے مختلف ادبی اور تحقیقی پروگرام

1۔ ’غزل اُس نے چھیڑی‘ (اردو غزل کے سات سو سال) 1974ء

2۔ ’کسوٹی‘ (ذہنی آزمائش کا پروگرام) 1977ء

3۔ ’خوشبو کا سفر‘ (علاقائی زبانوں کے شعراء کا اردو کلام 500 سال) 1988ء

4۔ ’عقیدت کا سفر‘ (اردو نعتیہ شاعری کے سات سو سال) 1988ء

5۔ ’لبِ آزاد‘ (احتجاجی شاعری کے چالیس سال) 1989ء

6۔ ’محبتوں کے سفیر‘ (سندھی شعراء کا اردو کلام 500 سال) 1996ء

7۔ ’نشیدِ آزادی‘ (تحریکِ آزادی میں اردو شاعری کا حصہ، 1857ء تا 1947ء)

(ٹی وی سے مختلف ادبی لسانی قومی اور تاریخی سلسلہ وار پروگرام اب بھی پیش کرتے ہیں)

فلم

مختلف فلموں کے نغمات، مکالمات اور اسکرین پلے 1961ء تا 1975ء

1۔ بحیثیت نغمہ نگار پہلی فلم ’آنچل‘ 1962ء

2۔ بحیثیت نغمہ نگار و مکالمہ نگار و منظرنامہ نگار پہلی فلم ’تصویر‘ 1965ء

3۔ بحیثیت فلم ساز و نغمہ نگار، پہلی فلم ’لوری‘ 1966ء

4۔ بحیثیت فلم ساز و ہدایت کار و نغمہ نگار، پہلی فلم ’گڑیا‘ 1975ء

اعترافات

1۔ ’حمایت علی شاعر نمبر‘ روزنامہ ’اورنگ آباد ٹائمز‘ (مہاراشٹر) انڈیا 2 جون 1985ء

2۔ ’گوشہ حمایت علی شاعر‘ روزنامہ ’کلیم‘ سکھر 10 اگست 1987ء

3۔ ’گوشہ حمایت علی شاعر‘ ماہنامہ ’طلوعِ افکار‘ کراچی جولائی 1995ء

4۔ ’گوشہ حمایت علی شاعر‘ سہ ماہی مجلّہ ’عثمانیہ‘ کراچی اکتوبر تا دسمبر 1995ء

5۔ ’حمایت علی شاعر نمبر‘ رسالہ ’شخصیت‘ (618 صفحات) کراچی 14 جولائی 1996ء

6۔ ’گوشہ حمایت علی شاعر‘ سہ ماہی ’لوحِ ادب‘ حیدرآباد سندھ اپریل تا جون 2000ء

7۔ ’گوشہ حمایت علی شاعر‘ ماہنامہ ’چہار سو‘ راولپنڈی ستمبر تا اکتوبر 2002ء

o۔ "The Scholar Poet" (مرتب) پروفیسر عبدالقوی ضیاء (کینیڈا)

(حمایت علی شاعر کے فن اور شخصیت پر انگریزی مضامین کا مجموعہ)۔۔۔۔۔ (زیرِ طبع)

(مضمون نگار) پروفیسر عبدالقوی ضیاء، یونس احمر، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، خوشونت سنگھ، پرکاش چندر، پروفیسر نظیر صدیقی، پروفیسر اظہر قادری، آفتاب احمد خان، پروفیسر نسیم نیشو فوز، حمیرا اشتیاق، سکندر مسرور، نسیم سیماب، سید رضوان اللہ، آفتاب نورانی، بلدیو مرزا، انور نسیم، شفیق احمد شفیق اور اختر پیامی

تحقیقی مقالات

1۔ ’حمایت علی شاعر حیات اور شاعری‘ مقالہ برائے پی ایچ ڈی‘ ڈاکٹر قاضی نوید احمد صدیقی، ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مرہٹواڑہ یونیورسٹی، اورنگ آباد 2006ء

2۔ ’حمایت علی شاعر کی ادبی خدمات کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ‘ مقالہ برائے پی ایچ ڈی کراچی یونیورسٹی پروفیسر رعنا اقبال، ڈپٹی ڈائریکٹر انفارمیشن، ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز، وفاقی اردو یونیورسٹی کراچی (زیرِ تحریر)

3۔ ’حمایت علی شاعر فن اور شخصیت‘ مقالہ برائے ایم اے، رشید احمد رشید

سندھ یونیورسٹی جام شورو۔حیدرآباد 1994-95ء

اختلافات

1۔ چراغ بکف (کراچی کی ادبی سیاست) ایک دستاویز 1984ء
2۔ احوال واقعی (حیدرآباد سندھ کی ادبی سیاست) 1994ء
(مرتب) پروفیسر مرزا سلیم بیگ، شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی
3۔ بارش سنگ سے بارش گل تک 'آئینہ در آئینہ' سوانح حیات پر مباحث 2002ء
(مرتبہ) پروفیسر رعنا اقبال، شعبہ ابلاغ عامہ، وفاقی اردو یونیورسٹی
4۔ تثلیث یا ثلاثی (نئی صنف سخن پر مباحث) مرتبہ پروفیسر رعنا اقبال 2005ء

مطبوعہ کتب

1۔ آگ میں پھول (نظمیں، غزلیں، رباعیات) 1956ء
2۔ دودِ چراغِ محفل (یادگار مشاعرہ حیدرآباد کا انتخاب) 1959ء
3۔ مٹی کا قرض (ثلاثیاں، نظمیں، غزلیں) 1974ء
4۔ تشنگی کا سفر (طویل افسانوی اور تمثیلی نظمیں) 1981ء
5۔ ہارون کی آواز (نظمیں، غزلیں اور ہائیکو) 1985ء
6۔ حرف حرف روشنی (منتخب کلام اور ایک طویل نظم) 1986ء
7۔ عقیدت کا سفر (نعتیہ شاعری کے سات سو سال) حصہ اول 1999ء
8۔ آئینہ در آئینہ (منظوم خودنوشت سوانح حیات) تین ہزار سے زائد اشعار
'اردو شاعری میں پہلا تجربہ' 2001ء
9۔ تجھ کو معلوم نہیں (فلمی نغمات) 2003ء
10۔ کلیاتِ شاعر 2008ء
(ان کتابوں کے ہندوستانی ایڈیشن بھی شائع ہو چکے ہیں)

نثری مجموعے

1۔ شیخ ایاز (جدید سندھی ادب کا عہد آفریں شاعر) 1978ء
2۔ شخص و عکس (تنقیدی مقالات اور مباحث) 1984ء
3۔ کھلتے کنول سے لوگ (دکن کے اہل قلم) حصہ اول 2000ء

4۔ حمایت علی شاعر کے ڈرامے (ریڈیو اور اسٹیج) 2005ء

تراجم

'بنگال سے کوریا تک' (1952ء تا 1953ء)
(عالمی امن کے موضوع پر لکھی ہوئی طویل افسانوی نظم کے مختلف لسانی روپ)
1۔ Flower in Flames
مترجم: پروفیسر راجندر سنگھ ورما۔ پنجاب یونیورسٹی (پٹیالہ) انڈیا 1985ء
2۔ Flute and Bugle
مترجم: پرکاش چندر، ریذیڈنٹ ایڈیٹر، ٹائمز آف انڈیا (لکھنو) 1998ء
3۔ 'گل باہ مہ' (سندھی روپ) ترجمہ محفوظ ہے
مترجم: پروفیسر ایم ای عالمانی (حیدرآباد سندھ)
4۔ 'بنگال سے کوریا تک' (ہندی روپ) ترجمہ محفوظ ہے
پروفیسر جی این نداف، ابوالکلام آزاد کالج۔ اورنگ آباد (مہاراشٹر) انڈیا
'حرف حرف روشنی' (منتخب کلام اور ایک طویل نظم)
1۔ 'شبد شبد پرکاش' (ہندی روپ) 1992ء
مترجم: قاضی رئیس اورنگ آباد (مہاراشٹر) انڈیا
2۔ Every Word Aglow 1993ء
مترجم: پروفیسر راجندر سنگھ ورما (پٹیالہ) انڈیا
3۔ 'حرف حرف روشنی' (ہندی روپ) ترجمہ محفوظ ہے
مترجم: پروفیسر بھگتل، اورنگ آباد (مہاراشٹر) انڈیا
'حمایت علی شاعر چاڈرامہ' (ریڈیائی ڈراموں کے سندھی روپ) ترجمے محفوظ ہیں
1۔ 'مفاصلہ (فاصلے)' مترجم رشید احمد لاشاری
2۔ 'دشمن آسمان پنھجو (دشمن آسماں اپنا)' o ایم بی انصاری
3۔ 'واچوڑو (بگولہ)' o ممتاز مرزا
4۔ 'برزخ (برزخ)' o محمد اسحاق سرہندی
(حمایت علی شاعر کا منتخب کلام دنیا کی مختلف زبانوں میں منتقل ہو چکا ہے)

غیر مطبوعہ کتب

1۔ اپنے پرچم تلے (قومی نغمے اور غنائیے)
2۔ سرگم (گیت)
3۔ زاویے (منظوم ریڈیائی ڈرامے)
4۔ مہران موج (سندھی لوک کہانیوں کی ڈرامائی تشکیل (منظوم ومنثور)
5۔ کچھ پیش رو، کچھ ہم سفر (تنقیدی اور تاثراتی مقالات)
6۔ نئی پود (نئی نسل کے اہل قلم کی تخلیقات کا تنقیدی جائزہ)
7۔ نقطہ نظر (تحقیقی اور تجزیاتی مضامین)
8۔ حمایت علی شاعر کے خطوط (مختلف ادبی مسائل)
9۔ چنگاریاں (اردو شاعرات کا مطالعہ)
10۔ مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا (یادداشتیں، ریڈیو سیریل)
11۔ آدھی ملاقاتیں (اہل قلم کے خطوط حمایت علی شاعر کے نام)
12۔ عقیدت کا سفر (پاکستان میں نعتیہ شاعری) حصہ دوم (ٹی وی سیریل)
13۔ خوشبو کا سفر (علاقائی زبانوں کے شعراء کا اردو کلام، پانچ سو سال)
14۔ لب آزاد (پاکستان میں احتجاجی شاعری کے پچاس سال)
15۔ محبتوں کے سفیر (سندھ میں اردو شاعری کے پانچ سو سال)
16۔ نشید آزادی (تحریک آزادی میں اردو شاعری کا حصہ، 1857ء تا 1947ء)
17۔ بڑے لوگ (بزرگ اہل قلم)
18۔ کہی اَن کہی (رومانی نظمیں)

سیاحت

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، یورپ (برطانیہ، ناروے، سویڈن) روس (ماسکو)، افریقہ (جنوبی افریقہ، بوٹسوانا، کینیا) موریشس، چین (مختلف شہر)، سعودی عرب، کویت، مسقط، دوحہ (قطر)، بحرین عرب امارات (ابوظہبی، دوبئی، شارجہ، العین، عجمان وغیرہ) ہندوستان (مختلف شہر)، بنگلہ دیش وغیرہ وغیرہ

☆☆☆